علمی و ادبی تحریروں کا مرقع

غالب نمبر

مدیر اعلیٰ: گوہر ملسیانی

علمی و ادبی تحریروں کا مرقع

ماہنامہ

عکسِ صادق

صادق آباد

رجسٹرڈ ایل نمبر: ایم - ۱۰۶

جلد: 1 شمارہ: ۸/۷

قیمت:

فی شمارہ : ۲۰/- روپے
سالانہ چندہ : ۲۰۰/- روپے
غیر ممالک سے : ۷۰۰/- روپے

رابطہ: گوہر ادب پبلی کیشنز
مظہر فرید کالونی صادق آباد ۶۴۳۵۰
فون: ۷۴۸۰۷

غالب نمبر ۸۰/- روپے

مدیر معاون: شاہد عباسی

حسن ترتیب

میاں طفیل محمد گوہر پبلشر نے ریاض احسان پرنٹنگ پریس صادق آباد سے چھپوا کر مظہر فرید کالونی صادق آباد سے شائع کیا

عکس خیال

غالب نمبر تکمیل کو پہنچا تو خیال کیا کہ اس کا اداریہ کیا لکھا جائے؟ مرزا غالب تو ایسی نابغۂ ادبی شخصیت ہے کہ سب اس کے فکر و فن کی دیوی کا کے پرستار ہیں' یہاں تک کہ مخالفین بھی کوئی ڈھب کی بات نہ کہہ سکے۔ پھر خیال آیا کہ غالب کی اپنے دور میں کیا قدر ہوئی ہے؟ بے چارہ محروم ستائش رہا اور پکار اٹھا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

مگر عصر حاضر میں غالب ادب کی قلمرو میں صاحب اقتدار ہے۔

ولادت کے دو سو سال پورے ہوئے۔ غالب شناسوں نے غالب کو بھرپور نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ صد سالہ وفات پر بہت کام ہوا۔ مگر اس کے مقابلے میں دو صد سالہ جشن ولادت کم توجہ پا سکا۔ مگر جس قدر ادبی لوازمہ منصہ شہود پر آیا قابل قدر اور معیار کا حامل ہے۔ مختلف ادبی رسالوں نے غالب نمبر شائع کیے۔ اور فکر و فن پر کتب طبع ہوئیں۔

ادارہ "عکس صادق" نے بھی پہلے شمارے کی اشاعت پر غالب نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کن مراحل سے گزر کر آج سرخرو ہوا ہوں--- داستان طویل ہے' شکوہ و شکایت کے انبار ہیں مگر ممنون ہوں ان محبان عکس صادق کا--- جن کے تعاون سے میں یہ غالب نمبر آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ اس میں غالب پر جدید و قدیم نگارشات شامل ہیں۔

اپنی بساط بھر کوشش کے باوجود بھی مطمئن نہیں ہوں۔ آپ کی رائے کا منتظر ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

گوہر ملسیانی

حمد باری بزمین غالب

اسرار احمد سهاوری
گوجرانواله

"انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں"
غالب

منت گزار حسن ستمگر نہیں ہوں میں
ان کا کرم ہے رنج سے مضطر نہیں ہوں میں
شاعر ہوں، حمد گو ہوں، ثنا گو ہوں آپ کا
کچھ مدح خوان صاحب افسر نہیں ہوں میں
رہتا ہوں جاں سپار حقیقت کے حسن کا
ڈر جاؤں کفر سے وہ مخور نہیں ہوں میں
میری جبین عجز ترے در پہ جھک گئی
دلدادۂ جہان ستمگر نہیں ہوں میں
نغمہ طراز ہوں میں ترے عشق کے لیے
دنیائے دوں کے حسن کا محور نہیں ہوں میں
آشوب روزگار کے سینہ سپر ہوں اب
گرداب سے ڈروں وہ شناور نہیں ہوں میں
ہے فخر دل میں نور ازل جلوہ گر ہوا
مرہون منت مہ و اختر نہیں ہوں میں
میری نگاہ ہے شہ امکاں کے حسن پر
کافر کی آنکھ دیدۂ شب پر نہیں ہوں میں
اسرار ہوں ثناگر اکرام کبریا
ہر بوالہوس کی مدح کا خوگر نہیں ہوں میں

نعت بہ زمین غالب

"اترائے کیوں نہ خاک سر رہگذار کی"
غالب نہ

اسرار احمد سهاوری زرہ
گوجرانواله

یثرب کی ہر گلی ہے امانت [illegible]ر کی
"اترائے کیوں نہ خاک سر رہگذ[illegible]ر کی"
ان کی نظر کا ایک اشارہ جو [illegible] گیا
دکھلاؤں گا بہار دل وافگا[illegible] کی
رفتار رک گئی ہے زمانے کی ان دنوں
کتنی طویل ہے یہ گھڑی انتظار کی
لے لیں گے آپ سایہ رحمت میں [illegible] الغیر
حالت جو دیکھ پائیں گے اس دل فگار کی
وہ ہیں شفیع روز جزا اس خیال سے
کچھ آس بندھ گئی کرم کردگار کی
دل جیت لے عدو کا بیک جنبش نظر
دنیا کو ہے تلاش اسی شہسوار [illegible]
رحمت کا ان کی لائی ہے پیغام سلی العص[illegible]
منت ہے میرے دل پہ نسیم بہار کی
ڈر ہے کہ شوق دید کو وحشت نہ لے اڑے
اسرار خیر مانگ گریباں کے تار کی

دعا

گوہر ملسیانی

بیت الحرم کا پھر وہی جلوہ دکھا مجھے
تو اپنے گھر میں اے مرے مولا بلا مجھے

میں عشق لازوال کی لذت میں گم رہوں
جذب دروں کے ذوق سے کر آشنا مجھے

اسرار زندگی سے میں واقف نہیں ابھی
یا رب! تو راز ہستی انساں بتا مجھے

تیرا کرم کہ حرف دعا بھی سکھا دیئے
آتی نہیں تھی کوئی بھی ورنہ دعا مجھے

تیرے جلال و سطوت و لطف و کرم لکھوں
اہل ہنر بھی مان لیں نغمہ سرا مجھے

بھر دے مرے شعور میں افکار جانفزا
حسن ازل کی نعمتیں کر دے عطا مجھے

میں بھی ہوں تیری بارش رحمت کا منتظر
قطرہ ہوں بحر عشق میں گوہر بنا مجھے

ہدیہ نعت

غالب

حق جلوہ گر ز طرز بیان محمدؐ ست — آری کلام حق بزبان محمدؐ ست

آئینہ دار پرتو مہرست ماہتاب — شان حق آشکار ز شان محمدؐ ست

تیر قضا ہر آئینہ در ترکش حق ست — اما کشاد آن ز کمان محمدؐ ست

دانی اگر معنی لولاک ۰۰ وار سی — خود ہرچہ از حق ست از آن محمدؐ ست

ہر کس قسم بدانچہ عزیزست می خورد — سوگند کرد گار بجان محمدؐ ست

واعظ حدیث سایہ طوبی فروگذار — کا ینجا سخن ز سرو روان محمدؐ ست

بنگر دو نیمہ گشتن ماہ تمام را — کاں نیمہ جنبشی ز زبان محمدؐ ست

درخود ز نقش مہر نبوت سخن رود — آں نیز نامور ز نشان محمدؐ ست

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ ست

"تضمین قدسی کی نعتیہ غزل پر"

غالب

کیستم تا بخروش آوردم بے ادبی   قدسیاں پیش تو در موقف حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمہ زیر لبی   مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

اے کہ روئے تو دہد روشنی ایمانم   کافرم کافر اگر مہر منیرش خوانم
صورت خویش کشید است مصور انجم   من بیدل بجمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی

اے گل تازہ کہ زیب چمنی آدم را   باعث رابطہ جان و تنی آدم را
کردہ دریوزۂ فیض تو غنی آدم را   نسبتے نیست بذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی

اے لبت رابسوئے خلق زخالق پیغام   روح را لطف کلام تو کند شیریں کلام
ابر فیضی کہ بود از اثر رحمت عام   نخل بستان مدینہ تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بشیریں رطبی

خواست چوں ایزد دانا کہ بساطے از نور   گسترد در ہمہ آفاق چہ نزدیک چہ دور
حکم اصدار تو در ارض و سما یافت صدور   ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآن بزبان عربی

وصف رخش تو اگر در دل ادراک گزشت   نہ ہمیں است کہ از دائرۂ خاک گزشت
ہچو آں شعلہ کہ گرم از خس و خاشاک گزشت   شب معراج عروج تو از افلاک گزشت
بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی

چہ کنم چارہ کہ پیوند خجالت گسلم   من کہ جز چشمہ حیواں نبود آب و گلم
من کہ چوں مہر درخشاں بدمد نوردلم   نسبت خود بسگت کروم و بس منفعلم
زانکہ نسبت بسگ کوئے توشد بے ادبی

دل ز غم مردہ و غم بردہ ز ما صبر و ثبات   ساری کن و بنمائی بما راہ نجات
واو سوز جگر ما کہ دہد نیل و فرات؟   ماہمہ تشنہ لبانیم و توئی آب حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی

غالب غمزدہ را نیست دریں غمزدگی   جز بامید ولائے تو تمنائے بکی
از تب و تاب دل سوختہ غافل نشوی .   سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پے درماں طلبی

علامہ اقبال کا یوم غالب پر پیغام

(۱۰ فروری ۱۹۳۷ء کو انجمن اردو پنجاب کی طرف سے "یوم غالب" زیر صدارت برجوہن کیفی وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں منعقد ہوا۔ سب سے پہلے انجمن کے سیکریٹری میاں بشیر احمد نے علامہ اقبال کا پیغام پڑھ کر سنایا جو انہوں نے خاص طور پر "یوم غالب" کے لیے بھیجا۔ پیغام درج ذیل ہے =

"اپنا پیغام تو میں کیا دوں گا البتہ غالب کا پیغام ان لوگوں تک پہنچا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں جو آج یوم غالب منا رہے ہیں۔ ان کا پیغام یہ ہے =

بگذر از مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

"مرزا آپ کو اپنے فارسی کلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اس دعوت کا قبول کرنا یا نہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے لیکن اگر آپ اسے قبول کرنے کا فیصلہ کر لیں تو ان کے فارسی کلام کی حقیقت اور ان کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ اول یہ کہ عالم شعر میں مرزا عبدالقادر بیدل اور مرزا غالب کا آپس میں تعلق ہے۔ دوم یہ کہ مرزا بیدل کا فلسفہ حیات غالب کے دل و دماغ پر موثر کہاں تک ہوا اور مرزا غالب اس فلسفہ حیات کو سمجھنے میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آج کل کے وہ نوجوان جو فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے مرزا غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کریں تو بہت فائدہ اٹھائیں گے۔"

(گفتار اقبال، ص ۲۰۷)

غالب سال و سن کے حوالے سے

عبدالمنعم مہدی

۱۷۵۰ء ( ) : میرزا قوقان بیگ خان (ابن ترسم خان سلجوقی)۔ غالب کے دادا کی سمرقند سے ہندوستان میں آمد

تقریباً: چندے لاہور میں قیام کیا اور اس کے بعد شاہ عالم کے عہد میں دلی پہنچے اور شاہی ملازم ہو گئے۔ بعد کو اس سے مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری کر لی۔ آگرہ میں قیام)۔

۱۷۹۷ء (۲۷ دسمبر)

۱۲۱۲ھ (۸ رجب): اسد اللہ (بیگ) خان کی آگرے میں ولادت۔

: (قوقان بیگ خان کے بڑے بیٹے عبداللہ بیگ خان کا نکاح آگرے کے ایک امیر فوجی افسر میرزا غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوا۔ یہ اسد اللہ خان کے والدین تھے۔ اسد اللہ خان سے بڑی ایک بہن چھوٹی خانم نام کی تھیں۔

۱۷۹۹ء : یوسف علی خان (غالب کے چھوٹے بھائی) کی ولادت۔

۱۸۰۲ء : میرزا عبداللہ بیگ خان (غالب کے والد) کا ریاست الور کی ملازمت میں انتقال۔ کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست، درخاک راج گڑھ پدرم رابود مزار (غالب) اسد اللہ خان اور ان کے خاندان کا نصر اللہ بیگ خان (عبداللہ بیگ خان کے علاتی برادر خرد) کی سرپرستی میں آنا۔

(نصر اللہ بیگ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے قلعدار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ اس پر وہ انگریزی فوج میں سترہ سو مشاہرے پر ۴۰۰ سواروں کے رسالدار مقرر ہو گئے)

۱۸۰۶ء (اپریل): نصر اللہ بیگ خان کا ہاتھی سے گر جانے سے زخمی ہونا، اور انتقال۔

(نواب احمد بخش خان والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو کی ہمشیر نصر اللہ بیگ خان کے عقد نکاح میں تھی)۔

۱۸۰۶ء (۴ مئی) : احمد بخش خان کی سفارش پر انگریزوں کی طرف سے نصر اللہ بیگ خان کی پس ماندگان کا وظیفہ دس ہزار روپیہ (پہلا شقہ)۔

(اس وظیفے میں نصر اللہ بیگ خان کے والدہ، تین بہنیں، اسد اللہ خان اور ان کے چھوٹے بھائی یوسف علی خان حصہ دار تھے)

۱۸۰۶ء (۷ جون) : وظیفہ کی رقم دس ہزار سے پانچ ہزار سالانہ کر دی گئی (دوسرا شقہ) غالب کا حصہ ساڑھے سات سو روپے (۷۵۰ روپے) سالانہ۔

(اس شقے کی رو سے ایک شخص خواجہ حاجی بھی اس وظیفے میں دو ہزار سالانہ کا حصہ دار قرار دیا گیا تھا)

۱۸۱۰ء: اسد اللہ خان کی مولوی محمد معظم کے مکتب (آگرہ) میں تعلیم ختم۔

۱۸۰۷۔۱۸۰۸ء: شعرگوئی کا آغاز۔ اسد تخلص۔ چندے بعد اسے بدل کر غالب رکھ لیا۔
(تقریبا) : (ایک اور شاعر میرامانی اسد تھے۔ چوں کہ لوگ اس کا کلام ان سے منسوب کرنے لگے تھے' انھوں نے اسد تخلص ترک کر کے اس کی جگہ غالب کرلیا)

۱۸۱۰ء (۹ اگست): الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے دلی میں نکاح۔

۱۲۲۰ھ (۷ رجب) :(الٰہی بخش خان چھوٹے بھائی تھے نواب احمد بخش خان کے۔ ان کا دیوان چھپ چکا ہے۔ نکاح کے وقت غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی)

۱۸۱۰ء (۲۰ ستمبر): میر تقی میر کی لکھنؤ میں وفات۔

۱۲۲۶ھ۔۱۸۱۰ء۔ ۱۸۱۱ءملا عبدالصمد ایرانی کا ورود اگرہ۔

۱۸۱۲۔۱۸۱۳ء، ۱۲۲۸ھغالب کی دلی میں آمد اور مستقل سکونت۔ ملا عبدالصمد کی ہندوستان سے واپسی

۱۸۲۵ء (نومبر' دسمبر)مرزا یوسف علی خان کی شدید بیماری' دیوانگی کا آغاز

۱۸۲۸ء / ۱۲۴۲ھ : الٰہی بخش خان معروف (غالب کے خسر) کا انتقال۔

۱۸۲۶ء (اکتوبر) : نواب احمد بخش خان کی فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کی حکومت سے دست برداری (نواب شمس الدین احمد خان والی ریاست)

۱۸۲۶ء (دسمبر): غالب کا سفر کلکتہ پر روانہ ہونا۔ پنشن کے مقدمے کی تیاری۔

۱۸۲۷ء (۲۱ فروری) : نواب احمد بخش کا انتقال۔

۱۸۲۸ء (۱۹ فروری) غالب کا کلکتے میں ورود۔

۱۸۲۸ء :(۲۸ اپریل) پنشن کے مقدمے کا آغاز۔
سرکاری درباروں میں کرسی نشینی کا آغاز۔ گل رعنا کی ترتیب و تدوین۔
(یہ اردو اور فارسی کلام کا انتخاب انھوں نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین کی فرمائش پر کیا تھا)

۱۸۳۰ء (۲۷ جنوری) مقدمہ خارج۔
(اس کے بعد وہ (اپیل کرتے ہوئے' جس کا سلسلہ ۱۸۴۴ء تک رہا لیکن یہ ابتدائی فیصلہ قائم رہا۔)

۱۸۳۵ء (۲۲ مارچ) : ولیم فریزر (دلی میں انگیرز ایجنٹ) کا قتل۔ کریم خان داروغہ شکار نواب شمس الدین احمد خان کی گرفتاری۔

۱۸ اپریل: نواب شمس الدین احمد خان کی الزام قتل میں گرفتاری

۲۶ اگست): کریم خان کو بجرم قتل پھانسی کی سزا۔

(۸' اکتوبر): نواب شمس الدین احمد خان کو باالزام اعانت مجرمانہ پھانسی۔

(اس پر فیروز پور جھرکہ کا علاقہ انگریزوں نے واپس لے لیا۔ اس کے بعد غالب کی پنشن ساڑھے سات سو روپے سالانہ' ریاست لوہارو کی جگہ انگریزی خزانے سے ادا ہونے لگی)

۱۸۳۷ء (ستمبر): اکبر شاہ ثانی کا انتقال۔

۱۸۴۰ء: دلی کالج میں مدرس فارسی کے عہدے کی پیشکش اور غالب کا انکار۔

۱۸۴۱ء (اکتوبر): دیوان اردو کا پہلا ایڈیشن (مطبع سید الاخبار' دلی۔

(دیوان ۱۸۲۱ء سے پہلے مرتب ہو چکا تھا)

۱۸۴۲ء ۱۸۴۴ء: بعہد لارڈ ان برا گورنر جنرل' خلعت ہفت پارچہ اور سہ رقم جواہر کا غالب کو اعزاز۔

۱۸۴۵ء: دیوان فارسی (میخانہ آرزو سرانجام) کا پہلا ایڈیشن (مطبع دارالسلام' دلی۔ (دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو چکا تھا)

۱۸۴۷ء (اکتوبر): دیوان اردو کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت (مطبع دارالسلام دلی)۔

۱۸۴۷ء (۲۵ مئی): گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں غالب کی گرفتاری۔

(فیصلے میں چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانے کی سزا ہوئی۔ مشقت تو غالب پچاس روپے ادا کر کے معاف ہو گئی۔ وہ صرف تین مہینے میں قید میں رہے' اس کے بعد رہائی ہو گئی)

۱۸۴۹ء اگست: پنج آہنگ (فارسی) کا پہلا ایڈیشن (مطبع سلطانی' لال قلعہ' دلی۔

۱۸۵۰ء (۴ جولائی): تیموری خاندان کی تاریخ (مہرنیمروز) لکھنے پر تقرری۔ خلعت اور خطاب نجم الدولہ' دبیر الملک' نظام جنگ۔

(تاریخ نویسی کی تنخواہ چھ روپے سالانہ مقرر ہوئی)

(زین العابدین خان عارف (امراء بیگم کے بھانجے) کی وفات۔

(عارف اپنی ادبی لیاقت کی وجہ سے غالب کو بہت عزیز تھے۔ عارف کے دو لڑکوں کو امراؤ بیگم نے پالا تھا۔ بستی نظام الدین میں مرزا غالب کے قریب کونے میں قبر ہے)

۱۸۵۲ء (مئی): حکیم مومن خان مومن کا دلی میں انتقال۔

۱۸۵۳ء (اپریل): پنج آہنگ (فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع دارالسلام' دلی)

۱۸۵۴ء (۱۵ نومبر): شیخ محمد ابراہیم ذوق (استاد ظفر) کا انتقال۔ غالب استاد ظفر۔

۱۸۵۴ء۔۱۸۵۵ء۔ مہرنیمروز کی طباعت و اشاعت (فخر المطابع دلی۔

۱۸۵۶ء: قادر نامہ کی اشاعت اول (مطبع سلطانی' لال قلعہ دلی۔

(یہ نظم انہوں نے عارف کے دونوں بچوں کو فارسی اور اردو پڑھانے کے لیے کہی تھی)

۱۸۵۷ء (۵ مئی): غالب استاد نواب یوسف علی خان ناظم والی رام پور۔

۱۸۵۷ء (۱۰ مئی): غدر کا میرٹھ میں آغاز۔

(۱۱ مئی) : دیسی فوج (تلنگوں) کا دلی میں داخلہ' انگریزی تسلط کا خاتمہ' دیسی اقتدار کا قیام' غالب کی قلعے کی تنخواہ اور انگریزی پنشن بند۔

(۲۰ ستمبر) : انگریزوں کی فتح اور دلی پر دوبارہ قبضہ۔

(۸ اکتوبر) : میرزا یوسف علی خان (برادر غالب) کی وفات۔

(اگرچہ غالب نے لکھا ہے کہ ان کی وفات بخار سے ہوئی' لیکن غالباً وہ انگریز کی گولی کا نشانہ بنے)

۱۸۵۸ء (نومبر) : دستنبو کی اشاعت اول (مطبع مفید خلائق' آگرہ)۔

(اس مختصر تحریر میں انہوں نے 'غدر' سے متعلق اپنی یادداشتیں آپ بیتی کے انداز میں قلمبند کی ہیں۔)

۱۸۵۹ء (جولائی) : رام پور سے سو روپیہ ماہانہ۔ وظیفہ مقرر ہوا۔

۱۸۶۰ء (۱۹ جنوری) سفر رام پور کا پہلا سفر۔

(وہ ایک ہفتے کے سفر کے بعد ۲۷ جنوری کو رام پور پہنچے تھے)

(مارچ) : رام پور سے واپسی۔

(میرزا ۱۷۔ مارچ کو رام پور سے روانہ ہوئے اور سات دن بعد ۲۴ مارچ کو دلی پہنچے)

۱۸۶۰ء (مئی) : انگریزی پنشن کا دوبارہ اجرا۔

(تین برس کا بقایا ساڑھے سات سو سالانہ کے حساب سے ۲۲۵۰ روپے وصول ہوا)۔

۱۸۶۱ء (۲۹ جولائی) ۱۲۷۸ھ (۲۰ محرم) دیوان اردو کا تیسرا ایڈیشن (مطبع احمدی' دلی)

۱۸۶۲ء : قاطع برہان کی طبع اول (مطبع نو لکشور لکھنؤ)

(غدر کے زمانے میں مشہور فارسی لغات' برہان قاطع غالب کی نظر سے گزرا۔ اس پر انہوں نے جو اعتراض قلم بند کیے تھے' وہ اس عنوان سے چھپے)

۱۸۶۲ء (جون) ۱۲۷۸ھ (ذی الحجہ) دیوان اردو کا چوتھا ایڈیشن (مطبع نظامی' کان پور)

۱۸۶۳ء (مارچ) انگریزی درباروں میں کرسی نشینی اور خلعت کے اعزاز کا دوبارہ اجرا۔

(غدر' کے زمانے میں غالب کا رویہ مشکوک پایا گیا تھا اس لیے ان کی پنشن اور یہ دونوں اعزاز بند ہو گئے تھے۔ تگ و دو کے بعد پنشن مئی ۱۸۶۰ء میں جاری ہوئی اور بقیہ اعزاز اب)

۱۸۶۳ء : دیوان اردو کی پانچویں اور آخری اشاعت (مطبع مفید خلائق' آگرہ)۔

۱۸۶۳ء (مئی' جون) دیوان فارسی (کلیات نظم فارسی) کا دوسرا ایڈیشن (مطبع نو لکشور' لکھنؤ)

۱۸۶۳ء۔ ۱۲۸۵ھ مثنوی ابر گہربار کی اشاعت (اکمل المطابع' دلی)

(یہ مثنوی کلیات نظم میں شامل تھی لیکن اب الگ سے شائع ہوئی)

۱۸۶۴ء قاطع برہان کے جواب میں محرق قاطع برہان مصنفہ سید سعادت علی کی اشاعت (مطبع احمدی' دلی)

قادر نامہ کی دوسری اشاعت (مجلس پریس' دلی)

۱۸۶۵ء/۱۲۸۱ھ : محرق قاطع برہان (سید سعادت علی) کے جواب میں
(۱) واقع ہزیان مصنفہ سید محمد نجف علی جھجری
(۲) لطائف غیبی از میاں داد خان سیاح
(۳) سوالات عبدالکریم از عبدالکریم کی اشاعت (اکمل المطابع' دلی)
(اگرچہ لطائف غیبی اور سوالات عبدالکریم دونوں تحریریں دوسروں کے نام سے شائع ہوئیں' لیکن یہ غالب کی اپنی تصنیفات ہیں)

۱۸۶۵ء (۳۱' اپریل) نواب یوسف علی خان والی رام پور کا انتقال۔ نواب کلب علی خان کی جانشینی۔
(۷' اکتوبر) میرزا غالب کا رام پور کا دوسرا سفر۔
(میرزا ۷' اکتوبر کو دلی سے چلے اور ۱۲' اکتوبر کو رام پور پہنچے تھے)
دستنبو کا دوسرا ایڈیشن (مطبع لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی)۔
قاطع برہان کے جواب میں ساطع برہان مصنفہ میرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی (مطبع ہاشمی' میرٹھ)۔
(اگست): غالب کے رسالے نامہ غالب بجواب ساطع برہان کی اشاعت (مطبع محمدی' دلی)
(دسمبر): قاطع برہان کی طبع ثانی بعنوان درفش کاویانی کی اشاعت (اکمل المطابع' دلی)
(دسمبر): رام پور کے دوسرے سفر سے واپسی۔
(میرزا ۲۸ دسمبر کو رام پور سے روانہ ہوئے اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء کو دلی پہنچے)۔

۱۸۶۶ء : قاطع برہان کے جواب میں موید برہان مصنفہ مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع مظہر العجائب' کلکتہ)۔
قاطع برہان کے جواب میں قاطع القاطع مصنفہ امین الدین امین دہلوی کی اشاعت (مطبع مصطفائی' دہلی)۔

۱۸۶۷ء : تیغ تیز کی اشاعت (اکمل المطابع' دہلی)
(غالب نے یہ مختصر رسالہ موید برہان کے جواب میں لکھا تھا)

۱۸۶۷ء (فروری): نکات غالب و رقعات غالب کی اشاعت (مطبع سراجی' دلی)
(میجر فرلر نے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال کو حکم دیا کہ غالب سے فارسی قواعد سے متعلق کتاب لکھوائی جائے۔ ماسٹر صاحب موصوف کے کہنے پر میرزا نے یہ دو مختصر رسالے قلمبند کیے)۔

۱۸۶۷ء (۱۱' اپریل) ہنگامہ دل آشوب (۱) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد' آرہ)۔
۱۲۸۳ھ (۵ ذی الحجہ) قاطع برہان کے مناقشے کے سلسلے کے منظومات
۱۸۶۷ء (اگست) / ۱۲۸۴ھ (ربیع الثانی) سبد چین کی اشاعت (مطبع محمدی' دلی)۔
۱۸۶۷ء (۲۵ ستمبر) / ۱۲۸۴ھ (۲۵ جمادی اول) ہنگامہ دل آشوب (۲) کی اشاعت (مطبع منشی سنت پرشاد' آرہ)۔
۱۸۶۷ء (۲' دسمبر): مولوی امین الدین دہلوی مصنف ساطع برہان کے خلاف مقدمہ ازالہ حیثیت عرفی۔

۱۸۶۸ء (جنوری) / ۱۲۸۴ھ (ربیع الثانی) کلیات نثر فارسی (غالب) کی اشاعت (مطبع نو کشور لکھنؤ)
(اس میں فارسی نثر کی تین کتابیں' پنج آہنگ اور مہرنیمروز اور دستنبو شامل ہیں۔)
۱۸۶۸ء (۲۳' مارچ) مولوی امین الدین دہلوی کے مقدمے سے دست برداری' راضی نامہ۔
۱۸۶۸ء (۲۷' اکتوبر) عودہندی' مجموعہ مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت (مطبع مجتبائی' میرٹھ)
غالب کی وفات بستی نظام الدین (خاندان لوہارو کی ہڑواڑ) میں تدفین
۱۸۶۹ء (۱۵' فروری) / ۱۲۸۵ھ (۲ ذیقعد) (اگرچہ بہت دن سے مختلف امراض کا شکار تھے' لیکن موت سے چند دن پہلے غشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ ۱۴ فروری دوپہر کو بیہوش ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ اسی حالت میں اگلے دن دوپہر ڈھلے انتقال کیا)۔
۱۸۶۹ء (۲' مارچ) اردو معلی (مجموعہ مکاتیب اردو کی پہلی اشاعت (اکمل امطابع' دلی)۔
۱۸۶۹ء : شمشیر تیز تر از مولوی احمد علی احمد جہانگیر نگری کی اشاعت (مطبع نبوی' کلکتہ) (یہ قاطع برہان کے سلسلے کی آخری کتاب غالب کی تصنیف تیغ تیز کے جواب میں ہے' جو میرزا کی وفات کے بعد شائع ہوئی' اگرچہ اس کی طباعت ان کی زندگی میں شروع ہو چکی تھی)۔
۱۸۷۰ء (۴ فروری) بیگم غالب امراؤ بیگم کا انتقال۔
۱۲۸۶ء : (مرزا غالب کی مشرقی دیوار کے باہر کی طرف مدفون ہیں)۔
(۲ ذی قعد)
۱۸۷۶ء (یکم شوال) حسین علی خان (زین العابدین خان عارف کے چھوٹے بیٹے) کا دلی میں انتقال
ماخوذ' عیار غالب از مالک رام

"غالب کی حقیقت پسندی"

پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال بہاولپور

غالب کی شاعری کا عہد انیسویں صدی کا نصف اول ہے۔ ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے وہ عملاً شعر گوئی ترک کر چکے تھے اور ان کی زیادہ تر توجہ نثر نگاری کی طرف ہو گئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب ایک نظام دم توڑ رہا تھا اور ایک نیا نظام جنم لے رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی نے مغلوں کے ساڑھے تین سو سال پر مشتمل دور اقتدار کا خاتمہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی تہذیبی انحطاط کا عمل بھی مکمل ہو گیا زوال کی تاریک اور لمبی رات ختم ہوئی اور ایک نئی صبح طلوع ہوئی ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ نئی زندگی نیا تہذیبی ماحول 'نیا کلچر' نئے اسالیب اور نئے پیمانے بھی ساتھ لائی ایسے میں غالب ہمیں ایک ایسے دوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں جس کے ایک طرف گزرا ہوا کل اور دوسری طرف آنے والا کل ہے مگر وہ تاریخ کے جبر کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ یہی فرق ہے غالب میں اور اس دور کے دوسرے شعراء میں جنہوں نے ایک ناگزیر تبدیلی کو ذہنی طور پر تسلیم نہ کیا اور اپنے آپ کو ماضی کے قرینوں کا پابند بنائے رکھا۔ غالب ذہنی طور پر اپنے عہد سے آگے کے آدمی ہیں انہوں نے خود بھی اپنے آپ کو "عندلیب گلشن ناآفریدہ" قرار دیا تھا' غالب صورت حال کا ادراک کچھ اس طرح کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ے وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ — اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

بوئے گل' نالہ دل' دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

غالب کا ذہن ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کے عہد کے حالات منعکس ہو گئے ہیں۔ غالب کے زمانے میں ابھی قوی تحریکیں پیدا نہیں ہوئی تھیں اس لیے وہ ایک حد تک ہی اپنے ماضی کا نوحہ پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کیونکہ اس کے بعد وہ فوراً ہی اپنی وفاداریاں نئے عہد کے ساتھ استوار کر لیتے ہیں ویسے بھی ان کا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جو طالع آزمائی کے لیے ہندوستان آیا تھا پھر بھی انہوں نے شہر آرزو کے اجڑنے کا ماتم کیا ہے:

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے دکھائی دیتے ہیں:

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

یہی ان کی وہ حقیقت پسندی ہے جو حالات و واقعات کے تجربے سے پیدا ہوئی ہے غالب جیسا ذہین شخص ہی یہ محسوس کرسکتا تھا کہ زمانے کے سیل کے سامنے خس و خاشاک کا بہہ جانا لازمی ہے۔ زندگی مسلسل ارتقاء کا عمل ہے اس کے سامنے دیوار کھڑی نہیں کی جاسکتی یہی سب کچھ دیکھ کر انسوں نے اپنے آپ کو نئے دستور عمل کا شریک بنایا اور یوں کہ معظمہ سے لے کر مقتدر سرکاری اہل کاروں تک غالب کے ممدوح ٹھہرے۔ غالب نے یہ بھی کوشش کی کہ ان کا نام تاج برطانیہ کے وفاداروں کی فہرست میں رہے یہ ان کی مجبوری بھی تھی کہ وہ انگریز سرکار کے پنشن خوار تھے اور دربار میں اپنے رتبے کے مطابق نشست اور منصب کے اس صورت حال میں خواہاں تھے۔ غالب نے وطن پرست ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تاہم یگانہ نے بوجوہ اپنی ایک رباعی میں غالب کو نشانے پر رکھا ہے۔ بہرحال یہ یگانہ اور غالب پرستوں کا معاملہ ہے جنہیں یگانہ چڑانے کی خاطر "غلچی" کہا کرتے تھے یگانہ کی رباعی ہے

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے
مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ
غالب کو وطن پرست کہنے والے

اس ساری بحث کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ غالب کا اپنے عہد کے ساتھ حقیقی رابطہ تھا گرانہیں میر کی طرح گزری ہوئی زندگی اور مٹتی ہوئی تہذیب کا مسلسل نوحہ کرنا پسند نہ تھا تاہم ایک انسان' ایک دانش ور اور ایک شاعر کی حیثیت سے انسوں نے پرانی اقدار کو مٹتے اور نئی تبدیلیوں کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا اور اپنے عہد کے تاریخی شعور کو اپنی شاعری کے ذریعے پیش کیا۔

غالب کی شاعری سے اردو غزل میں ایک نئی حقیقت پسندی کا آغاز ہوا اور ایسا زندگی سے نباہ اور حالات سے سمجھوتہ کرنے کی ان کی عادت کی وجہ سے ہوا۔ نباہ کرنے اور سمجھوتہ کرنے میں اگرچہ فرق ہے۔ نباہ میں زندگی سے محبت کا رویہ موجود ہوتا ہے جب کہ سمجھوتہ منفی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے غالب کے یہاں زندگی سے نباہ زیادہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مزاح اور شگفتہ مزاجی کا سہارا لیتے دکھائی دیتے ہیں یا خود بخود فطرت کی طرف سے ا س کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی بناء پر غالب کو "حیوان ظریف" بھی کہا گیا ہے غالب کی زندگی' ان کی شاعری اور خطوط میں تفکر اور تبسم کا امتزاج بہت عجیب و غریب ہے۔ شگفتہ مزاجی اور فکر کی گہرائی بہت کم یکجا ہوتے ہیں اور ان میں عام طور پر بعد المشرقین نظر آتا ہے لیکن غالب کی شاعری اور خاص طور پر ان کے خطوط میں سنجیدہ تفکر' اور ظرافت میں کوئی بڑا فاصلہ نظر نہیں آتا۔ اس اعتبار سے ان کی شخصیت نفسیات کی اصطلاح میں مکمل شخصیت (Totlpersonality) ہے۔ ان کی شخصیت میں بعض تضادات کے باوجود وحدت نظر آتی ہے دوسرے معنوں میں ان کی شخصیت یکجا (Integrated) ہے اسی لیے ان کا فن بھی جامعیت (Exclusive Universality) رکھتا ہے ہو سکتا ہے کچھ لوگوں کو یہ بات اس لیے عجیب لگے کہ بظاہر شاعری میں دکھائی دینے والی غالب کی شخصیت خطوط میں موجود شخصیت سے بالکل مختلف دکھائی دیتی ہے دراصل ارباب کمال اپنے زمانے کے افراد ہوتے ہوئے بھی اپنے زمانے سے بلند آرزوؤں اور آرزوؤں کے لوگ ہوا کرتے

ہیں۔ یہی کچھ غالب کی شاعری میں بھی ہمیں دکھائی دیتا ہے غالب اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ ان کی تمنائیں بے حساب ہیں غالب کے بہت سے اشعار اس کی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں:

آتا ہے یاد حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

منظر اک بلندی پر اور ہم بناسکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھا کہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو' اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا

مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

نہ لائی شوخی اندیشہ' تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا' عہد تجدید تمنا ہے

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآوے

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

آخری شعر بہ طور خاص غالب کے طرز فکر اور طرز حیات کے حوالے سے ان کے ذوق و شوق کی غمازی کرتا ہے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ خیال درست ہے کہ تمنا کا لفظ غالب کے اس طبع ایجاد پسند اور فلسفہ طراز ذہن کی گرہ کشائی کرتا ہے جو ناسامد حالات میں بھی ترک انا یا نفی ذات پر آمادہ نہیں ہوتا۔ خود نگری و خودداری اور خود شناسی و خود اعتمادی اس کا بنیادی جوہر ہے اور اس جوہر پر وہ بہرحال نازاں رہتا ہے۔ غالب ہمیشہ اپنی تمناؤں آرزوؤں اور امنگوں کے ساتھ زندہ رہے ان کی زندگی کا یہ پہلو ان کے شعری تجربے میں ڈھلتا چلا گیا۔ اس وجہ سے غالب کی شاعری اور خطوط میں ان کی شخصیت کا تضاد بظاہر تضاد ہے ورنہ خواب میں خیال کا معاملہ ہو یا زندگی کے حقیقی مصائب ہر دو صورتوں میں غالب کا دل دو عالم سے لگا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمناؤں کے حسرتوں میں بدلنے کے باوجود وہ سرشار دکھائی دیتے ہیں اور ان کی حس ظرافت بات بات پر پھڑکتی نظر آتی ہے۔ وہ اپنی اسی حس سے اپنے لیے مشکل سے مشکل حالات میں بھی آسانیاں پیدا کرلیتے ہیں۔

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کر ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر — دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے
ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن — ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کے عذر مستی ایک دن
غافل ان ماہ طلعتوں کے واسطے — چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
درپہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا — جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
بغل میں غیر کے آج آپ سوئے ہیں کہیں ورنہ — سبب کیا؟ خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

غالب نے زندگی کا مطالعہ جذباتی' جمالیاتی اور نفسیاتی طریق کار سے کیا ہے۔ تفکر ان کے مزاج کا حصہ ہے لیکن وہ شاعری میں منطقی انداز اختیار نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ جذبے اور خیال کو اہمیت دیتے ہیں۔ سوائے اقبال کے اردو کے کسی شاعر کے یہاں مربوط فلسفہ حیات موجود نہیں ہے۔ شاعر اگرچہ اپنے عصر رواں کا ساتھ نبھاتا ہے مگر اس کی نظر ابدیت پر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں بعض متضاد تجربے بھی نظر آتے ہیں ویسے بھی تضاد تو زندگی کے حسن اور ارتقاء کا باعث ہے۔ غالب کے یہاں تجربات و احساسات کا تنوع بھی اور رنگینی بھی' شخصیت کا تضاد بھی ہے اور شعری تصورات کا ربط بھی۔ غرض غالب کے یہاں زندگی کا منفی یا مثبت جو بھی تصور ملتا ہے اس پر شاعرانہ تخیل کا رنگ چڑھا ہوا ہے وہ ہر چیز کو جمالیاتی ڈھانچے میں ڈھال لیتے ہیں۔ زندگی کے ہر تجربے کا متبادل ان کے یہاں نقش جمال کی صورت موجود ہے۔ مجموعی طور پر غالب کے یہاں زندگی کا المیہ پہلو زیادہ نمایاں ہے اس میں غم عزت' غم ناموس' غم روزگار اور غم عشق کے علاوہ ان کی ذاتی ناآسودگیاں بھی شامل ہیں۔ غالب نے ان سب غموں کو ایک ایسی جمالیاتی اساس فراہم کی ہے کہ یہ زندگی کے معمولات کا حصہ بن گئے ہیں:

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو' غالب کہ دل — دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے — بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں — روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

غالب کے یہاں عشق کا تصور بھی ان کی حقیقت پسندی کے تابع ہے اگرچہ بنیادی طور پر وہ ایک جذباتی انسان تھے اسی سبب سے محبت کا جذبہ ان کے بہت اندر تک موجود تھا مگر مشکل یہ تھی کہ ان کی انا بہت طاقتور تھی اور ایسے میں من اور عشق کے درمیان کشاکش کا پیدا ہو جانا فطری سی بات تھی چنانچہ حسب توقع غالب کی انا اکثر مواقع پر آڑے آجاتی ہے یوں ان کے یہاں سپردگی کے بجائے غالب آنے کا رویہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ من کی پرستش یا ستائش کا میلان ان کے یہاں کم ہے۔

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بے داد گر کو میں

حسن پر تعرف حاصل کرنا' قرب کی خواہش اور دامن کو حریفانہ کھینچنے کا انداز غالب کی پہچان قرار پاتے ہیں وہ اپنی دانست میں پندار کے صنم کدے کو توڑ پھوڑ بھی دیں تب بھی ان کی انا چرا نما دکھائی دیتی ہے۔

غالب کے یہاں محبت کا جذبہ روحانی واردات کے برعکس انسانی رویوں کا حامل ہے۔ یہ خالصتاً انسانی جذبہ ہے جس میں غیر کا تذکرہ کبھی حسد' کبھی رقابت اور کبھی رشک کے احساس کو پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح غالب کا محبوب بھی کوئی ماورائی پیکر نہیں ہے بلکہ زمینی مخلوق ہے جس کا گوشت پوست کا جسم ہے اور اس جسم میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے اس کی اپنی نظر انتخاب ہے اس کا اپنا معیار اور ترجیحات ہیں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ عاشق کی ہر بات بے چون و چرا مان لے۔ وہ اگرچہ کردار کا اتنا پختہ نہیں مگر اتنا نادان بھی نہیں کہ عشق اور ہوس میں تمیز نہ کرسکے۔ وہ درپہ رہنے کو بھی کم کہہ سکتا ہے اور اپنی بات سے مکر بھی سکتا ہے وہ سراپا ناز ہے مگر بوقت ضرورت دھول دھپا بھی کرسکتا ہے وصل میں شوق کے زوال پر پریشاں بھی ہوسکتا ہے تو بھری بزم میں ستم ظریفی کا مظاہرہ بھی کرسکتا ہے غیر سے راہ و رسم بھی بڑھاسکتا ہے تو بہت دنوں کے تغافل کے بعد مائل بہ کرم بھی ہوسکتا ہے۔ غالب نے محبوب کو اس کی ساری انسانی خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ قبول کیا تھا۔ یہی ان کا حقیقت پسندانہ رویہ تھا تاہم ان کی حقیقت پسندی کا بے ساختہ اظہار رشک کی حالت کے بیان میں ہوتا ہے:

خدا کا واسطے داد اس جنون شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اور جس کی انتہا غالب کا یہ شعر ہے:

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

غالب کے یہاں رشک کے مضمون کے پس منظر میں ان کی انا' خود پرستی اور جذباتی ناآسودگی کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ان کی شاعری میں رشک کے جذبے کی کارفرمائی نے ان کی تمناؤں' آرزوؤں اور حسرتوں کو بھی نئے نئے معنی عطا کئے ہیں حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ان کی ذات خود ان کے مقابل آجاتی ہے یہ رشک کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جس تک صرف غالب ہی پہنچ سکتے تھے۔

دیکھنا خوبی کہ آپ اپنے پہ رشک آجاتے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

غالب کی یہی حقیقت پسندی جو کبھی رشک کبھی بے صبری' کبھی بے اختیار اور کبھی معصومیت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے ان کے ہمیشہ کام آتی رہی اور انہوں نے باوجود ناکامیوں اور محرومیوں کے زندگی کو اپنے لیے گوارا بنائے رکھا۔ وہ اپنی خستہ حالی کے باوجود اپنے آپ کو محشر خیال سمجھتے رہے اور تخلیق حسن اور معنی آفرینی کے ذریعے اپنے غموں کو بھی جمالیاتی آہنگ عطا کرتے رہے۔

"کلام غالب کے خوبصورت تضادات"

اسرار احمد سہاوری گوجرانوالہ

زندگی کی بنیاد تضاد پر رکھی گئی ہے۔ اس حقیقت کا مظاہرہ زندگی کے ہر منظر میں نظر آجاتا ہے اس اصول حیات کو سمجھنے کے لیے قطعی کسی غور و خوض کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً زندگی کے ساتھ موت لگی ہوئی ہے۔ پھول کے ساتھ کانٹا بھی شاخ گل میں پیوست ہوتا ہے۔ تاریکی کے ساتھ روشنی ملحق ہے۔ خوشی کے ساتھ غم چلتا ہے وغیرہ وغیرہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد خالق حیات کی عظمت اور تدبر کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ زندگی کی بہترین اور کامل ترین صورت بغیر تضاد کے ممکن ہی نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کا خالق قادر مطلق ہے وہ چاہتا تو زندگی کو بغیر تضادات کے بھی تخلیق کر سکتا تھا۔ لیکن ایسی زندگی میں معنویت' مسرت' لذت اور دل بستگی مفقود ہو جاتی اور زندگی ایک بے معنی اور بے کیف چیز ہو کر رہ جاتی۔ مثلاً اگر صرف زندگی ہوتی اور موت اس کا تعاقب نہ کرتی تو زندگی کی کیا مدد ہوتی۔ اسے بچانے کی کوئی جدوجہد ہوتی اور نہ اس سے کوئی محبت کا جذبہ پیدا ہوتا۔ نہ بداعمالی اور مظالم پر کوئی گرفت ہوتی۔ نہ سزا و جزا کا تصور ہوتا بلکہ ہر قسم کی فعالیت ختم ہو جاتی اور سخت ناگوار جمود طاری ہو جاتا۔ اس طرح زندگی خود وبال جان ہو کر رہ جاتی زندگی میں تمام رونقیں حرکت ہی سے ہیں۔ جمود تو بالکل موت کا مترادف ہے۔ یکسانیت کے آزار کو مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے ایک جملے میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے فرمایا "حور ہو یا پری اگر گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے" اسی مفہوم کو ایک کلاسک شاعر نے بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے پابندی کو موضوع سخن بنایا ہے:

~ ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

مطلب یہی ہے کہ نہ ابدی زندگی دلچسپ ہے اور نہ عدم محض بلکہ دونوں متوازی چلیں تو بات بنتی ہے۔ پھر اس تضاد کی اور بہت سی خوبیاں بھی ہیں۔ یہ تضادات ایک دوسرے کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ کانٹا پھول کی حفاظت کرتا ہے' مرد عورت کی حفاظت کرتا ہے' غم خوشی کا ضامن ہے' سزا و جزا سکون معاشرت کی محافظ ہے' تاریکی روشنی کے لیے ناگزیر ہے' تیسری اہم بات یہ ہے کہ بغیر تضاد کے کسی حقیقت کا تصور ممکن ہے نہ ادراک اور نہ اس کی ضرورت ہی باقی رہتی ہے۔ مثلاً آپ بغیر تاریکی کے روشنی کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ اس کی خواہش۔ چوتھی اہمیت یہ ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں میانہ روی ہی بہترین رویہ اور اسلوب ہے۔ انتہا کسی چیز کی نہ پسندیدہ ہے نہ باعث خیر و برکت اور یہ میانہ روی تضادات کے دونوں رخوں کے حوالے ہی سے گرفت میں آسکتی ہے۔ پانچویں بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ تضاد کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کر کے علمائے عروض نے اسے باقاعدہ ایک شعری صنعت قرار دیا ہے اور واقعی اگر اس صنعت کو سلیقے اور بے تکلفی سے استعمال کیا جائے تو یہ اظہار میں خاصا حسن اور دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ کلاسک شعراء نے اس صنف کو بہت رواج دیا۔ شعوری طور پر اور ارادتاً" اس کو استعمال کیا البتہ جدید دور میں اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ شعوری طور پر ایک صنعت سمجھ کر اس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ البتہ اگر روانی کلام میں بے تکلفانہ آجائے تو استعمال کر لیتے ہیں اور یہ استعارے کی طرح عبارت میں حسن بھی پیدا کر دیتا ہے۔ شعوری طور پر اس کا استعمال صرف الفاظ کی صنعت گری

سمجھا جاتا ہے- یوں بھی جدید دور تکلفات کا نہیں سادگی اور بے تکلفی کا ہے- یہی نہیں بلکہ زبان دانی عبارتی حسن اور لغات پر عبور بھی مفقود ہو رہا ہے- ان تکلفات سے بھی ادیب چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں- ستم بالائے ستم یہ ہے کہ عام معاشرتی زندگی کے کوائف میں بھی اصول و قوانین کی پابندیاں مفقود ہو رہی ہیں- لوگ "بے اصولی اصول ہے اپنا" کے قول کو اپنا رہے ہیں- اسی لیے ادب کے علاوہ عام زندگی میں بھی انارکی پھیل رہی ہے اور لوگ قانون شکنی پر فخر کرنے لگے ہیں- زندگی کا یہ تخریبی رویہ غیر ترقی یافتہ ممالک ہی میں نہیں ترقی یافتہ ممالک میں بھی اپنے پورے شباب پر ہے-

انسانی فطرت بھی چونکہ تضاد کے تانے بانے سے بنی گئی ہے اس لیے اس کے خیالات' جذبات اور احساسات میں بھی وقتاً" فوقتاً" تضادات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اسی لیے ہر شاعر کے کلام میں بھی فطرتی طور پر یہ تضادات نظر آتے ہیں اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کلام میں یک رنگی و یکسانیت حاوی نہیں ہونے پاتی- ایک نئے پن کا احساس پیدا ہوتا رہتا ہے- اس سے قاری کی طبیعت اکتانے نہیں پاتی بلکہ تر و تازہ رہتی ہے-

ان تمہیدی گزارشات کے بعد اب ہم غالب کے دیوان میں "حسن تضاد" کا تعاقب کرتے ہیں- غالب کی زندگی میں اہم ترین مسئلہ ان کے عقائدی رجحانات کا بن گیا ہے- اس لیے سب سے پہلے ان کے عقائدی تضادات کی طرف رجوع کرتے ہیں- واضح رہے کہ ایمان اور عقیدے کے بارے میں بھی تقریباً ہر سوچ بچار کرنے والے کے ذہن میں وقتی طور پر تضادات پیدا ہوتے رہتے ہیں- دنیا کا کوئی مفکر اس اصول سے ماورا نہیں ہے- یہ صرف غالب ہی کا مسئلہ نہیں ہے- پختہ ایمان والے لوگ اس قسم کے وساوس کو اپنی قوت ایمانی سے جھٹک دیتے ہیں اور راہ راست پر قائم رہتے ہیں- کمزور ایمان و عزم کے لوگ البتہ دیر تک تشکیک' لاادریت اور انکار کی حدود میں گرفتار رہتے ہیں- غالب بھی اپنی تشکیک لاادریت اور کبھی کبھی انکار محض کے حوالے سے کافی بدنام ہوگئے ہیں- البتہ ان کے سوانح بتاتے ہیں کہ سن رسیدہ اور بزرگی کے ساتھ ساتھ اور زندگی کے ٹھوس تجربات سے ٹکرانے کے بعد اس قسم کے خیالات سے بڑی حد تک رجوع کرلیا تھا اور اس طرح اپنی مجموعی زندگی میں بھی شاعری کی طرح تضاد کو شامل کرلیا- ان رجحانات کا اعلان اردو سے زیادہ ان کی فارسی شاعری میں نظر آتا ہے- خصوصاً حقی رجحانات کا اعلان اردو سے زیادہ فارسی میں ہے- انہیں اردو سے زیادہ اپنی فارسی شاعری پر ناز بھی تھا- کہتے ہیں:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعہ اردو کہ بے رنگ من است

چنانچہ فارسی کی ایک نعتیہ نظم میں فریاد آوری کے طور پر نبی کریم ﷺ کے حضور اپنی ایمانی تزلزل کا برملا اعلان کرکے استمداد کا رویہ اختیار کرتے ہیں- فریاد کی لے استمداد کا عجز' خود احتسابی کی آرزو کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے- عرض کرتے ہیں "اے میرے فریاد رس میرے ایمان کا نخل تاراج ہوگیا ہے- اب اس جنس سے میرے پاس کچھ نہیں بچا- میں نہیں جانتا کہ سجدہ کیا ہے- میں صوم و صلوٰۃ سے بھی محروم ہوں میری پیشانی پر سجدے کا بھی کوئی نشان نہیں" اس اعلان کے برخلاف غالب اپنے آخری دور کے اردو اور فارسی اشعار میں ایک سچے اور پختہ کار موحد نظر آتے ہیں- غالب کافی عرصے تک ابوالفضل اور فیضی کے زیر اثر رہے لیکن اس کے ساتھ شاعری میں وہ بیدل کے پیروکار تھے اور بیدل کے ذہنی اور اعتقادی اثرات کی وجہ سے انہوں نے لاادریت سے رجوع کیا- اردو میں بھی سینکڑوں اشعار موجود ہیں جن میں انہوں نے اپنے موحد اور حق پرست ہونے کا اعلان کیا ہے اس سلسلے میں ان کا

مشہور شعر ہے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ایک اور شعر:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

عشق الٰہی و البیت کا یہ سادہ و پرکار شعر ملاحظہ ہو:

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ایک ہی غزل کے دو اشعار میں تصوف و معرفت کے سلسلے میں تضاد کے گل کھلائے ہیں باوجود تضاد کے اظہار کی بلندی قابل داد ہے۔ توحید و معرفت کا اظہار کرتے ہیں:

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بت آئینہ سیما نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اپنے ایک ہی مصرعے میں اپنا تضاد آمیز کردار پیش کر دیا ہے:
"ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا" بتوں کے سلسلے میں تضاد بیان کا حسن ملاحظہ ہو:

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

ایک ہی غزل کے تین اشعار میں تصوف و معرفت کے رنگ میں حسن تضاد کی جمال آرائی دیکھئے:

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بے خودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے
یعنی بحسب گردش پیمانہ صفات
عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے
نشوونما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

ایک اور پوری غزل صنعت تضاد کی مظہر ہے۔ اپنے حسن تضاد کی وجہ سے بہت مقبول ہے:

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے' وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

تضاد کے سلسلے میں وہ اشعار رہ گئے جو غالب نے اپنی تشکیک' لاادریت اور صنعت ایمانی کے سلسلے میں کہے۔ عقائدی تضاد کے اظہار کو بیان کرنے کے لیے ان کی چند مثالیں بھی پیش کرتا ہوں اپنے ایک مشہور قطعہ میں ایمان کی غیر یقینی حالت کو بیان کرتے ہیں:

ایمان مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر — کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے
بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
ستائش گر ہے رضواں اس قدر جس باغ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا
گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے
ایسی جنت کا کیا کرے کوئی — جس میں سو سو برس کی حوریں ہوں
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالب — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
دل گزر گاہ خیال مے و ساغر ہی سہی — گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا
کیا وہ غرور کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

آخر میں عبدالعزیز خالد صاحب کی ایک نظم "غالب" سے چند خوبصورت اشعار پیش کرتا ہوں جو انہوں نے غالب کے تضاد طبع اور اس کے شاعرانہ اظہار کے بیان میں لکھی ہے۔ یہ نظم اپنے زور بیان' تیکھے تیور اور مدحیہ بلند آہنگی کے لحاظ سے بڑی بلند پایہ ہے اور خالد صاحب کی تنقیدی ژاف نگاہی کی بڑی خوبصورت دلیل ہے۔ عبارت کی روانی اور پختگی بھی توجہ طلب ہے۔

"غالب"

دست آذر بھی ملا تجھ کو ید بیضا بھی — ہے تو کافر تو کھلا اور ولی پوشیدہ
کیوں نہ اوضاع زمانہ ہوں طبیعت کے خلاف — کرے رسموں سے ابا مشرب رندانہ ترا
حزن یعقوب بھی اندوہ زلیخا بھی ہے — ہے بیان جگر سوختہ افسانہ ترا

چمنستان تفکر ہے تری جولا نگاہ — فاقہ مستی میں بھی انداز ہے شاہانہ ترا
گرچہ بندوں کی خداوندی سے انکار بھی ہے — مگر افتاد طبیعت سے تو لاچار بھی ہے
بے نیازی بھی ہے مداحی سرکار بھی ہے — طلب پارچہ و کرسی دربار بھی ہے
زعم خود بینی و آزاد رہ روی کے باوصف — شامل خیل گدایان در یار بھی ہے
خود پرستی کا مداوا غم ہستی کا علاج — سوز و مستی سے بھرا رنگ ظریفانہ ترا
رونا آساں مگر ہنسنا نہیں آساں خود پر — ہے عطا کس کی یہ انداز حکیمانہ ترا
آشنائی ہے فقیہان حرم سے تیری — اور رندان قدح کش سے بھی یارانہ ترا

دو رخ تضاد کے اور ہیں جو خالد صاحب سے نظرانداز ہو گئے۔ ایک تجرید اور ابہام کے ساتھ سادہ نگاری اور سلاست کا تضاد دوسرا غالب کی تعلی خود پسندی اور عجز و انکساری کا اظہار۔ میں ان دونوں تضادات کے دو دو شعر پیش کرکے کمی پوری کر دیتا ہوں:

1_ تجرید اور ابہام:

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوق عیش بے پروا
فراغت گاہ آغوش وداع دل پسند آیا
سواد چشم بسمل انتخاب نکتہ آرائی
خرام ناز بے پروائی قاتل پسند آیا

سادگی سلاست

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
جب تو ہی خنجر آزما نہ ہوا

2_ خود پسندی:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

3_ عجز اور افتادگی:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

غالب کی "جنت دربستہ"

ضیغم شیروی

غالب کو اپنی عظمت کا احساس اس حد تک دامن گیر تھا کہ وہ کسی اور سے اخذ و استفادے کو اپنے لیے ننگ و عار گردانتا تھا

ما ہمائے گرم پروازیم' فیض ازما مجو
سایہ ہمچو دود' بالائے رود از بال ما

یعنی میری گرمی پرواز کا یہ عالم ہے کہ میرے پر و بال کا سایہ بھی دھویں کی طرح بالا ہی بالا چلا جاتا ہے اور میرے سایہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ پھر اس سے بڑھ کر ترگسیت اور انانیت کی انتہا اور کیا ہو سکتی ہے جب وہ یہ کہتا ہے :

فسانہ نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود' خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

یعنی دیگر شعراء تو خود کوشش کرکے فن شعر تک پہنچے اور یہاں خود فن شعر اس تک پہنچا ہے۔ قیاس کرنا چاہیے کہ جو شاعر اتنے زبردست ادعائے شاعری اور خودی کے ساتھ سامنے آئے گا تو اس سے حسد کرنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے' لیکن ان تمام حاسدین کو غالب کس نگاہ سے دیکھتا ہے ملاحظہ فرمائیے :

بروئے حاسدان در دوزخ کشادہ' رشک
از بہر خویش جنت دربستہ ایم ما!

یعنی ہم اپنی شاعری کے اعتبار سے ایک "جنت دربستہ" ہیں جہاں کسی کی رسائی ممکن نہیں البتہ اس چیز نے حاسدوں کے لیے دوزخ کا دروازہ ضرور کھول دیا ہے جس میں وہ ہر آن جلتے رہتے ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب یہ دیکھنا مطلوب ہے کہ غالب کی "جنت دربستہ" کی نوعیت کیا ہے؟ کیا یہ اظہار انانیت' اپنے پیچھے کچھ حقائق بھی رکھتا ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

علم النفس کے ماہرین جانتے ہیں کہ اکثر اوقات احساس برتری کی یہ علت' علالت بن جاتی ہے اور اس طرح کی انظہاریت سے' انا پرست اپنے لیے کچھ پناہ گاہیں تراش کر ذہنی عافیت کا سامان کر لیتے ہیں۔ فارسی زبان میں عرفی اور اردو میں میر و غالب' اس میں بری طرح مبتلا نظر آتے ہیں۔ صرف دعویٰ کرنا اور چیز ہے اور حقیقت نفس الامری بالکل "چیزے دیگر" کی ذیل میں آتی ہے اس میں شبہ نہیں کہ غالب درانتی نہیں بلکہ ایک درانتی شاعر تھا اور ایک ایسے نئے طرز شاعری کا خلاق تھا جس سے اس کے ہم عصر بالکل ناواقف تھے۔ اس نے معنی آفرینی' ندرت بیان اور طرفگیٔ اسلوب سے اردو اور فارسی شاعری کو وہ آہنگ اور لہجہ عطا کیا جسے اس کے ہم عصروں نے اگرچہ "جنس کاسد" سمجھ کر ٹھکرا دیا مگر آنے والی نسلوں نے اسے "متاع از دست رفتہ" سمجھ کر اس طرح اپنے سینوں سے لگایا کہ آج تک اس کی محبوبیت میں برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس وقت اگر عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو غالب کی

مقبولیت' اقبال اور فیض سے بھی کہیں زیادہ ہے' اور جتنا کچھ غالب پر لکھا جا چکا ہے یا لکھا جا رہا ہے اتنا کچھ اقبال اور فیض پر بھی نہیں لکھا گیا یہاں تک کہ غالب سے متعلق تحریرات کا اشاریہ ترتیب دینا بھی بجائے خویش اک طرح کی ریسرچ کا موضوع بن چکا ہے۔ مگر اس تمام تر عظمت اور شہرت کے باوجود اس گوشے کو سمجھنا از حد ضروری ہے جسے وہ اپنے لیے "جنت در بستہ" قرار دیتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ غالب کے ہاں اس دعوئی کے باوجود بھی ---- افذ و استفادے کی بے شمار مثالیں ہیں جن پر اکثر اوقات اس کے معترضین کی گرفت' صائب اور حقیقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ یہ ایسے حقائق جن سے' علمی سطح پر صرف نظر کرنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ واقعات شاہد ہیں کہ جب غالب پر اس کے ہم عصروں نے توارد اور سرقہ کے الزامات عائد کئے اور واضح طور پر ان مقامات کی نشان دہی بھی کر دی تو غالب جواباً' یہ کہہ کر مطمئن ہو گیا کہ :

مبر گمان توارد' یقین شناس کہ دزد
متاع من ز نہان خانہ ازل بردست

یعنی اسے توارد نہ سمجھو بلکہ یوں سمجھو---- کہ دراصل میرا ہی مضمون تھا جو نہان خانہ ازل میں' میں نے محفوظ کر دیا تھا اور چور نے اسے اڑا لیا---- اس خوبصورت شعری توجیہ پر واہ واہ تو کی جا سکتی ہے اور اس کی تازہ کاری اور اپج اپنی جگہ---- مگر اس سے علمی اور فنی دقیقہ شناس اور خواص ان لفظ و معنی کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا---- سچ تو یہ ہے کہ غالب نے ایسا کہہ کر انصاف سے کام نہیں لیا اور نہ یہ کوئی معقول بات بنتی ہے کیونکہ کسی معترض کی ٹھوس بات کو شوخی تمسخر یا شاعرانہ انداز سے رد کرنا علمی بارگاہ میں اس لیے مستحسن نہیں کہ اگر کسی نے سرقہ یا توارد کا الزام وارد کیا ہے تو وہ ایسے خیال کا اظہار تھا جسے وہ صحیح سمجھتا تھا۔ اس کا جواب بھی اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ وہ بھی علمی سطح پر قاطبہ دلیل و برہان کے ساتھ ہو---- حالانکہ غالب جیسا ذہین و فطین شخص بڑی آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ جس بات کو سرقہ کہا جا رہا ہے وہ محض توارد ہے جو شعراء کے ہاں ہمیشہ پایا جاتا ہے کیونکہ جذبات کی دنیا میں تاثرات ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں فرق صرف انداز بیان کا ہوتا ہے اس طرح توارد (باہم ایک جگہ وارد ہونا) کا جواز بآسانی نکل سکتا تھا---- ایک اور مقام پر غالب نے در پردہ اعتراف حقیقت کر کے ایک دوسری قلابازی کھائی ہے وہ کہتا ہے :

مضمون شعر "نوٹ" بود در زمانہ"
یعنی بدست ہر کہ افتاد' آن است

(شعر کوئی تمسک یا (Cheque) تو نہیں کہ اس پر کسی کا نام درج ہو یا مہر ثبت ہو۔ یہ مال جس کے ہاتھ لگے بس اسی کا ہے) یعنی اس کا چرانا کیا مشکل ہے؟

اس طنزیہ انداز میں شاید غالب کی اپنی یہ شکایت پوشیدہ ہو کہ لوگ اس کے مضامین اڑا لیتے ہیں---- مگر ایسی چوری پکڑنا کون سا آسان کام ہے یہ کچھ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع اور تمام مشاہیر شعراء کے کلام پر اس کی نظر ہو---- اس سلسلے میں عہد جہانگیری میں ملا شیدا اور ملا فیروز کی نوک جھونک تاریخ کا ایک دلچسپ باب ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مولانا فضل حق خیر آبادی نے غالب کے کلام کا جب انتخاب کیا تو ان کے بے شمار ایسے اشعار کو حذف کر دیا جو بیدل کے ناقص تتبع اور اس کی ناگواری اشکال پسندی کے مظہر تھے---- اگرچہ آج کل یہ روایت بھی محل نظر ہے کہ

غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب خود کیا تھا یا مولانا خیر آبادی نے حقائق کچھ بھی ہوں بیدل کے حوالے سے غالب کی شاعری' اس کا چربہ توارد اور ایک ناقص تتبع ضرور تھا۔ جس کی داخلی شہادتیں خود غالب کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں:

بیدل: آنجا جواب نامہ عاشق تغافل است
بے ہودہ انتظار خبر' سے کشیم ما

غالب نے اس خیال کو اردو کا پیکر دے دیا۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

دونوں اشعار اسی مضمون پر مبنی ہیں کہ خط کا انتظار بے کار ہے کیونکہ وہ جواب لکھیں گے ہی نہیں۔

غالب: تاکجا اے آگہی چشم تماشا باختن
چشم وا گردیدہ' آغوش و داع جلوہ ہے

یہ شعر بیدل کے اس شعر کا چربہ ہے:

چشم راہ وا کردن' کفیل فرصت نظارہ نیست
پرتو ایں شمع' آغوش وداع محفل است

"چشم وا" کو دونوں نے "آغوش وداع" ظاہر کیا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ بیدل نے اسے محفل سے متعلق کیا اور غالب نے جلوہ سے---- بیدل سے غالب کی یہ ہم آہنگی اس کی خصوصی افتاد طبع کی وجہ سے تھی جس کے نتیجہ میں بیدل کی بہت سی فارسی تراکیب' غالب کے تحت الشعور میں مرتسم ہو گئی تھیں جو بلا قصد و ارادہ اس کے قلم سے ٹپک پڑتی تھیں اس سے بڑھ کر دوسرے شعراء کے خیال کا سرقہ' قطعیت کے ساتھ کلام غالب میں دیکھا جاسکتا ہے' جو کسی طرح بھی توارد کی ذیل میں نہیں آتا صرف اس فرق کے ساتھ کہ اسے اردو کلام میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ یعنی من و عن: چند مثالیں دیکھئے

خاقانی: زیں نام تو تر کنم زباں را
صد بوسہ وہم لحم زباں را

غالب: زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

عتائی استر آبادی:

ناصح ز رشک پیش کسے چوں خمی برم
آیا سراغ از کہ کنم حول ترا

غالب: چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

بیگی دختر امیر علی جلائر کا ایک بہت ہی پاکیزہ شعر ہے:

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

غالب

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا!

اسی طرح کے بے شمار اشعار توارد اور سرقہ کے حوالے سے غالب کے اردو اور فارسی کلام میں موجود ہیں جن سے غالب کو اس الزام سے مبرّیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا۔---- اردو میں یاسمین کنیز انشاء اللہ خاں کا ایک شعر ہے:

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب نے پہلا مصرع بدل کر دوسرا پورا مصرع اڑا لیا اور واوین کی تکلیف بھی گوارا نہیں کی۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس میں شبہ نہیں کہ اس تصوف نے شعر کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے مگر غالب سرقہ سے بری نہیں ہے نظیری نیشاپوری کا ایک شعر ہے:

بوئے گل نالہ دل' دود چراغ محفل!
ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

غالب نے نظیری کا مصرع اولیٰ---- پورے کا پورا اور مصرع ثانی کو اردو میں ڈھال دیا۔

بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہ ہیں سرقہ اور توارد کی وہ کیفیتیں---- جن کا غالب نے باوجود اقرار نہیں کیا اگرچہ اس سے غالب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا---- کیونکہ اس قسم کی تمام خردہ گیریاں اس کے شعری حسن تخلیق کے سامنے ہیچ ہیں اس کے باوجود' میں دنیائے شعر میں' ان عناصر کو بھی غالب کے اجتہادات فن کا کرشمہ سمجھتا ہوں یہ اور بات کہ یہاں آکر اس کی جنت دربستہ کا بھید آشکارا ہو جاتا ہے کیونکہ متذکرہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ اس نے دوسروں کے خیالوں کی جنتیں اجاڑ کر---- صرف اپنے اخذ و استفادے کی قوت سے' انھیں اپنی جنت قرار دے کر اس کے دروازے پر "دربستہ" کا بورڈ آویزاں کر دیا ہے۔ یہ دلاویز "حرکتیں" غالب نے اور بھی متعدد مقامات پر کی ہیں۔ مگر پھر بھی یہی کہنا پڑتا ہے کہ اس کی زبردست قوت اختراع نے جو جو گل کاریاں کی ہیں وہ ہر لحاظ سے منفرد اور قابل توجہ ہیں بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل میں---- کچھ شعراء کے سمند خیال کی کوئی جست' ادھر ادھر پڑ کر شعر کو لفظی یا معنوی اعتبار سے دم بریدہ بنا دیتی ہے---- غالب اپنی تخلیقی لہر سے نہ صرف اسے مکمل کر دیتا ہے بلکہ ایسا کرنے سے وہ شعر کی تاثیر کو بھی کئی چند بڑھا دیتا ہے: یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں تھی کہ غالب کے دون مرتبت ہو اور اس کے جواز

کے لیے اسے کسی "نہان خانہ ازل" میں پناہ لینی پڑے۔ اس حوالے سے صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ عرفی کا ایک مشہور شعر ہے جو بجائے خویش معنی آفرین اور نزاکت تخیل کا عمدہ نمونہ ہے وہ کہتا ہے:

ہم سمندر باش وہم ماہی کہ در جیحون عشق
موج دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

مصرع اولیٰ میں ایک روایت کے مطابق "سمندر" اس کیڑے کو کہتے ہیں جو ایک جگہ ہزار سال تک مسلسل آگ جلنے کے بعد پیدا ہوتا ہے جو نہی وہ آگ سے باہر آئے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔ مطلب شعر یہ کہ اگر کوئی شخص عشق کی ابتداء اور انتہاء ---- دونوں سے جان سلامت لے آنا چاہتا ہے تو اس کو سمندر اور ماہی ---- دونوں ہونا چاہیے تاکہ جب سطح آب پر آئے تو مچھلی کی طرح تیرتا رہے۔ اور جب تہہ میں پہنچے تو وہاں کی گرمی سے متاثر نہ ہو ---- مگر یہ شعر اپنی تمام تر ندرت اور معنی آفرینی کے باوجود کچھ اسقام کا شکار ہو گیا ہے یعنی اس میں پہلا نقص الفاظ کے انتخاب کا ہے عرفی نے مصرع اول میں جس کو "جیحون کہا دوسرے مصرعے میں اسے دریا کہہ کر اس کا پیوند "سلسبیل" کے ساتھ لگا دیا حالانکہ یہ تینوں الفاظ اپنے اپنے علیحدہ مفاہیم رکھتے ہیں ---- ویسے معنوی اعتبار سے بھی "سلسبیل" کا لفظ، جس منظر کی تصویر کشی کے لیے لایا گیا ہے اس سے یہ تصویر مکمل نہیں ہوتی کیونکہ "سلسبیل" سے کوئی ایسی خصوصیت ظاہر نہیں ہوتی جس کی بنا پر وہ صرف ماہی کے لیے موزوں ہو اور دوسرے سے اس میں شناوری نہ کر سکیں یہ پہلو بھی کہ سلسبیل کے لفظ کی روایتی شگفتگی اور مسرت اس بات کی متقضی نہ تھی کہ اسے کسی معیبت کے اظہار کے لیے استعمال کیا جائے غالب نے عرضی کے اسی نقص کو سامنے رکھ کر اس میں یوں تصرف کیا:

در بلا بودن بہ از بیم بلا است!
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

یعنی معیبت میں پڑ جانا ---- معیبت کے خوف سے کہیں بہتر ہے اس کا ثبوت دوسرے مصرع میں یوں دیا ہے کہ جب تک انسان سطح اب پر ڈوبنے کے خوف سے ہاتھ پاؤں مارتا رہے تو اس وقت تک پریشان رہتا ہے، جب وہ ڈوب کر دریا کی تہہ میں پہنچ جائے ---- تو ساری معیبت دور ہو جاتی ہے ---- گویا سطح آب اس کے لیے آگ اور قعر دریا سلسبیل بن گیا۔ اس میں معنی آفرینی تو ظاہر ہے مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عرضی کے مقابلے میں غالب نے سلسبیل کا کتنا صحیح استعمال کیا ہے!

عیب طول کلام تو مجھ سے سرزد ہو ہی گیا ہے مگر اس تمام بحث و تمحیص سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ غالب فطرتاً" ایک خود آگاہ شاعر تھا اور اس خصوص میں کوئی دوسرا اس کا ہم سر نظر نہیں آتا۔ پس وجہ ہے کہ اس کا سرقہ ہو یا توارد ---- دونوں اس کی تخلیقی لیک سے پہلے سے ایک بہتر اور برتر سانچے میں ڈھل کر نکلتے ہیں۔ ہم عصر معترضین کے اعتراضات اپنی جگہ ---- اور غالب کے غیر منطقی استدلال یا حقیقت حال سے گریز بھی اپنی جگہ ---- مگر اس کے اندر خلاقیت کا جو ایک نادر عنصر تھا اس سے چشم پوشی بادی النظر میں بڑی دشوار نظر آتی ہے۔

آخر میں پھر لوٹتے ہیں ان کی "جنت دربستہ" کی طرف ---- جن کے کچھ احوال آپ کو معلوم ہو چکے ہیں ---- مگر اس کے باوجود، من حیث المجموع، اس کے کلام کی نادر کاریاں، دیکھتے ہوئے یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ اگر اس کا یہ دعویٰ مکمل سچ نہ بھی ہو تو اسے آدھا سچ ماننے کے لیے ہمارے پاس کوئی جواز بھی نہیں ہے ---- کیونکہ اگر ہم اس کا فارسی کلام چھوڑ بھی دیں

(جس پر اسے بجا طور پر ناز تھا) صرف اردو کلام کو (جسے وہ مجموعہ بے رنگ کہتا تھا) غور سے دیکھیں تو اس کے کلام کا ایک معتد بہ حصہ ایسا ہے جس میں تخیل آفرینی کی سطحیں اس قدر بلند ہیں کہ (اس سے آگے کی بات چھوڑیں) محض ان تک رسائی کے لیے بھی انسانی فکر کے پر جلنے لگتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں اس کے اردو کلام سے ایک انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ جو واقعتاً ایسی "جنت دریستہ" ہے جہاں تک رسائی کے لیے ایک طویل عرصہ سے بڑے بڑے خلاق اور ہنرور' غالب کے بنائے ہوئے سوالات کی غلام گردشوں میں پڑے' ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر سچ یہی ہے کہ النادر کالمعدوم!

یہ انتخاب میری بصیرت اور دانست کے مطابق غالب کے دعویٰ کی گواہی پر ایک شاہد عادل کا درجہ رکھتا ہے----- اشعار ملاحظہ ہوں:

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجوم اشک سے تار نگہ نایاب تھا

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو
ہمیں دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی' ابھی تر نہ ہوا تھا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا' ناخن گرہ کشا تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے سامنے تو کیا؟
بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن' درمیاں نہیں

قفس میں مجھ سے رو داد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

بہت دنوں سے تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگاہ' جو بظاہر نگہ سے کم ہے

گھر میں کیا تھا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم' اک حسرت تعمیر' سو ہے

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں' گھر میں بہار آئی ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی' نغمہ شادی نہ سہی

یہ فہرست ابھی مکمل نہیں ہے اس میں خاصا اضافہ بھی ممکن ہے مگر قارئین کو صرف ایک جھلک دکھانا مقصود تھی-----
اور یہ اندازہ کروانا بھی------ کہ اس کی "جنت دربستہ" کا رنگ کیا ہے؟

اشب قلم روکنے سے پہلے غالب کی ایک اور گپ----- جو شبلی کے الفاظ میں وحی معلوم ہوتی ہے پیش کر کے اجازت چاہوں گا (یاد رہے کہ یہ الفاظ شبلی نے مولانا آزاد کے بارے میں کہے تھے) جو موقع کی مناسبت سے' میں نے غالب کی الہامی فکر پر چسپاں کر دیے ہیں- کہتا ہے: محرم راز نہاں راز گارم کردہ اند
تبہ حرفم گوش تشنہ خلق' خوارم کردہ اند
میں زمانے کے تمام سربستہ رازوں کا محرم ہوں مجھے دنیا میں محض اس لیے ذلیل و خوار رکھا گیا کہ یہ پوشیدہ راز کہیں افشا نہ کر دوں-)

واقعی غالب کو مغلوبیت کہیں چھو کر بھی نہیں گئی ہے

شکست ناروا اور کلام غالب

سجاد مرزا

اردو ادب میں غالب ایک ایسی متنوع شخصیت ہے جس کے فکر و فن پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے مگر تشنہ کامی کا احساس اب بھی باقی ہے۔ اس کے کلام میں دیگر ممتاز شعراء کی طرح بہت کم معائب کا احساس ہوتا ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

شکست ناروا لسانی، قواعدی اور عروضی نقطہ نظر سے ایک عیب ہے۔ جس کی تلاش کا سہرا حسرت موہانی کے سر ہے۔ بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو کسی حد تک غالب بھی اس کا شکار دکھائی دیتے ہیں ان کے کلام میں شکست ناروا تلاش کرنے سے قبل ضروری ہے کہ اس کا مختصر سا جائزہ لیا جائے تاکہ اس عیب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ شاد عارفی کا ایک شعر ہے:

کسی کی زلف پریشاں کی دلکشی تو دیکھئے!
اگرچہ فن شعر میں شکست ناروا ہے وہ

اس سے قطع نظر کہ یہ شعر فن شعر کے کون کون سے اسرار و رموز اپنے اندر سموئے ہوئے ہے؟ اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ انہوں نے شکست ناروا پر لطیف پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ یہ ایک متنازع موضوع ہے جس کی موافقت و مخالفت میں نقادان سخن صف بستہ ہوئے۔

شکست ناروا کے بارے میں جب پہلی بار حسرت موہانی نے نشاندہی کی تو اس کی تردید و تائید میں اساتذۂ فن کی جانب سے ایک طویل سلسلہ چل پڑا۔ سیماب اکبر آبادی' اثر لکھنؤی اور منور لکھنؤی اس عیب کو معائب سخن میں شامل نہیں کرتے جبکہ نیاز فتح پوری' جوش ملسیانی' ابر احسن گنوری' سحر عشق آبادی' عطا کاکوروی اور شمس الرحمن فاروقی اسے معائب سخن میں شمار کرتے ہیں۔ پہلے گروہ کا خیال ہے چونکہ قدیم عروض اور بلاغت کی کتب میں اس عیب کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے یہ عیب بلا جواز ہے جبکہ دوسرے گروہ نے اسے معمولی غور و فکر کے بعد خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے۔

سحر عشق آبادی نے تو شکست ناروا پر "آرائے اہل قلم" کے عنوان سے مشاہیر کی آراء پیش کی ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

ثروت میرٹھی کا خیال ہے "شکست ناروا جدید اختراع ہے۔ قدیم ادبا نے اس کا ذکر نہیں کیا۔"(۱)

اثر لکھنؤی رقمطراز ہیں۔ "میرے نزدیک اس کا شمار معائب سخن میں غلط ہے۔ یہ شکست ناروا کا عدم وجود برابر ہے وہم غلط کار کا فریب ہے۔"(۲)

امن لکھنؤی کا خیال ہے "شکست ناروا کے عیب سے بشرطیکہ وہ عیب قرار دیا جاسکے شاید ہی کسی شاعر کا کلام پاک ہو۔ محض شکست ارکان کے باعث کسی اچھے شعر یا مصرع کو نظر انداز کر دینا میرے خیال میں کسی طرح بھی مناسب نہیں سمجھا جاسکتا۔"(۳)

سیماب اکبر آبادی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ "شکست ناروا مولانا حسرت موہانی کی ذاتی رائے ہے۔ علم الکلام کی کتابوں

میں کہیں اس کا ذکر نہیں۔ میں شکست ناروا کی اختراع کو تسلیم نہیں کرتا اور بدعت سمجھتا ہوں۔"(۴)

قاضی عبدالودود صاحب جو تحقیق میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں، اس مسئلے پر محض اتنا لکھتے ہیں۔ "شکست ناروا کو وہ خود حسرت موہانی کی ایجاد کردہ اصطلاح ہے۔ معیوب قرار دیا ہے۔ عروض اس سے واقف نہیں۔ اساتذۂ ہندو ایران کے نزدیک یہ سقم نہیں۔"(۵)

یہ آرا متفقہ طور پر اس بات کو تقویت دیتی ہیں کہ چونکہ قدیم عروضیوں نے شکست ناروا کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ لہٰذا یہ معائب سخن میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

پروفیسر عنوان چشتی کا جذبہ لائق تحسین ہے کہ انہوں نے عروضی اور فنی مسائل پر ایک خوبصورت کتاب تحریر کی ہے۔ "شکست ناروا میں عروضی اور لسانی امکانات" پر انہوں نے مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ قاضی عبدالودود کی محولہ بالا رائے پر تنقید کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ "قاضی عبدالودود بھی اس گروہ میں شامل ہیں جو تقلیدی اور روایتی انداز نظر رکھتا ہے۔ موصوف کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو عروض سے واقف نہیں یا پھر انہوں نے حسرت کے عروضی اور لسانی امکانات پر غور نہیں کیا ہے۔"(۶)

قبل اس کے کہ شکست ناروا کے لسانی اور عروضی امکانات کا جائزہ لیا جائے، ضروری ہے کہ شکست ناروا کے بارے میں حسرت موہانی کا نقطہ نظر پیش کیا جائے۔

"فارسی اور اردو کی شاعری میں جو بحریں مروج ہیں۔ ان میں سے بعض کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مصرعے کے دو ٹکڑے ہو جایا کرتے ہیں۔ ایسے تمام اشعار میں اگر مصرع کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے نہ ہو سکیں بلکہ ایسا ہو کہ کسی لفظ یا فقرے کا ایک حصہ ایک ٹکڑے میں اور دوسرے ٹکڑے میں دوسرا حصہ لازمی طور پر آ تا ہو تو یہ بات یقیناً معیوب سمجھی جائے گی اور شاعر کی کمزوری پر دلالت کرے گی۔ شکست ناروا اسی عیب کا نام ہے۔"(۷)

پروفیسر عنوان چشتی اس تعریف کا تجزیہ اپنے الفاظ میں کچھ یوں کرتے ہیں۔

1- "بعض بحریں جو مساوی ٹکڑوں میں منقسم ہو جاتی ہیں یعنی دونوں ٹکڑوں کے درمیان وقفہ ہوتا ہے' یہ متفقہ ایک عروضی حقیقت ہے۔ مولانا حسرت نے عروض کی تاریخ میں پہلی بار بحروں کے دو حصوں میں منقسم ہونے اور عروضی وقفہ کو شعوری طور پر دریافت کیا ہے۔"

2- "دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر مصرع کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے نہ ہو سکیں بلکہ ایسا ہو کہ کسی لفظ یا فقرے کا ایک حصہ ایک ٹکڑے میں اور دوسرا حصہ دوسرے ٹکڑے میں لازمی طور پر آتا ہو تو یہ بات معیوب ہے۔ یعنی بحر کے ایک عروضی ٹکڑے پر الفاظ یا فقرہ کا ایک حصہ مکمل ہونا چاہیے اور دوسرے عروضی حصہ پر دوسرا لسانی ٹکڑا یا فقرہ مکمل ہونا چاہیے یہ اصول ایک لسانی اور قواعدی حقیقت ہے۔ جس کا رشتہ فصاحت کے اصولوں سے ملتا ہے۔"( )

ابو الحسن گوری شکست ناروا پر ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ "متعدد بحریں ایسی ہیں جو پورے پورے دو ٹکڑوں سے بنی ہیں۔ ایسی حالت میں ایک مصرعے کے پورے پورے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ مثلاً متفاعلن متفاعلن / متفاعلن متفاعلن اس میں دوسرے متفاعلن پر مصرعے کا نصف حصہ ختم ہو گیا ہے اور چوتھے پر دوسرا حصہ ختم ہو گیا ہے۔ شاعر کو مصرعے

موزوں کرتے وقت چاہیے کہ ایک پوری بات پہلے حصہ پر ہی ختم کرے اور اسی بات کا دوسرا حصہ دوسرے نصف پر۔" (۹)

ابو الحسن گنوری کی اس رائے سے ہماری اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ شکست ناروا کے لسانی اور قواعدی اور عروضی پہلوؤں کی پاسداری ضروری ہے' پہلے مصرع کے پہلے حصے میں لسانی اور قواعدی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے حصہ میں عروضی حصہ کی نشاندہی ملتی ہے۔ جوش ملیسانی کی مندرجہ ذیل رائے سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

"بعض بحریں ایسی ہیں کہ ان میں ہر مصرع دو برابر حصوں میں منقسم کرنا پڑتا ہے۔ ترنم' موسیقی یا مصرع کی روانی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نصف مفہوم کے لحاظ سے مکمل یا قریب قریب مکمل ہو۔" (۱۰)

ارکان کی تعداد کے نقطہ نظر سے' بحروں کی تین شکلیں ہمیں اردو میں رائج ملتی ہیں۔ جنہیں مربع' مسدس اور مثمن کہا جاتا ہے۔ مربع میں دو مسدس میں تین اور مثمن میں چار ارکان ہوتے ہیں۔ مثمن کی نسبت مربع اور مسدس میں شکست ناروا نہیں ہوسکتا۔ اس کا اطلاق ان بحروں پر ہوتا ہے جو دو سے تقسیم ہو جاتی ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی اس بارے میں اپنی کتاب "عروضی اور فنی مسائل" میں بھرپور انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے "مثمن بحریں جن میں مثمن سالم' مثمن مرکب اور مثمن مزاحف' بحریں دو سے تقسیم ہو جاتی ہیں۔ مضاعف بحریں جن میں مسدس مضاعف اور مثمن مضاعف بحریں بھی دو سے تقسیم ہو جاتی ہیں ان بحروں کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ بحریں دو برابر کے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان ایک فطری وقفہ ہوتا ہے۔ ایسی بحروں کو دونیم کہا جاسکتا ہے۔ دونیم بحروں میں آواز کے فاصلے کے نقطہ نظر سے وقفہ دو طرح کا ہوسکتا ہے۔ جس کو خفیف وقفہ اور طویل وقفہ کہا جاسکتا ہے۔ رواں دواں بحروں میں خفیف وقفہ ہوتا ہے۔ ڈھیلی' طویل اور دونیم بحروں میں طویل وقفہ ہوتا ہے۔ خفیف وقفہ عام طور پر مثمن سالم بحروں میں اور طویل وقفہ مثمن مزاحف مثمن مضاعف اور مسدس مضاعف میں ہوتا ہے۔ خفیف وقفہ کے مقام پر شکست ناروائے خفی اور طویل وقفہ کے مقام پر شکست ناروائے جلی واقع ہوتا ہے۔ یہ ایک جوہری حقیقت ہے مجرد اوزان کی سطح پر وقفہ کا وراک تو ہوتا ہے لیکن شکست ناروا کی شناخت اوزان پر لسانی قواچست کرنے سے ہوتی ہے۔ شکست ناروا کا داخلی تعلق عروض سے اور خارجی رشتہ زبان اور قواعد سے ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ دونیم بحروں میں وقفہ کے مقام پر لسانی اور قواعدی نقطہ نظر سے بھی دو ٹکڑے اس طرح ہوں کہ وہ زبان اور قواعد کے اصولوں پر بھی پورے اترتے ہوں۔ اس حقیقت کو نظرانداز کرنے سے شکست ناروا وارد ہوتا ہے۔" (۱۱)

محولہ بالا اقتباس اگرچہ طویل ہے مگر اس سے ہمارے نقطہ نظر کی بھرپور وضاحت ہو جاتی ہے۔

کلام غالب کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بھی عروضی نقائص اور شکست ناروا کے دھندلے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ان کے دور میں شکست ناروا جیسے عیب پر کسی نے روشنی نہیں ڈالی۔ غالب کے کلام میں جلی اور خفی دونوں طرح کے شکست ناروا کا عمل دکھائی دیتا ہے۔

(الف) شکست ناروائے جلی:

(۱) بحر مضارع مثمن مفعول و فاعلاتن / مفعول فاعلاتن

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا / دل سے جگر جدا تھا

مصرع ثانی میں اپنا اور دل کے درمیان وقفہ ہے مگر اپنا مصرع کے پہلے ٹکڑے میں' اور دل دوسرے ٹکڑے میں علیحدہ علیحدہ باندھے گئے ہیں جبکہ "اپنا دل" ایک ہی جگہ یا ایک ہی ٹکڑے میں ہونا چاہیے تھا۔

- حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
  دل جوش گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

مصرعے اول کے پہلے ٹکڑے میں "بے" اور "ٹھ" الگ الگ ہوگئے ہیں۔ جبکہ "بیٹھ" کو ایک ہی ٹکڑے میں آنا چاہیے تھا' یہ مصرعے کے حصہ اول یا دوم میں جہاں کہیں بھی استعمال کیا جاتا اکٹھا ہی آنا چاہیے تھا۔

۲۔ بحر مجتث مثمن: مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن

- گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا
  گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

مصرع ثانی میں پہلے ٹکڑے میں "اض" اور دوسرے ٹکڑے میں "طراب" جدا جدا ہیں۔ جبکہ "اضطراب" کو کسی ایک ٹکڑے میں ہونا چاہیے تھا۔

بحر مجتث مثمن: مفاعلن مفلاتن / مفاعلن فعلاتن

- عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
  کہ اپنے سائے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

مصرعے اولی کے پہلے ٹکڑے میں "جلا" اور دوسرے ٹکڑے میں "د" الگ الگ ہوگئے ہیں۔ "جلاد" کو پہلے یا دوسرے ٹکڑے میں سالم صورت میں آنا چاہیے تھا۔

- غم زمانہ نے جھاڑی نشاط عشق کی مستی
  وگرنہ ہم بھی اٹھاتے / تھے لذت الم آگے

مصرعے ثانی میں "اٹھاتے تھے" دو الگ ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے:

- یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
  تمہارے آئیو! اے طرہ ہائے خم بہ خم آگے

مصرع اول میں "پریشانیاں" اور مصرع ثانی میں "طرہ" دو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے:

۳۔ بحر رمل مثمن: فاعلات مفعولن / فاعلات مفعولن / مفعولان

- حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
  ہم نے بارہا ڈھونڈا' تم نے بارہا پایا

مصرع اول کے پہلے ٹکڑے میں "معلوم" کو مفعولن کی جگہ مفعولان بنایا گیا ہے:

- ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جائے
  داغ پشت دست عجز شعلہ خس بدنداں ہے

دوسرے مصرع میں "عجز" کے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔

دیکھا جائے تو کلام غالب میں شکست ناروائے جلی بہت کم پایا جاتا ہے۔ بعض بحریں بڑی رواں دواں ہیں اور ان کے ہاں دو نیم بحروں کا استعمال کم کم دکھائی دیتا ہے مگر اس میں بھی بڑی فنکارانہ چابکدستی اور کاوشوں کو دخل ہے۔

ب۔ شکست ناروائے خفی:

کلام غالب میں جہاں جلی کی بازگشت سنائی دیتی ہے وہاں شکست ناروائے خفی کا عمل بھی ملتا ہے۔ مگر جلی کی طرح اس کی تعداد بھی بہت ہی کم ہے۔ چونکہ یہ عیب غیر محسوس ہے۔ اس لیے اساتذۂ قدیم نے اس پر عمل نہیں کیا۔

ا۔ بحر ہزج مثمن: مفاعیلن مفاعیلن / مفاعیلن مفاعیلن

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

مصرعے اول میں "اس قدر" اکٹھا ہونا چاہیے تھا جبکہ مصرعے ثانی میں "بے" اور "خودوں" ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حباب موجہ رفتار ہے نقش قدم میرا

پہلے مصرعے میں "ماندگی" اور دوسرے میں "رفتار" کا عالم دیدنی ہے۔

ج۔ محاورے کا دو حصوں میں تقسیم ہو جانا:

بحر ہزج مثمن: مفاعیلن مفاعیلن / مفاعیلن مفاعیلن

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

مصرع ثانی میں محاورہ "ناک میں دم آنا" دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔

د۔ تلمیح کا ٹکڑوں میں بٹ جانا:

نہ چھوڑی حضرت یوسفؑ نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوبؑ کی پھرتی ہے زنداں پر

مصرع ثانی میں "یعقوب" دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔

ہ۔ اجزائے فعل کا دو حصوں میں منقسم ہو جانا:

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

"آتش برستی" اکٹھا آنا چاہیے تھا۔

غلط رکن یا غلط زحاف کا استعمال

بحر رجز مثمن: مفاعلن مفاعلن / مفاعلن مفاعلن

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟

مصرع اول میں "ت" اور مصرع ثانی میں "ر" زوائد ہیں جس سے مفاعلن کی بجائے مفاعلان ہوگیا ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"

مصرع اولی میں "ناز" کی "ز" زوائد ہے۔

متذکرہ بالا اشعار میں حشوین میں تسبیغ و اذالہ کی صورت دکھائی دیتی ہے جو کہ مسلمہ عروضی اصول کی نفی کرتی ہے۔ ایسے اشعار کو اوزان سے خارج قرار دیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں کلام غالب میں سقوط حروف علت، مرکب عددی، مرکب توصیفی، مرکب عطفی اور مرکب اضافی کے استعمال میں توڑ پھوڑ کا عمل بھی جاری و ساری ہے۔

غالب کی شاعری میں شکست ناروا کے اس تجزیے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انہیں نہ صرف عروض پر گہری دسترس تھی بلکہ لسانی اور قواعدی مسلمہ اصولوں سے بھی کامل طور پر آگاہی تھی۔ جن مقامات پر شکست ناروا کا عمل دکھائی دیتا ہے انہیں استثنائی صورتیں قرار دیا جاسکتا ہے بقول پروفیسر عنوان چشتی "اگرچہ غالب کے کلام میں شکست ناروا، زحاف کے غلط استعمال اور حروف علت کے سقوط کی مثالیں ملتی ہیں لیکن ایسے اشعار کی تعداد نہایت قلیل ہے۔ اگر شکست ناروائے خفی کو نظرانداز کر دیا جائے مجروح اشعار کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے غالب نے شکست ناروائے جلی اور غلط ارکان یا غلط زحافات استعمال کر کے عروضی مسلمات کی خلاف ورزی کی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا عروضی وجدان تو طاقتور تھا لیکن انہیں عروض پر پوری طرح قدرت نہیں تھی اور وہ عروض کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔" (۱۲)

ہم پروفیسر عنوان چشتی کی اس رائے سے متفق نہیں ہیں یہ کہنا کہ غالب عروض پر دسترس نہ رکھتے تھے یا وہ عروض کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ ایک مفروضے سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کو نہ صرف عروض پر مکمل دسترس تھی بلکہ وہ اس کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ تھے۔ (جیسا کہ اس مضمون کے آغاز میں یہ بات ہوئی ہے کہ) غالب کے دور میں شکست ناروا جیسی کوئی اصطلاح روا نہ تھی۔ غالب نے جہاں اس کی پاسداری نہیں کی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علم عروض اور اس کی باریکیوں سے آشنا نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف نئے عروضی تجربے کیے ہیں بلکہ تخلیقی تجربوں کو بھی دہرایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں جذبے کی شدت اور فکر کی گہرائی کا یکساں اظہار بھی ملتا ہے۔ غالب کے بے شمار نامور شاگردوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہ وہ عروض سے پوری طرح آگاہ نہ تھے۔ ان کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے:

حوالہ جات

"شان ہند" جون ۷۲ء ص ۳۲۔
ایضاً"
ایضاً"
ایضاً" ص ۴۳
ایضاً"
"اردو ادب" علی گڑھ اکتوبر ۱۹۵۱ء حسرت نمبر ص ۳۹
"نکات سخن" ص ۱۰۷
عروضی اور فنی مسائل ص ۱۸
میر اصلاحیں (حصہ اول) اشاعت اول ص ۵۳'۵۵
آئینہ اصلاح' مرکز تصنیف و تالیف نکودر ص ۳۸
عروضی اور فنی مسائل ص ۱۱۴
ایضاً" ص ۹۶

کتابیات

ابر احسن گنوری' میری اصلاحیں
جوش ملسیانی' آئینہ اصلاح
حسرت موہانی' نکات سخن
عنوان چشتی' پروفیسر' عروضی اور فنی مسائل
غالب' مرتبہ عرشی' دیوان غالب
اردو ادب علی گڑھ اکتوبر ۱۹۵۱ء
ماہنامہ شان ہند' جون ۱۹۷۲ء

اعلیٰ مدارج میں مطالعہ غالب

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن

غالب پر پاکستان میں پی ایچ ڈی کی سطح کا پہلا تحقیقی کام، قیام پاکستان کے پچیس برس بعد ۱۹۷۲ء میں انجام پایا۔ اب اس پر پچیس برس مزید گزر چکے۔ اس عرصے میں یونیورسٹیوں میں مطالعہ غالب کی روایت نے جڑ پکڑی ہے اور یہ کسی قدر مضبوط اور توانا ہوئی ہے۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ پاکستان میں غالب پر پی ایچ ڈی کی پہلی سند فضیلت حاصل کرنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا۔----- مقالے کا موضوع تھا "غالبیات کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ"----- میں نے یہ تحقیقی کام ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی نگرانی میں پورا کیا۔ پچیس برس پہلے ۱۹۷۲ء میں سندھ یونیورسٹی سے مجھے اس پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی۔ اس خوشگوار امتیاز کی طرف اشارہ بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ غالب کے ایک سو پچھتّرویں جشن ولادت (۱۹۷۲ء) کے موقع پر یہ مقالہ پی ایچ ڈی کے لیے منظور ہوا اور اضافہ و ترمیم کے بعد "غالب کا علمی سرمایہ" کے نام سے غالب کی ایک سو ویں برسی کی مناسبت سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ کتاب کا نیا ایڈیشن غالب کے دو صد سالہ جشن ولادت پر ۱۹۹۷ء میں آیا۔

پچھلے پچیس برس کے عرصے میں غالب پر پی ایچ ڈی، ایم فل اور ایم۔ اے کی جزوی تکمیل کے سلسلے میں مقالات لکھے گئے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ "شارحین دیوان غالب" (اردو شروح کا تقابلی مطالعہ) پنجاب یونیورسٹی میں ڈاکٹر وحید قریشی کی زیر نگرانی لکھا گیا۔ مقالہ نگار ہیں محمد ایوب شاہد۔ یہ مقالہ بھی کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔

۱۹۹۵ء میں ایم فل (اردو) کے لیے غالب سے متعلق ایک تحقیقی کام کی منظوری عمل میں آئی موضوع ہے: "تین اہم غالب شناس مولانا مہر، مالک رام اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن"----- مقالہ نگار پروفیسر نیر پرویز کا کہنا ہے کہ وہ کام مکمل کر چکے ہیں اور تھیسس ڈگری کے لیے پیش کیا جا چکا ہے۔

پچھلے پچیس تیس برس میں پاکستان کی متعدد یونیورسٹیوں اور بعض الحاقی کالجز میں جہاں ایم۔ اے (اردو) کی تدریس اور تحقیق کا انتظام ہے، غالب یا غالب شناسوں پر ایم۔ اے کی سطح کے مقالات (تھیسس) بھی لکھے گئے ہیں۔ اس تحقیقی کام کی کچھ دستیاب تفصیل یہ ہے:

شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور :

۱۔ کنایات متعلقہ غالب (صفحات ۱۲۵)، تفہیم النعیم، ۱۹۶۳ء، نگران: ڈاکٹر سید عبداللہ اور وزیر الحسن عابدی

۲۔ غالب کی امیجری (صفحات ۱۶۴)، زرینہ خٹک، ۱۹۷۰ء، نگران: ڈاکٹر عبادت بریلوی

۳۔ اردو رسائل کے غالب نمبر----- اشاریہ (ص ۲۱۸)، طیبہ اختر، ۱۹۷۰ء، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

۴۔ کلام غالب میں فکری عناصر (ص ۱۱۹)، صابرہ بانو، ۱۹۷۴ء، سجاد باقر رضوی

۵۔ شیخ محمد اکرام۔ (غالب شناس)، ص ۱۱۲، تسنیم کوثر، ۱۹۸۵ء، فخر الحق نوری

شعبہ فلسفہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور :

- غالب کی اردو شاعری کی مابعد الطبیعاتی روایت (ص ۲۳۷)، تنویر جہاں قریشی، ۱۹۸۶ء، ساجد علی

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ملتان :

- خطوط غالب: اردو (ص ۳۱۳) مقالہ نگار: نصرت فاطمہ ملک، ۱۹۶۹ء، نگران پروفیسر خلیل صدیقی

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، فیصل آباد :

۱۔ مطالعہ غالب انیسویں صدی میں (ص ۳۰۱) نجمہ نیاز، ۱۹۷۷ء، نگران: ڈاکٹر سید معین الرحمن

۲۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام بطور غالب شناس (ص ۳۱۸) قمر النساء شیخ، ۱۹۷۷ء ڈاکٹر سید معین الرحمن

۳۔ مولانا غلام رسول مہر بطور غالب شناس (ص ۲۰۳) نیر سلطانہ، ۱۹۷۷ء، ڈاکٹر سید معین الرحمن

۴۔ غالب کے تین اہم سوانح نگار، مہر، اکرام اور مالک رام (۲۱۸)، شازیہ اشفاق، ۱۹۹۱ء، ڈاکٹر انور محمود خالد

۵۔ غالب اور حالی کا تحقیقی مطالعہ (۱۳۰)، مقالہ نگار: ناہید اختر، شاہدہ شاہین، خالدہ حق، نوید افشاں، اعجاز حنیف، نگران: ڈاکٹر سید معین الرحمن

یہاں اس آخری کام کے بارے میں کچھ کہنا ضروری ہے: ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک میں نے منجملہ دیگر کورسز، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج فیصل آباد (لائل پور) میں ایم۔ اے (اردو) کے ایک سمسٹر کورس "اصول تحقیق و تدوین" کی تدریس کی خدمت بھی انجام دی۔۔۔۔۔ ۷۸-۱۹۷۷ء میں اس کورس کی تفویضات (Assignments) کے لیے میں نے پانچ پانچ کے گروپس میں تقسیم کرکے، ہر گروپ سے موضوعاتی مناسبت سے مختلف تحقیقی جائزے مرتب کرائے "غالب اور حالی کا تحقیقی مطالعہ" اس کورس کی ہوم اسائن مینٹس کے طور پر لکھے گئے غالب اور حالی کے بارے میں پانچ اہم تحقیقی کتابوں کے تحقیقی جائزوں پر مشتمل ہے:

۱۔ شہنشاہ سخن غالب، (ڈاکٹر عارف شاہ گیلانی)، جائزہ نگار: ناہید اختر

۲۔ غالب اور انقلاب ستاون (ڈاکٹر سید معین الرحمن) شاہدہ شاہین

۳۔ حالی بحیثیت شاعر (ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی)، خالدہ حق

۴۔ حالی کی اردو نثر نگاری (ڈاکٹر عبدالقیوم)، نوید افشاں

۵۔ حالی کا سیاسی شعور (ڈاکٹر معین احسن جذبی)، اعجاز حنیف

غالب اور حالی کے بارے میں پانچ کتابیں جنہیں وادی تحقیق کے نو آموز متعلمین نے اپنے مطالعے کے لیے منتخب کیا، ۱۹۴۳ء سے ۱۹۷۳ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئیں۔ ان میں سے ایک پر وارد و ادبی انعام دیا گیا جو پاکستان میں تحقیق و تنقید ادب کا اس زمانے تک سب سے بڑا اعزاز تھا، اور چار پر بمبئی، لکھنؤ، کراچی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض ہوئیں۔۔۔۔۔ اس عقب میں ان پانچ کتابوں کو غالب اور حالی پر ۱۹۷۳ء تک کی چوتھائی صدی کے نمایاں ترین تحقیقی اکتساب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ خوشی اور اطمینان کی بات یہ ہے کہ ان نوخیز مقالہ نگاروں نے کتابوں کے انتخاب میں خوش نظری کا ثبوت دیا اور

ان سب کو اپنے تحقیقی جائزوں کے نتائج کا اظہار کرنے کے لیے منضبط اور موثر پیرایہ بیان میسر آیا۔

"آخری سوار" اعجاز حنیف کو ابتدائی تربیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع میسر آیا اور انہوں نے عزیز احمد پر تحقیقی کام کر کے پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ وہ آج کل فیڈرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد میں پڑھا رہے ہیں اور اپنے تحقیقی کام کی طباعت و اشاعت کی فکر میں ہیں یہ ایک خوش آئند صورت حال ہے۔ اچھے تحقیقی کام کا چھپنا ثواب اور اس کا چھپا رہنا کارنا صواب ہے۔

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور میں پچھلے دس برسوں میں (۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۷ء تک) غالب سے متعلق ایم۔ اے (اردو) کے جو تھیسس لکھے گئے ان کے کتابیاتی کوائف یہ ہیں:

۱۔ رسالہ 'نقوش' میں ذخیرۂ غالبیات' (ص ۳۸۸)' مقالہ نگار: نائیلہ انجم' ۱۹۸۷ء
۲۔ مالک رام بطور غالب شناس (ص ۱۹۰)' ربیعہ نصرت' ۱۹۸۷ء
۳۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی بطور غالب شناس (ص ۲۰۲) نجمہ اقبال' ۱۹۸۸ء
۴۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری بطور غالب شناس (ص ۱۹۲) شہناز اختر' ۱۹۸۸ء
۵۔ آل احمد سرور بطور غالب اور اقبال شناس (ص ۳۱۱)' لبنیٰ ناز لودھی' ۱۹۸۸ء
۶۔ توضیحی اشاریہ "خطوط غالب" (مولانا غلام رسول مہر) جلد اول (ص ۱۹۰)' ہما اخلاق نسیم' ۱۹۸۹ء
۷۔ توضیحی اشاریہ "خطوط غالب" (مولانا غلام رسول مہر) جلد دوم (ص ۱۲۵)' ساجدہ پروین' ۱۹۸۹ء
۸۔ اردو کلام غالب کا ابجدی اشاریہ' (ص ۳۵۳)' حنا سرور' ۱۹۹۳ء
۹۔ "غالب نامہ" (نئی دہلی) کا تجزیاتی مطالعہ (ص ۳۵۳)' عاصمہ اعجاز' ۱۹۹۶ء
۱۰۔ عبدالرحمٰن چغتائی بطور غالب شناس (ص ۱۷۵)' حنا سرور' ۱۹۹۳ء
۱۱۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد بطور غالب شناس ص ۱۸۷' شہیدہ ممتاز' ۱۹۹۳ء
۱۲۔ مالک رام کی علمی اور ادبی خدمات (ص ۱۹۲)' اطہر قسیم' ۱۹۹۳ء
۱۳۔ ڈاکٹر وحید قریشی بطور غالب شناس (ص ۱۱۹)' حنا انیس' ۱۹۹۵ء
۱۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ بطور غالب شناس (ص ۱۹۷)' شکیلہ شاہ جہاں' ۱۹۹۵ء
۱۵۔ پروفیسر سید وقار عظیم بطور غالب شناس (ص ۱۳۱)' روشینہ ریاض' ۱۹۹۶ء
۱۶۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری بطور غالب شناس (ص ۲۹۴)' سیدہ افصح وحید' ۱۹۹۶ء
۱۷۔ کالی داس گپتا رضا بطور غالب شناس (ص ۲۶۳)' عظمت رباب' 1996ء
۱۸۔ صادقین بطور شاعر اور مصور غالب' محمد طاہر ۹۸۔۱۹۹۷ء

مندرجہ بالا سب مقالات کی نگرانی کی خدمت راقم الحروف (ڈاکٹر سید معین الرحمٰن) کے سپرد رہی۔ آخری مقالے پر تحقیقی کام زیر تکمیل ہے۔ تھیسس کا موضوع' پنجاب یونیورسٹی سے منظور ہو چکا۔ امید ہے کہ چند ماہ تک مقالہ امتحان کے لیے پیش کیا جاسکے گا۔

ان سب اسکالرز نے' جنہوں نے شعبہ اردو' گورنمنٹ کالج' لاہور میں غالب سے متعلق مقالے تحریر کیے' بلا استثنی اپنے کام پر درجہ اول کے نمبر پائے---- نجمہ اقبال کا مقالہ "مولانا مرتضی حسین فاضل لکھنوی بطور غالب شناس" کراچی کے ماہنامے الاسیر" (مدیر سید اشتیاق حسین) میں فروری ۱۹۹۵ء سے اپریل ۱۹۹۶ء تک قسط وار چھپ گیا ہے' افسوس کہ بیشتر اقساط پر مقالہ نگار نجمہ اقبال کا نام درج ہونے سے رہ گیا ہے۔

نائیلہ انجم' ہما اخلاق نسیم' ساجدہ پروین اور عاصمہ اعجاز کے مقالات کتابی صورت میں منظر عام پر آئے۔ (ا) شعبہ اردو' گورنمنٹ کالج' لاہور میں غالب کے علاوہ دیگر متعدد موضوعات پر لکھے گئے ایم اے کے مقالات بھی کتابی صورت میں چھپے ہیں۔ یہ ایک بڑا امتیاز ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے اہل علم و قلم کی جانب سے اس اہتمام اور انصرام کا تحسین آمیز اعتراف ہوا ہے۔

شعبہ فلسفہ گورنمنٹ کالج' لاہور میں ۱۹۶۷ء میں عبیدہ شاہ نے بزبان انگریزی' غالب کے بارے میں ایک تھیسس لکھا' موضوع تھا: "غالب فلاسفی آف بیوٹی" (ضخامت سو صفحات سے کچھ کم) اس مقالے کا تفصیلی حوالہ "اشاریہ غالب" میں آیا ہے۔ (۲) یہ مقالہ' معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے دو صد سالہ جشن ولادت (۱۹۹۷ء) کے موقع پر کتابی صورت میں چھپ گیا ہے۔ عبیدہ شاہ کا مقالہ اس کی کتابی شکل' میرے ذخیرہ غالبیات میں موجود نہیں۔

اس مختصر جائزے میں صرف ان مقالات کا احاطہ کیا جا چکا ہے' جو میرے ذاتی ذخیرہ غالبیات میں موجود اور محفوظ ہیں۔ غالب پر کچھ کام بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان اور شعبہ اردو اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں بھی ہوا ہے لیکن وہ مقالے میرے ذخیرے میں نہیں اور میرے دیکھے ہوئے بھی نہیں۔ پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی غالب پر ممکن ہے کام ہوا ہو' جس سے میں بے خبر ہوں---- بایں ہمہ پاکستانی جامعات میں غالب پر ہونے والے کام کی جس قدر تفصیل اوپر پیش کی جا سکی ہے' وہ اس امر پر گواہ ہے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی کہ علم و ادب اور اس میں فضل و کمال اور اختصاص کو رو بہ زوال سمجھا جانے لگا ہے' اعلی مدارج کے نوخیز اور ذی استعداد متعلمین کے لیے غالب نے کشش کھوئی نہیں ہے۔

غالب کی ذات' ان کی ادبی عظمت' اہمیت اور مقبولیت آج بھی حریف ہے مرد افگن عشق کا درجہ رکھتی ہے ان کے شرح احوال' ان کی شخصیت اور ان کے کلام اور فن کے مطالعے کا میدان روز بروز بیکراں اور بے کنار ہوتا جا رہا ہے۔

غالب میری کمزوری بھی ہے اور قوت بھی۔ غالب پر میں نے کام کرنے' کرتے رہنے اور کام کرانے کی طرف اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ میں جو کچھ کر یا کرا سکا' اس سے مطمئن نہیں لیکن کچھ ایسا شرمندہ بھی نہیں ہوں---- ناتمامیاں' میری بے بضاعتی کا نتیجہ' اور کامرانیاں اپنے بزرگوں کی توجہات کا انعام ہیں۔ مجھ خرف کی نسبت ایک بڑی سند ہے' میری مراد استاد محترم و معظم ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب سے ہے جن کی تحریک' تائید اور نگرانی میں غالب پر میں تحقیقی کام کر سکا اور اس روایت کو کسی قدر بالیدہ و بارآور بنا سکا۔

غالب پر اپنے کام ہی کی تخصیص نہیں' اپنے دوسرے علمی کاموں پر بھی اگر میری تحسین ہوئی ہے اور انہیں استحقاق سے زیادہ قبولیت اور پذیرائی نصیب ہوئی ہے تو یہ منجانب اللہ ہے---- لیکن ان سب اعزازات اور عزت افزائیوں کو میں استاد مکرم ڈاکٹر غلام مصطفی خاں کی روحانی تصرف اور پروفیسر سید وقار عظیم مرحوم کے فیض تربیت سے خالی نہیں پاتا۔

خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے!

(دسمبر ۱۹۹۷ء)

حوالہ جات

نائیلہ انجم، نقوش میں ذخیرہ غالبیات، الفیصل ناشرین، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ص ۳۰۲
ہما اخلاق، اشاریہ خطوط غالب (مہر)، ۱، مطبوعہ شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج لاہور، ۱۹۹۳ء ص ص ۱۴۴
ساجدہ پروین، اشاریہ خطوط غالب، (مہر) ۲، ایضاً، ۱۹۹۳ء ص ص ۱۴۴
عاصمہ اعجاز، غالب اور تجزیاتی مطالعہ ایضاً، ۱۹۹۴ء، ص ص ۴۲۲
اشاریہ غالب، سید معین الرحمٰن، ادارہ یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ ص ص ۳۱۹

غزل

نقش، فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکر تصویر کا

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی، دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالب! اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

گمان غالب

دل نواز دل

میرا یہ مضمون ایک کیپسول (Capsule) جملِ وار لفافہ یا ووڈا کی شکل میں ہے اور میں اسے اس اندیشہ ہائے دور و دراز سے قلم بند کر رہا ہوں کہ یہ کہیں ان نازک مزاج بیمار یاروں کی طبیعت پر گراں نہ گزرے جو مرض کی حالت میں صرف حلول (MixTure) یعنی (Liquid Medical Preparation) پینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مگر چونکہ میری نیت صاف ہے اور مجھے ان بیماریوں کی صحت اور صرف صحت سے غرض ہے اس لیے میں نسخے کے طور پر اس مضمون کو قلم برداشتہ لکھنے میں اپنے ضمیر پر کوئی بار یا بوجھ نہیں محسوس کر رہا۔

میری حد نظر میں جو سہ ستون اردو شاعری کو اب تک سہارے ہوئے ہیں وہ بالترتیب ہیں۔ میر تقی میرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ اور علامہ محمد اقبالؔ۔ اس طرح میرے شعور میں اردو شاعری کی عمارت ایک مثلث کی صورت میں ہے۔ جس میں میرا جذبہ سوال کی علامت بنا جواب کی سکوت اختیار کئے ہوئے ہے!

میر تقی میرؔ وہم کا شاعر ہے۔ یعنی زندگی کی محرومیوں اور مایوسیوں کے وہم میں مبتلا ایک ایسا شخص گو نوجوانی میں اپنی عزیزہ کی ایک ہی جھلک سے چاند کو دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔

یہ وہم غلط کاریاں تک کھنچا
کہ کار جنوں آسماں تک کھنچا

اسی جنون کی حالت کی وجہ سے اپنے سوتیلے ماموں یا خالو خان آرزو کے گھر سے نہایت بے عزتی سے نکالا گیا اور در بدر ہوا۔

نظر رات کو چاند پر گر پڑے
تو گویا کہ بجلی سی دل پر پڑے

یہ ایک الگ قصہ اور بات ہے کہ میرؔ کی یہی در بدری جو آخری عمر تک اس کا پیچھا کرتی رہی، اس کی شاعری کو آگے آنے والے زمانوں کے لیے مشعل راہ بناتے ہوئے اردو شاعری کو سند کا درجہ دے گئی۔

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

میر تقی میرؔ کی شاعری کی دوسری خصوصیت اس کی زندگی کی طلب ہے۔ یہ طلب بدن کی طلب ہے روح کی مانگ نہیں۔ اس لیے وہ زندگی کے صحراؤں میں کسی ایک نخلستان کے لیے زندگی بھر بھٹکتا رہا۔ شاہجہان آباد سے اکبر آباد، اکبر آباد سے دلی اور دلی سے لکھنؤ گیا، مگر بدن کی طلب اور اپنی نا قدری کا رونا روتا ہوا آخر کار آتش اور ناسخ کے شہر لکھنؤ میں محرومی کی موت مرگیا۔ مگر مرتے مرتے اردو شاعری کو نئی زندگی دے گیا۔ میرؔ کی شاعری کسی نظریے کی نہیں صرف اور صرف نظر کی شاعری ہے۔

ہو گیا کسی دیوار کے سایے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

اور پھر میر کی طلب کا یہ رنگ دیکھیے۔

بھائی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن
لکنت سے الجھ جا کر ا سے بات نہ آئی

چونکہ یہ مضمون غالب پر ہے اس لیے ترتیب میں ذرا سا رد و بدل کرتے ہوئے پہلے علامہ اقبالؔ کا ذکر کروں پھر غالب کی فکر کروں گا۔ کہ اقبالؔ ذکر و فکر' قلب و نظر اور آفاقی نظریے کا شاعر ہے جبکہ غالب میری ادنیٰ اور ناچیز رائے میں صرف فکر و نظر کا شاعر ہے۔

اقبالؔ کی شاعری سراسر یقین کی شاعری ہے اور اس یقین کو حاصل کرنے کے لیے انہیں علم و عمل کے حصول کی خاطر بڑی تنگ و تاریک گلیوں' گاؤں اور شہروں اور جذب و سرور کے وسیع و عریض خار زاروں اور گلستانوں میں سے گزرنا پڑا۔ اقبالؔ بھی کچھ دن حسن کی وادیوں میں سرگرداں رہنے کے بعد عشق کے بحرِ بے کراں میں غوطہ زن ہو گئے اور یہاں سے ایسے ایسے نادر اور آب دار موتی نکال لائے جن کی آب رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گی۔ علامہ اقبالؔ کی شاعری کسی بھٹکے ہوئے یا بھٹکانے والے شاعر کی شاعری نہیں ہے تو ایک دانائے راز شاعر اور راہنما کی شاعری ہے جسے رستے کا پتہ ہے اور منزل جس کی دیکھی ہوئی ہے۔ وہ ایسے ہی تو نہیں کہتے۔

لوح بھی تو' قلم بھی تو' تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ' تیرے محیط میں حباب

علامہ اقبالؔ کے شعری الہام کا نکتہ عروج ان کی زندہ تمنا اور اس کا ابدی مرکز ہے۔ جس کے گرد کل کائنات محور کے طور پر گھوم رہی ہے اور اس محور اس کائنات کو مسخر کرنا وہ انسان کے لیے ایک امتحان یا چیلنج سمجھتے ہیں۔ کہ حیات و ممات کے مرکز یعنی خدا اور محور یعنی کائنات کے درمیان فقط ایک انسان ہی ہے جو دونوں کے بیچ ربط بھی ہے اور رابطہ بھی' جو حلقہ بھی ہے اور زنجیر بھی' جو سلک بھی ہے اور کلک بھی۔

علامہ اقبالؔ کی شاعری تمام زمانوں کے لیے ہے کہ یہ ایک ایسے نظریے کی ترجمانی کرتی ہے جس کا ہر آنے والا زمانہ ترجمان ہو گا۔ یہ روح مجسم کی سخن گوئی ہے جس سے کل کائنات گونج رہی ہے۔ یہ تاحیات رہنے والی شاعری ہے۔ اقبالؔ کے لب پر جب یہ دعا آتی ہے تو دل تڑپ اٹھتے ہیں اور آنکھیں آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

زمانے کے لحاظ سے غالب کا نام میر اور اقبالؔ کے درمیان پڑتا ہے۔ اسے اب اتفاقات زمانہ میں سے ایک اتفاق کہہ لیں یا حادثات دنیا میں سے ایک حادثہ جان لیجئے مگر میں قدرت کی دی ہوئی اس ترتیب کو تسبیح ترتیب کہوں گا۔ اردو شاعری کی تین دانوں کی تسبیح یعنی تسبیح سہ دانہ یا سبحہ سہ دانہ۔

غالب گمان کا شاعر ہے اندیشوں کا غزل گو ہے اسی لیے تو کہتا ہے۔

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

دیکھئے فیض نے کس طرح غالب سے کسب فیض کیا ہے اور اپنی شاعری کے کاروبار کو چمکایا ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ!!

غالب کے سلسلے میں یہاں سمجھنے اور جاننے کی بات یہ ہے کہ اندیشہ ہائے دور دراز کے باوجود اس کی نظر خم کاکل سے ہٹی نہیں؟ اقبالؔ کا اسے "جاوید نامہ" میں زندیق کہنا اور تیسرے آسمان پر اس سے اسی کے اس شعر کے معنی پوچھنا' بڑا معنی خیز ہے۔

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ
اے نالہ' نشان جگر سوختہ کیا ہے!

اور پھر یہ شعر:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

غالب کے اندیشے اور گمان کی کھلی دلیل ہے جس نے غالب کو فکر و نظر کے آگے کی شاعری کی صورت نہ دکھائی۔ وہ شعری دنیا اس کی نظروں سے اوجھل ہی رہی۔ اس کا دل زمینی فکروں اور جذبوں سے ضرور دھڑکتا رہا۔ مگر آفاقی جذبے اور فکر تک اس کی رسائی عقل نے نہ ہونے دی۔ کہ عقل اور فکر' علم اور آگاہی نور راہ تو ہیں' نور منزل نہیں۔ اس کے لیے جس یقین کی ضرورت تھی وہ غالب میں مفقود تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غالب میں یقین کی کمی تھی۔ خدا نے غالب کو یقین کی جس دولت سے نوازا تھا وہ کسی طرح سے کم نہ تھی۔ میرے مضمون کا عنوان میرے اس مفروضے کا کھلا ثبوت ہے۔ بلکہ جو یقین غالب کو اپنی ذات پر تھا وہ انسان ہونے کی معراج ہے اور اس معراج نے غالب کے بعد آنے والے بہت سے شاعروں کو عروج بخشا۔ بلکہ ایک زمانہ اب تک غالب کے اس شعری' شخصی اور فکری یقین سے بالیقین فیض یاب ہو رہا ہے۔ مگر غالب کا یہ یقین' ایمان نہیں تفاخر ہے۔ غالب کا یقین اپنی ذات پر ہے جس کے ہونے سے وہ خدا کی ذات کے نہ ہونے کی حجتوں کو فکری اور شعری سہارے دیتا رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنی سہولت کی خاطر خدا کی ذات کو مان لیتا ہے اور کبھی اس کی ذات سے اپنی شاعرانہ بلاغت' فصاحت اور سلاست سے نفی کر دیتا ہے اور پھر جب غالب جیسا قادر الکلام' نابغہ روزگار بے مثال اور بے بدل شاعر ایسی شعری اور شعوری موشگافیوں شعروں میں ڈھالے تو کون ایسا مومن ہو گا جو کافر نہ ہو جائے' کون ایسا کافر ہو گا جو مومن نہ بن جائے گا!! غالب کا اپنے پہ یقین یا انسان کی عقل پر یقین اسے حالت جنگ میں رکھے رہا۔ جبکہ خدا کی ذات پر مکمل یقین بھی درحقیقت اپنی ہی ذات پر یقین ہے (ذرا سمجھنے کی بات ہے) جو غالب جیسا مفکر شاعر نہ سمجھ سکا! اور اگر سمجھتا تھا تو پھر جان بوجھ کر اس نے ایسا کیوں کیا! یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ کیونکہ مکمل یقین یا یقین کامل تو ایمان ہے اور ایمان ہی سے انسان حالت امن میں رہتا ہے یعنی اسے امن نصیب ہوتا ہے۔ کیا غالب کو مرتے دم تک امن نصیب ہوا یا وہ اپنے ضمیر اور فکر کے ساتھ حالت جنگ میں مرا!

غالب ابھی تک زندہ ہے۔ یعنی دو سال گزر جانے کے بعد بھی زندہ ہے۔ تو کیا وہ شہید ہے! اگر نہیں تو وہ کب تک اور زندہ رہے گا۔!! میری دانست میں اقبالؔ کو چھوڑ کر، تمام اردو شاعری پر ماسوا میر کے سوائے غالب کے اور کوئی شاعر حاوی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے کبھی آنے والے وقتوں میں ایسا ہونے کی امید ہے۔ میری آزادانہ رائے میں غالب مرے گا ضرور مگر بڑی مشکل اور بڑی دیر سے اور یہ کہ اس کی شعری زندگی کو کب موت آئے گی! اس سوال کا جواب اقبالؔ کی زبانی سنئے وہ غالب کی طبعی موت پر کہتے ہیں:

زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

یہاں ایک ایسی فروعی بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے غالب کی فکر نے بلاواسطہ یا بالواسطہ اثر قبول کیا کہ اس سے غالب کو سمجھنا قدرے سہل ہو جاتا ہے۔ غالب کا ایک بھائی طبعی مخبوط الحواس تھا جو بچپن ہی میں آگرہ میں وفات پا گیا اور میر کا ایک بھائی بھی جنون کی حالت میں جوانی میں مرگ نصیب ہوا۔ میر پر بھی دیوانگی کے دورے پڑتے رہے۔ خدا جانے غالب کیسے اس کیفیت سے محفوظ رہا! سقراط کے فلسفے اور فکر کے لحاظ سے عشق یعنی مجازی عشق جنون کی ایک قسم ہے اور غالب کا یہ شعر اسی فلسفے اور فکر کی بازگشت ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

سقراط بھی خدا پر یقین رکھتا تھا مگر یہ یقین اس کے فلسفے اور فکر کا مرہون منت تھا کہ اس میں اسے سہولت تھی جو غالب کو بھی تھی۔ دیکھئے بات سقراط سے ہوتی ہوئی میر اور پھر غالب تک کیسے پہنچی ہے! یہاں عشق سے مراد مجازی عشق ہے نہ کہ حقیقی عشق.... اقبالؔ کا مسئلہ اور مسلک اور تھا وہ تو عشق مجازی میں ایک پل ایک ٹھوکر کھا کر سنبھلے اور پھر ساری عمر عشق حقیقی میں سرشار رہے اور یہ تب ہی ممکن ہوتا ہے جب کوئی اس کے کرم سے عقل، فکر اور نظر کی حد یا فصیل سے آگے نکل جائے اور غالب کے لیے ایسا کرنا وہ مشکل تھی جسے وہ اپنی تمام تر فکر کے باوجود آسان نہ بنا سکا۔ یہ بات سقراط کی سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ اس نے سچ (Truth) کو خدا کہہ کر زہر کا پیالہ خوشی خوشی ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

غالب کی شاعری میں ایک لفظ یا حرف "ہوس" ایسا ہے جو گنجینہ معنی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ ہی کیا اس کے باقی کے الفاظ بھی معانی کے خزائن ہیں۔ مگر یہ حرف چونکہ غالب کی زندگی کی کارکردگی کو اس کی تمام تر ہوس ناکیوں کے ساتھ واضح کرتا ہے اس لیے غالب کو سمجھنے کے لیے اس لفظ پر کچھ زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ "ہوس" عربی کا لفظ ہے اور یہ بے شمار معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان کی طرح نہیں کہ صرف اور صرف لالچ، حرص اور ہوا کے معنی تک محدود ہو کر رہ جائے۔ یہ لفظ اپنے اندر بڑے اور گہرے معنی رکھتا ہے۔ مثلاً" ایک قسم کا جنون، خبط، آرزو، ارمان، خواہش، اشتیاق، شہوت، ہوکا، خواہش نفسانی، جھوٹا عشق، حوصلہ، امنگ، چسکا اور ہر چیز کو جی چاہنا وغیرہ وغیرہ۔ اب ذرا غالب کی زندگی کے روزنامچوں پر غور کیجئے جو مختلف تحریروں" اس کے دیوان (اردو) اور (فارسی) اور خطوط کے ذریعے ہم تک ہاتھوں ہاتھ پہنچے ہیں۔ آپ کو خبر ہوگی کہ غالب نے زندگی کو ہوس کے ہر معنی میں برتنے، کھیلنے، بھگتنے، پرکھنے، جاننے، کھانے، پینے اور چکھنے وغیرہ کے لیے استعمال کیا اور خوب استعمال

کیا۔ اور اس کا رنگ خاص کر اس کی اردو شاعری پر یوں چڑھا کہ اس کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ کمال فن کا یہی فرق ایک ذی شعور شاعر کو ایک بے شعور شاعر سے جدا کرتا ہے۔ ایک کی ہوس حرفوں کے لالچ حرص اور طمع تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور ایک کی ہوس زندگی کی تمام تر تابناکیوں کی حدیں عبور کر جاتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے۔

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

شاید اتنا کہہ دینا کافی ہو کہ وہم جب گمان غالب ہو جاتا ہے تو وہ قریب قریب یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح کوئی طلب وشت بلا سے ہوتی ہوئی ہوس کے سنگلاخ ساحل تک پہنچ جائے تو اسے تمنا کا قلزم ضرور دکھائی دے جاتا ہے لیکن یہ دنیا ئے دنی ہے' یہاں کسی کے نصیب میں صرف وہم کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی قسمت میں ہوس ناکی لکھی ہوتی ہے اور کسی کی تقدیر کے لب پر زندہ تمنا کا نغمہ رقصاں ہوتا ہے۔

میر تقی میر اپنی علمی' فنی اور فکری بصیرت اور بصارت کے بل بوتے پر' میرے استدلال کے مطابق' وشت امکاں میں اپنی تمنا کے حصول کی خاطر فقط آدھا قدم چل پایا۔ جبکہ غالب نے اپنی فکر اور افکار کے زور پر دشت امکاں کو فقط ایک نقش پا' پایا۔ یہ غالب ہی کا کمال تھا کہ اس نے دشت امکاں کی حقیقت اور حیثیت جان لی۔ کوئی اور اس سے پہلے یہ اصلیت نہ جان سکا! سمجھنے کی بات یہ ہے کہ تمنا کے دوسرے قدم کا سراغ پانے' جاننے اور دیکھنے کے لیے غالب کو "یارب" کہنا پڑا!! خدا سے مدد مانگنی پڑی۔ گڑگڑانا پڑا۔ اپنی تمام تر فکر و عقل کے باوجود! یعنی ایک قدم کے نقش کو پا لینے کے بعد اس کی فکر و نظر اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ میر نے کہا۔

صد تمنا اے یار رکھتے ہیں
تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں

اور

تمنا دل کے لیے جان دی
سلیقہ ہمارا تو مشہور ہے

مگر غالب چونکہ میر سے آدھا قدم آگے تھا اس لیے وہ حقیقت سے زیادہ قریب تھا اسے اپنی فکر کی کم مائیگی کا یقین ہو گیا تھا اس لیے وہ اپنی ساری فکری انا اور پوری شعوری خودی کے باوجود پکار اٹھا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا' پایا

یہاں گڑگڑانے کے باوجود' غالب کا لفظ "ہم" استعمال کرنا قابل غور ہی نہیں قابل رحم بھی ہے!!

مندرجہ بالا تحریر میں لائے گئے میر اور غالب کے اشعار میں نکتہ کی باریکی یہ ہے کہ میر اور غالب دونوں کی تمنا مردہ تمنا ہے۔ دنیاوی ہے۔ ہوس انسانی ہے۔ دشت امکاں تک محدود' جو ظاہری آنکھ سے نظر تو زندہ آتی ہے مگر دیدۂ دل سے دیکھا جائے تو مردہ ہے۔ میر تقی میر نے اپنے دیوان میں جہاں کہیں بھی تمنا کا ذکر کیا ہے وہ میرے لحاظ سے مردہ ہے اور دشت امکاں کے نصف سے آگے نہیں بڑھ پائی۔ یہ غالب ہی تھا جس نے اللہ سے تمنا کے دوسرے قدم کے بارے میں استفسار کیا یوں غالب میر سے آدھا قدم آگے ہے۔ اس نے ایک پورا قدم اٹھایا ہے اس لیے میں اسی کے حوالے سے بات آگے بڑھاؤں گا۔ تو بات ہو رہی تھی کہ پہلا

قدم یا اس کا نقش فکر کی آخری منزل ہے جبکہ دوسرے قدم کو پانے کے لیے جذبہ صادق اور عشق حقیقی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلا قدم فکر کا حاصل ہے جبکہ دوسرا قدم ذکر کا حصول ہے کہ دشت امکاں کے بعد دشت لامکاں کی فرماں روائی ہے۔ اگر ایک قدم دشت امکاں ہے تو دوسرا قدم دشت لامکاں ہے۔ دشت امکاں کی بات ممکنات کی حد سے آگے نہیں نکل سکتی جبکہ دشت لامکاں میں قدم رکھنا' یعنی دوسرا قدم' ناممکن کو ممکن بنانا ہوتا ہے! پہلا قدم مردہ تمنا کے تکمیل کی آرزو اور جستجو ہے جو فکر و نظر کی طاقت اور ہمت پر آدھی یا پوری حاصل ہو سکتی ہے مگر زندہ تمنا چونکہ دوسرے قدم پر ہے اس لیے اسے طے کرنے کے لیے فکر و نظر کے ساتھ ساتھ جذب ذکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اقبالؒ نے پوری کی اور یوں دوسرے قدم کو پالیا۔ دشت امکاں اور دشت لامکاں حقیقت میں دو قدم ہی تو ہیں۔ جہاں فکر کی حد ختم ہوتی ہے وہاں ایک قدم طے ہوتا ہے۔ اس سے آگے دوسرا قدم دشت لامکاں کی پیمائی میں رکھنا پڑتا ہے۔ کائنات یعنی مکاں اور لامکاں' یا امکاں اور لاامکاں کو طے یا عبور کرنے کے لیے شروع ہی سے زندہ تمنا نظروں میں ہونی چاہیے جس کے لیے قلب کی گرمی اور روح کی تڑپ پہلی اور آخری شرط ہے اور جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں تاکہ آپ اس پر فکر کر سکیں۔ فکر ایک قدم طے کرتی ہے تو ذکر دوسرا اس لیے فکر اور ذکر ناگزیر ہیں' لازم و ملزم ہیں اور اس نکتے کو صرف اور صرف دانائے راز ہی پا سکا۔ کہ مفکر' اور وہ بھی میر اور غالب جیسے' دشت امکاں میں آدھا یا ایک قدم تو طے کر سکتے ہیں۔ مگر دوسرا قدم طے کرنے کے لیے یعنی کل کائنات کی تسخیر کے لیے علامہ اقبالؒ کی طرح فنا فی اللہ اور عاشق رسول ہونا پہلی اور آخری شرط ہے؟۔

اب دو حرف ان یاران نکتہ داں کے لیے جو شعراء کی درجہ بندیوں کے سلسلے میں کھل کھیلتے ہیں اور جو اپنی مخصوص طرفداریوں سے کسی شاعر کو بڑا بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ میرے درک کے مطابق میر تقی میر لغوی معنوں میں ایک بڑا شاعر ہے۔ غالب بہت بڑا شاعر ہے اور علامہ اقبالؒ بہت ہی بڑے شاعر ہیں۔ یہ میرا گمان نہیں یقین ہے۔ اپنی بات کو ذرا اور واضح الفاظ میں بیان کروں تو میر خوب' غالب خوب تر اور اقبالؒ خوب ترین شاعر ہیں۔ جب معیار کا یہ پیمانہ ہو تو آج کل کے خود ساختہ اور دوسروں کے پروردہ اور پرداختہ بڑے شاعروں کی حیثیت اور قدو قامت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں کہ وہم و گماں کے اندازوں کی کوئی حد نہیں' کوئی پیمانہ نہیں' کوئی ناپ' کوئی تول اور کوئی یقین نہیں!!۔

الختصر کہ یہ غالب ہی کا گمان تھا جس نے منہ زور رخش عمر کو فکر و نظر کی باگ ڈال کر کارزار ہستی یعنی دشت امکاں میں مغلوب کیا اور یوں گمان کی آخری حد تک جا پہنچا۔ جہاں سے یقین کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ یہاں سے آگے جانے کے لیے اسے اپنے رب کو پکارنا پڑا۔ غالب کو خبر تھی کہ گمان پر غالب آ جانے کے بعد یقین کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے اس کی فکر رسا اور دیدۂ بینا کام نہیں آ سکتے اور اس بات کا شعور بھی غالب جیسے اللہ کے شیر ہی کو ہو سکتا تھا۔ مگر غالب کا جھوٹا عشق یا بچی فکر اس کے آڑے آئی۔ گمان غالب کی حد کے بالکل ساتھ جڑی یقین محکم کی سرحد میں تمنا کا دوسرا قدم رکھنے یا اس قدم کا نقش دیکھنے کے لیے ذکر خدا' ذکر رسول اور فکر قرآن کی جو ضربات دل پر لگنی چاہیے تھیں وہ غالب کے دل ناداں پر نہ لگ سکیں یوں غالب کا دل نالاں رہا! اسے غالب کی بدقسمتی اور اردو زبان (خاکم) کی بد نصیبی سمجھیے کہ ان ضربات سے اس کا دل مضطر محروم رہا۔ اور یہی محرومیت' تجسس اور استفسار غالب کی شاعری میں جا بجا بکھرا پڑا ہے۔ غالب کے فکر کی شیرازہ بندی ہمیں اس کی ورق ورق تحریروں کی ہر سطر میں ملتی ہے۔ وہ محرم نظر تو ہے مگر محرم دل نہیں۔ اسی لیے تو اسے تقدیر میں لکھی اپنی اس محرومی اور ناکامی کا اعتراف اور اظہار

یوں کرنا پڑا۔

یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

آخر میں میں اپنے مضمون کا لب لباب (Summing) اپنی دو ہائیکوز کے ذریعے سے کرنا چاہوں گا تاکہ نفس مضمون تک رسائی میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ ان ہائیکوز کو میرے مضمون کا حاصل سمجھئے کہ میں نے اسی حصول کے لیے یہ مضمون قلم بند کیا ہے۔ اصل بات چونکہ اصول کی ہے اس لیے دل نے اسے قبول اور وصول کرنے میں گہری فکر، شدید جذبے اور دور رس نظر سے کام لیا ہے آگے:

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

نظر شناس ہائیکوز اگر دل نواز بھی ہوں تو مضمون کو یوں کس کے باندھتے ہیں۔

ہائیکوز

میر کو ہے وہم بس
اور غالب کو گماں
کر یقیں اقبالؒ کا

میر کو مارا طلب نے
اور غالب کو ہوس نے
جان اقبالؒ اگی تمنا

بات چونکہ غالب کے گمان سے شروع ہوئی تھی اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے ختم بھی غالب ہی کے گمان پر کیا جائے کہ اس طرح قارئین کو میری بات کا یقین آ جائے گا! ویسے یقین آنے یا کرنے کی بات نہیں ہوتی بلکہ یقین لانے یا ہونے کی بات ہوتی ہے! دیکھئے غالب کس یقین سے گمان کی بات کرتا ہے:

جاواد بادہ نوشی رنداں ہے شش جہت
غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

"پچھلے پہر شہر سے باہر سٹیڈیم میں گئے جہاں آدھا مانچسٹر امڈ آیا تھا۔ ہمارے لیے ممتاز مہمانوں کی صف میں جگہ مخصوص تھی یعنی شہ نشیں کے بالکل قریب۔ ہماری وجہ سے باربرا کو بھی اسی صف میں بلکہ ہمارے پہلو میں جگہ ملی۔ پورے سوا پانچ بجے پرنس فلپس کی کار شہ نشیں کے سامنے آکر رکی۔ شہزادے کا کار سے نکل کر حاضرین کی طرف دیکھنا تھا کہ جملہ خواتین کے منہ سے ٹھنڈی، گہری اور لمبی آہوں کا کورس نکلا۔ اس کورس میں باربرا کی آہ الگ اور واضح تھی کہ ہمارے پہلو سے اٹھی تھی۔ معلوم ہوا کہ باربرا ڈیوک کو محض رعایا کی آنکھ سے دیکھنے نہیں آئی بلکہ اس کی وجہ کچھ زیادہ بنیادی اور غیر سیاسی قسم کی ہے لیکن فقط باربرا شاہی کشش کی اسیر نہ تھی۔ جملہ میریاں اور مارگریٹیں اس دھاگے سے کچی چلی آئی تھیں۔ چنانچہ پرنس فلپس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مرد کی دال گلنا---- یعنی اگر وہ دال گلانے کے ارادے سے آیا تھا---- محال تھی۔ بہرحال کیے بعد دیگرے فوجی ٹیمیں کرتب دکھانے لگیں لیکن سچی بات ہے ہمارے لیے ان کرتبوں کی نسبت ان میموں کی بے تابیاں زیادہ باعث کشش تھیں۔ چنانچہ ہم میمیں دیکھتے رہے، میمیں ڈیوک دیکھتی رہیں اور ڈیوک تماشا دیکھتے رہے۔ یعنی اس مثلث میں فقط ہمیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا اوروں کی بے توجہی تو خیر، لیکن باربرا سے ہمیں ملائم سا شکوہ ضرور تھا۔ یہ نہیں کہ ہمیں باربرا سے شہزادے کے مکمل مقاطعہ پر اصرار تھا، جی نہیں---- ہم تو باربرا سے صرف اتنا چاہتے تھے جتنا غالب نے کبھی اپنی باربرا سے چاہا تھا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

(سلامت روی از محمد خاں، مرسلہ مبشر حمید، پنجاب ہائر سیکنڈری اسکول آف سائنس)

(مولوی احتشام الدین حقی دہلوی (مرحوم) بیان کرتے ہیں:

"غدر میں دلی کے لوگ ایک عرصہ تک بچھڑے رہے بعض کو تو واپسی نصیب نہ ہوئی۔ میرے والد ان خوش قسمتوں میں سے تھے جو دلی واپس آئے اور مرزا غالب سے ملنے بھی گئے۔ مرزا کی یادداشت بڑی زبردست تھی۔ دیکھتے ہی پہچان گئے، لگے حال پوچھنے، باتیں کرنے۔ حاضرین میں اس وقت نواب ضیاء الدولہ (دہلی کے ایک رئیس) بھی موجود تھے۔ ان سے بھی علیک سلیک ہوئی، مگر انہوں نے پہچانا نہیں۔ مرزا غالب کو بظاہر ایک اجنبی سے آشنایانہ باتیں کرتے دیکھ کر بولے۔ حضرت ہمیں بھی تو بتائیے۔ یہ صاحب جن سے آپ یہ باتیں کر رہے ہیں کون ہیں؟ مرزا غالب نے کہا، ہیں تم نہیں جانتے۔ یہ فلاں ابن فلاں۔ مرزا کے اتا پتا دینے سے نواب صاحب بھی پہچان گئے۔ بولے میاں معاف کرنا میں نے تمہیں پہچانا نہیں بہت عرصے بعد دیکھا۔ دوسرے یہ قیامت صغرا

(غدر ۱۸۵۷ء) بیچ میں گزر گئی کہ صورتیں بدل گئیں۔ تمہارے اس وقت ریش و بروت نہیں تھی اس لیے بھی نہیں پہچان سکا' کہو کیسے ہو کہاں ہو؟ شادی ہو گئی؟

والد مرحوم نے ان سوالات کے جوابات دیے اور کہا شادی تو اس قیامت صغرا سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ نواب صاحب نے کہا پھر اس کا نتیجہ؟ کہا' ہاں ایک لڑکا ہے۔ پوچھا کیا نام ہے۔ جواب دیا "مصباح الدین" یہ نام سن کر نواب صاحب نے چونک کر کہا بھئی یہ کیا؟ تمہارا نام انوار الحق' تمہارے والد کا نام احسان الحق تمہارے جد اعلیٰ کا نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی غرض سب کے نام حق پر ہیں لڑکے کا نام دین پر کیوں؟

اس اعتراض کو مرزا غالب نے بھی سن لیا۔ دفعتہ "گبڑ کر بولے' میاں تم کیسے مسلمان ہو؟ نواب صاحب نے کہا۔ حضرت میں نے خلاف اسلام کیا کیا ہے؟ فرمایا: دین کو حق نہیں سمجھتے۔ نواب صاحب لاجواب سے رہ گئے اور جملہ حاضرین ہنس پڑے۔ اس چھوٹے سے فقرے نے کہ دین کو حق نہیں سمجھتے ایک شعر کا مزہ دیا۔ (ماہ نو غالب ۱۹۶۹ء۔ مرسلہ: عمران شفقت' پنجاب ہائر سیکنڈری اسکول آف سائنس صادق آباد)

مرزا غالب اور طوطا

موسم سرما تھا۔ خوب سردی پڑ رہی تھی۔ پنجرا سامنے دھرا تھا اور غالب دیکھ رہے تھے کہ طوطا پنجرے میں مارے سردی کے پروں میں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔ یہ دیکھ کر مرزا غالب بولے:

"میاں مٹھو! تعجب ہے تمہارے نہ تو بچے ہیں اور نہ بیوی پھر تم کس فکر میں سر چھپائے بیٹھے ہو۔"

(مرسلہ: فہد افتخار' پنجاب ہائر سیکنڈری اسکول آف سائنس)

"دوسری صبح ہمیں بیروت سے رخصت ہونا تھا۔ جاگے تو مادام ناشتہ کی قاب میں چائے اور حسن سلوک بھرا کر لائیں۔ اتنے میں ہماری کسینو کی ہم نشیں بھی الوداع کہنے آئی۔ ہمیں سوٹ کیس میں کپڑے بند کرتے دیکھ کر ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے متعلق سوال کرنے لگی۔ جب ہمارے منصوبوں کی تفصیل سنی تو رشک سے چور ہو کر ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں سیر جہاں کا شوق رو رو کر کہہ رہا تھا کہ

غالب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

لیکن اس کے لیے زر مبادلہ کا انتظام بھی ہو سکتا تو جرات کا انتظام کیسے ہوتا؟

سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

اتنے میں عبدالرحمن کار لے کر آ گیا اور ہمیں ہوائی اڈے کو لے اڑا۔"

(سلامت روی از محمد خاں۔ مرسلہ عدیل مشتاق پنجاب ہائر سیکنڈر اسکول آف سائنس)

"جوڈی۔ تم اس شکل و صورت کے ساتھ گائیڈ ہونے پر کیوں قانع ہو؟"

جوڈی ہنسی اور بولی: "آپ پہلے آدمی نہیں جس نے یہ سوال پوچھا ہو۔"

"تو تم نے پہلے آدمی کو کیا جواب دیا تھا؟"

"بس یہی کہ مجھے گائیڈ ہونا پسند ہے۔ میں دیس دیس کے لوگوں سے ملتی ہوں (ذرا مسکرا کر) "آپ جیسے لوگوں سے۔ لوگوں سے ملنا تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

جوڈی نے جھلا کر کہا (But people are fun) (لوگوں سے رونق ہے۔)

جوڈی کی جھلاہٹ کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ "میں اتنی بڑی نعمت کا ذکر کر رہی ہوں' تم سمجھتے کیوں نہیں؟" اور سمجھنے کی کوشش کی تو اچانک ہم پر ایک بڑی سچائی کا انکشاف ہوا کہ سچ مچ' زندگی کی رونق تو لوگوں سے ملنے ہی میں ہے۔ خود ہماری اس لمحے کی رونق جوڈی سے ملنے میں تھی۔ بلکہ ہمارے سارے سفر کا حاصل رنگا رنگ لوگوں کی ملاقات ہی تھی اور یہ کتاب کیا ہے؟ یہ انہی ملاقاتوں کی روداد تو ہے۔ جوڈی کا انگریزی جملہ ہمارے ذہن میں گونجنے لگا:

(People are fun) ویسے جوڈی نے کوئی نئی بات تو نہیں کہی تھی۔ غالب یہی سبق ایک مدت ہوئی دے چکے تھے بلکہ غالب کو تو لوگوں سے ملنے پر کسی قدر ناز بھی تھا اور کم آمیز پیغمبروں کو بھی نہیں بخشتے تھے:

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے!!

لیکن مرزا اپنی بلاغت کے باوجود یہ سبق ہمیں اتنا اچھی طرح ذہن نشین کرا سکے تھے جتنا جوڈی نے چند لمحوں میں کرا دیا۔ آخر بحیثیت استاد جن آلات سمعی و بصری سے جوڈی لیس تھی' میرزا ان سے یکسر محروم تھے۔ میرزا کی تمام تر بلاغت ان کی زبان میں تھی جو بتیس دانتوں میں بند تھی اور جوڈی کی بلاغت اس کے گریبان میں تھی جو نصف سے زیادہ چاک تھا۔

(سلامت روی از محمد خاں۔ مرسلہ عاصم مسعود' پنجاب ہائر سیکنڈری اسکول آف سائنس)

مرزا غالب کی کتاب قاطع برہان جب شائع ہوئی تو بہت شخصوں نے اس کے جواب لکھے ہیں اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا فرمایا۔ بھائی اگر کوئی گدھا تمہارے لات مارے تو تم اس کا کیا جواب دو گے؟

(مرسلہ طاہر علی پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

غالب ـــ نئے شعور اور نئے عہد کا ہم سفر

ارشد ملتانی

صاحبو! آج میں آپ کو غالب سے ملواتا ہوں۔ اس کا مطلب خدانخواستہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ غالب کو نہیں جانتے۔ اردو شعرو ادب کی دنیا کا کون ایسا شخص ہے جو مرزا غالب کی عظمت کا قائل نہ ہو' میرا تعارف ذرا مختلف انداز کا ہے۔

میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ مرزا غالب کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی ولادت ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو سورج نکلنے سے چار گھڑی پہلے ہوئی تھی اور ان کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو بوقت ظہر ہوا۔ ان کا بچپن کیسے گزرا اور جوانی دیوانی میں انہوں نے کیا گل کھلائے کس تاریخ کو ان پر مقدمہ ہوا اور کون سے دن وہ رہا ہوئے۔ انہوں نے فلاں غزل کا فلاں شعر کس وقت اور عالم میں کہا۔ اس وقت شعر کی تخلیق میں انہوں نے کس صدی کے کس شاعر کے خیال سے استفادہ کیا۔ میں آپ کو یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ شیعہ تھے یا سنی' صوفی تھے یا کچھ اور ان کی زندگی کب عیش و آرام کے جھولوں میں گزری اور کب وہ غم و آلام کے کانٹوں پر تڑپے۔

مجھے ان تمام سوانح نگاروں کا علم نہیں ہے جو اس زعم میں اکڑتے پھرتے ہیں کہ غالب کو نواب' دبیرالملک' نجم الدولہ اور نظام جنگ کے القابات ملے تھے۔ ان رکھ رکھاؤ کا یہ عالم تھا کہ بغیر پالکی اور ہوادار کے بازار کبھی نہیں جاتے تھے۔ میں اس واقع کا اظہار کرتے ہوئے بھی ندامت محسوس کر رہا ہوں کہ انہوں نے آٹھ آنے مہینہ پر ایک ڈومنی کو آم کے چھلکے اٹھانے پر مقرر کیا اور پھر اس کے جوبن پر ریجھ پڑے۔ یہ تمام باتیں میں اس لیے نہیں بتا سکتا کہ خوش قسمتی سے میں محقق نہیں ہوں۔ میرا ذہن ایک سیدھے سچے شاعر کا ذہن ہے۔ میں نے غالب اور اس کے عہد کی تاریخ اور شعر کے حوالے سے پہچانا ہے۔ میرا ذریعہ ابلاغ غالب کا فن ہے فکر ہے میں غالب کے خود ساختہ نقادوں سے اتنا ہی دور بھاگتا ہوں' جتنا کہ غالب خود بھاگتے تھے۔ مجھے ان تمام استادان فن سے بھی چڑ ہے جنہوں نے بقول خود برسوں کی محنت کے پہاڑوں سے ایک ایک مردہ چوہیا برآمد کر رکھی ہے اور اس کو ہاتھی بنا کر پورا سوا لاکھ وصول کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے اردو کے ایک بہت بڑے محسن پر بھی تعجب ہے جنہوں نے کہا ہے کہ غالب نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے۔ میں سوچتا ہوں اگر اقبال کو غالب نے پیدا کیا ہے تو پھر غالب کی تعمیر و تخلیق میں کس کا ہاتھ ہے۔

غالب کے ایک اور مہربان کی رائے بھی مجھے سخت حیران کر رہی ہے کہ غالب کے نظریہ حسن و عشق کی تعمیر میں ان کی وراثت' شخصیت اور ان کی نسل و خاندان کو بڑا دخل ہے میں اس مخمصے میں پڑ گیا ہوں کہ غالب کا نظریہ عشق نسلی و خاندانی وجاہتوں کی بلندیوں کے باوجود بعض اوقات پستیوں کی طرف لڑھکتا ہوا کیوں محسوس ہوتا ہے یا تو غالب کے مہربان کی سوچ ناقص ہے یا پھر اس کی نسلی و خاندانی تشخیص میں کوئی کمی رہ گئی ہے۔ میرے کان غالب کے بارے میں ایک معروف دانش ور کا یہ جملہ سنتے سنتے پک گئے ہیں کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں' وید مقدس اور دیوان غالب۔ میں اس ندرت آفریں خیال کو ایک شخص کی رائے ماننے کو تیار ہوں مگر اس کو بار بار دہرائے جانے والی حقیقت تسلیم نہیں کرتا۔ کیونکہ اس سے میری اجتماعی انا کو ٹھیس لگتی ہے اور مجھے اپنے فہم و ادراک کی صلاحیتوں کی توہین محسوس ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اگر یہ حقیقت ہے تو پھر میں اقبال' جوش اور فیض کے کلام کو

کس کھاتے میں ڈالوں۔

میرا ناقص فہم اس فرمان پر بھی مطمئن نہیں ہے کہ مغل تہذیب نے ہندوستان کو تین عطیے دیئے ہیں تاج محل' اردو زبان اور غالب۔ ہو سکتا ہے یہ خیال آرائی درست ہو لیکن مجھے مغل تہذیب ملی ہے اردو زبان نہ تاج محل۔ پھر کیا میں ماضی کی وراثتوں کا حقدار نہیں ہوں۔ میرے حصے میں وادی سندھ کی جو عظیم الشان تہذیب آئی ہے۔ جو ملتان کا پرانا قلعہ اور رکن عالم کا جو مقبرہ آیا ہے انہوں نے مغل تہذیب سنوارنے اور نکھارنے میں کوئی کردار انجام نہیں دیا خدا جھوٹ نہ بلوائے اس بات کا بہت رونا رویا گیا ہے کہ غالب ایک ایسی تہذیب و ثقافت کے نمائندہ تھے جو اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ ایسی تحریریں پڑھ کر میرے ذہن میں بارہا یہ سوال جاگ اٹھتے ہیں کہ اگر وہ تہذیب ختم ہو گئی ہے تو پھر لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ۔ اب جو ایک نیا عہد تعمیر ہو رہا ہے' نئی تہذیب اور نیا شعور جاگ رہا ہے اس کی فکر اور پرورش کیوں نہ کریں کیوں نہ افکار غالب کو اپنے عہد اور نئے شعور کے تناظر میں دیکھیں اور پرکھیں۔

بات صاف اور سیدھی ہے کہ برسوں پہلے کے ایک زوال پذیر معاشرے کی آغوش میں پلنے والے فرسودہ نظریات بہرحال ترک کرنا پڑیں گے۔ کیونکہ زنگ آلودہ تلواریں ایٹمی دور کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ زندگی کو ہمیشہ تازہ اور گرم خوں ہی تروتازہ رکھتا ہے۔ ادب و فن کے شجر بھی اسی خون سے پھوٹتے ہیں۔ مجھے اگر غالب عزیز ہے تو اس لیے نہیں کہ وبیر الملک' نجم الدولہ اور نظام جنگ تھا۔ میں اس وجہ سے اسے پیار کرتا ہوں کہ اس کی لازوال شاعری اور اس کی فکر مجھے اپنی ترجمان محسوس ہوتی ہے' وہ میرے رنج و راحت میں آج بھی برابر کا شریک ہے۔ اس کی شعری بصیرت میرے عہد اور میرے شعور کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہے۔

م

"غالب اردو شاعری کی تنہا آواز ہیں۔ اس اعتبار سے کوئی ان کا شریک غالب نہیں۔ ان کے فن میں اردو تاریخ شعر کے سب دھارے یعنی جذبات نگاری' خیال آرائی اور صنعت گری یکجا ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایک نئے دھارے کا آغاز ہوتا ہے اور وہ، ہے غزل کا فکری انداز جس میں ان کے شاعرانہ ذہن' جذبہ خیال اور فکر کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ غالب نے اپنے کلام کے بارے میں کتنے پتے کی بات' کس سادگی اور بے ساختگی سے کہہ دی ہے' اس سادگی اور بے ساختگی سے جیسے یہ شعر کسی شاعری کے پرکھنے کا فارمولا بن گیا ہو یعنی۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کوئی بھی ہو' کیسا ہی ہو' غالب کو ہر حال میں اپنا ترجمان اور غمگسار پائے گا۔ کتنے شاعر ایسے ہیں جو اتنے بے شمار مختلف الاحوال انسانوں کی ترجمانی اور ہمدری کا دعوی کر سکتے ہیں۔" (رشید احمد صدیقی نقوش غالب نمبر ۳' ص ۱۶۵)

مرسلہ اسد فراز' پنجاب ہائی سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

سلیم احمد کی غالب شکنی

ڈاکٹر مختار احمد عزمی

سلیم احمد کی غالب شکنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ انہوں نے "غالب کون؟" کے پیش لفظ میں لکھا ہے:

"سو سال سے کچھ اوپر کی بات ہے۔ پتہ نہیں غالب کے محبوب نے' یا کسی اور بھلے آدمی نے' یا خود روح عصر نے پوچھا تھا کہ غالب کون ہے؟ غالب چونکہ بزعم خویش خود کو بڑا نامور سمجھتا تھا' اس لیے جواب دینے کے بجائے ٹھٹھول پر اتر آیا۔۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟........

حالی کے بعد نئے جواب کے لیے عبدالرحمٰن بجنوری اٹھے اور غالب کو ملہم بالغیب بنا دیا۔ ان کی بھی بہت واہ ہوئی۔ تب سے جوابوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ نوکر شاہی کے افسر' سیاستداں اور تاجر بھی.....
ابھی کچھ عرصہ پہلے غالب کی سوسالہ برسی منائی گئی۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ لوگوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اتنی چاں چاں مچائی کہ سننے والوں کو سمجھنا مشکل ہو گیا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ محمد حسن عسکری کہ اردو کے پروفیسروں سے بہت چڑتے ہیں اور آج کل مغرب کے ادیبوں سے بھی تپے ہوئے ہیں' انہوں نے ہر کس و ناکس یہاں تک کہ رسل صاحب کو بھی غالب پر بولتے سنا تو ایک بار پوچھ لیا' غالب کون؟------ عسکری کے سوال کو دو سال اور روح عصر کے سوال کو سوا سو سال ہو چکے ہیں' اس لیے مزید تاخیر مناسب نہیں' ہمارا جواب حاضر ہے"(۱)

اس اہم سوال کے مفصل جواب کے لیے سلیم احمد کو ایک مکمل کتاب بعنوان "غالب کون؟" لکھنا پڑی۔ جس کی سطر سطر سے غالب شکنی نمایاں ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں غالب کی شخصیت اور شاعری کے کسی پہلو کا اعتراف بھی ہے لیکن زیادہ وقت انہوں نے غالب کے بت کو توڑنے پر صرف کیا ہے۔ بت شکنی کی یہ روایت' غالب شکن یاس یگانہ چنگیزی اور پروفیسر حسن عسکری سے ہوتی ہوئی سلیم احمد تک پہنچتی ہے۔

سلیم احمد کے ہاں' تنقید غالب ایک مستقل شعبہ ہے۔ اس سلسلے کا آغاز ان کے مضمون "غالب کی انانیت" (۲) سے ہوتا ہے جو ۵۹ء میں لکھا گیا۔ دوسرا مضمون "غالب اور دنیا آدمی" (۳) ہے جبکہ تیسرا مضمون "غالب اور انسانی رشتے" (۴) ہے۔ دوسرا مضمون ۶۰ء کی تحریر ہے اور تیسرا ۶۵ء میں لکھا گیا۔ ایک سلسلے میں ایک مکمل کتاب "غالب کون؟" ۷۱ء میں شائع ہوئی۔ مختصر یہ کہ غالب کے حوالے سے سلیم احمد مسلسل لکھتے رہے؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ غالب شکنی کے لیے یوں مسلسل کیوں کمربستہ رہتے تھے؟ اس اہم سوال کا جواب بھی ضروری ہے جو آگے آئے گا لیکن فی الحال یہ ستم ظریفی دیکھئے کہ سلیم احمد نے غالب پر جو کتاب لکھی' اس کا انتساب میر تقی میر کے نام کیا ہے۔ یہ انتساب درج لفظوں میں ہے جو قابل غور ہیں۔

"خدائے سخن میر تقی میر کے نام۔ جن کے بارے میں غالب طوعاً" وکرہاً" ناسخ کا ہمنوا ہو کر اعتراف کرنا پڑا۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں"(۵)

سلیم احمد نے غالب کو سمجھنے سمجھانے یا رد و قبول کے لیے جو نفسیاتی اصول وضع کئے ہیں ان کی بنیادی ایس ایلیٹ کے ایک فقرے سے اٹھتی ہے یعنی "شاعری شخصیت کا اظہار نہیں بلکہ شخصیت سے فرار ہے۔" سلیم احمد کے اخذ کردہ نتائج نے غالب کی شخصیت اور فکر و فن کی اس تصویر کو پارہ پارہ کر دیا ہے جو پڑھنے والوں کے ذہن میں ایک سو سال سے بن چکی تھی۔ مثلاً" غالب کے نسب نامے کا مضحکہ اڑاتے ہوئے سلیم احمد لکھتے ہیں کہ جس طرح غالب اپنا شجرۂ نسب شاہان سلجوق سے ملاتے ہیں اس طرح تو ہر شخص کا شجرہ حضرت آدمؑ تک پہنچ جاتا ہے۔ بقول سلیم احمد

"------ عرف مرزا نوشہ جسے کوئی جانتا نہیں' اسد سے وہ خود بیزار ہے۔ نجم الدولہ اور دبیر الملک' جس شاہ سے القابات ملے تھے وہ خود اپنے تئیں فقیر بادشاہ کہتا تھا' ہاں البتہ اسے اپنے نام کے ساتھ بہادر لگانا بہت عزیز تھا۔ محمدؐ سے پرہیز کرتے تھے' پھر اسے کس نام سے پکاریں؟ چلئے سیدھا سادا غالب ہی کہے دیتے ہیں"(۶)

سلیم احمد کا خیال ہے کہ غالب کی ابتدائی شاعری کے بے ہنگم ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ ملا عبدالصمد کو بھی غالب نے نظریہ ضرورت کے مطابق اپنا استاد گھڑ لیا تھا۔ رئیسی تو خطرے میں تھی ہی' ذوق کی سکہ بند شاعری کے سامنے غالب کی شاعری بھی خطرے میں رہی۔

یہ سب باتیں لکھتے ہوئے سلیم احمد نے ایک اہم بات کو نظرانداز کر دیا ہے کہ کسی بھی فنکار کی حقیقی عظمت و شہرت کا پتا تو اس کی آنکھیں مند جانے کے بعد ہی چلتا ہے۔ ذوق کو جو ملنا تھا' اس کی زندگی ہی میں مل گیا مگر غالب کا جادو پس مرگ بھی ڈیڑھ سو سال سے سرچڑھ کر بول رہا ہے تاہم ایک مقام پر سلیم احمد کو بھی اس اہم حقیقت کا احساس ضرور ہو گیا اور انہوں نے لکھا:

"------ مگر تقدیر' زمانے اور خدا نے اس جنگ میں غالب کو غالب بنا دیا"(۷)

"غالب کون؟" کے ابتدائی ابواب میں سلیم احمد نے شاعری کے لیے شخصیت کی قربانی کو ضروری قرار دیا ہے۔ نہ صرف شاعری کے لیے بلکہ ہر تخلیق کے لیے۔ اس مقام پر غالب کے ایک مشہور خط کا ایک اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ غالب نے لکھا ہے۔

"یہاں خدا سے بھی توقع نہیں' مخلوق کا کیا ذکر؟ آپ اپنا تماشائی ہو گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے' کہتا ہوں کہ غالب کے ایک جوتی اور لگی"

مذکورہ بالا خط کی رو سے سلیم احمد کو خوش ہو جانا چاہیے کہ کم از کم اس خط کی حد تک تو غالب نے اپنے آپ کو غیر فرض کر لیا ہے' رئیس زادہ اور خان بہادر غالب مر چکا ہے۔

کتاب مذکورہ میں سلیم احمد نے کئی جگہوں پر غالب کا موازنہ میر تقی میر سے بھی کیا ہے بلکہ بعض بزرگوں کا خیال ہے کہ سلیم احمد نے یہ کتاب لکھی ہی اس لیے ہے کہ میر کو ایک نمبر اور غالب کو دو نمبر شاعر قرار دیا جائے۔ سلیم احمد لکھتے ہیں۔

"میر کی شاعری وہ ہے کہ غالب بھی چیں بول جاتا ہے"(۸)

غالب کے تصوف کے بارے میں سلیم احمد کا خیال ہے۔

"ہمارے بابا (ذہین شاہ تاجی) ہم سے کہا کرتے ہیں' سلیم احمد تصوف سے کچھ حاصل کرنا ہے تو اسے گھسٹ میں

اتارو۔ تصوف غالب نے حاصل تو کیا ہے مگر گمٹ میں نہیں اترا' صرف ذہن ہی میں رہ گیا ہے۔ اس لیے غالب مرعوب تو کر دیتا ہے' اندر نہیں اترتا۔"9

طنز و مزاح کے حوالے سے سلیم احمد نے غالب کو نہ صرف میر پر بلکہ تمام اردو شعراء پر ترجیح دی ہے۔ ان کا خیال ہے۔

"غالب کی وٹ (WIT) کسی اردو شاعر کو نہیں ملی"(١٠)

غالب کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہوئے سلیم احمد نے غالب کے مشکل ترین' نیم مشکل' سہل اور سہل ممتنع اسلوب پر اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"غالب کے مقلد نہیں پیدا ہوئے یا کم پیدا ہوئے جو پیدا ہوئے وہ مضحکہ خیز چیز بن کر رہ گئے--- آسان اسلوب کی پیروی کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی کیونکہ مشکل ترین ہے بھاری پتھر چوم کر سب چھوڑ دیتے ہیں"(١١)

سلیم احمد کا خیال ہے کہ غالب جہاں سہل ممتنع کا اسلوب اپناتے ہیں' وہاں میر کے قریب پہنچ جاتے ہیں مگر وہ انا سے معمور ہیں۔ وہ ہم اور میں کا صیغہ ضرور استعمال کرتے ہیں۔ یہاں سلیم احمد' میر کے ہاں ایسے ہی صیغوں کے استعمال کو ذہن میں نہیں لاتے۔ مثلاً" میر کے اس شعر میں انا کس قدر سرچڑھ کر بول رہی ہے؟

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
مستند ہے میرا فرمایا ہوا

اب رہی یہ بات کہ سلیم احمد کی غالب شکنی کی اصل بنیاد کیا ہے؟ اس کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ سلیم احمد زندگی بھر اکائی اور وحدت کے جویا رہے۔ ان کی نظر میں میر ہند اسلامی تہذیب کا سچا نمائندہ شاعر ہے جبکہ غالب ہماری شکست و ریخت کا مظہر ہے۔ بہرحال سلیم احمد اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جب تک ہماری تہذیبی ٹوٹ پھوٹ جاری رہے گی' غالب زندہ رہے گا۔

سلیم احمد کا خیال ہے۔

"غاب وہ نقطہ ہے جس میں ہم بند ہیں۔ غالب ہماری بسم اللہ ہے اور تمت بھی۔ کچھ لوگوں کی شہادت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ہی نہیں' ادھر پورا یورپ بھی "گالب' گالب" کر رہا ہے۔ (میں) عسکری صاحب کی ہمنوائی میں ذوق کی حمایت کروں یا نہ کروں' غالب کی مخالفت ضرور کرنا چاہتا ہوں یعنی اپنے زمانے کی بلکہ خود اپنی۔"(١٢)

حواشی

١۔ "غالب کون؟" از سلیم احمد۔ ص ۵۔ مطبوعات المشرق۔ کراچی ١٩٧١ء

٢۔ مشمولہ "ادھوری جدیدیت" از سلیم احمد سفینہ اکیڈمی۔ ١١٠١/١٦ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ١٩٧٧ء۔

٣۔ مشمولہ "نئی نظم اور پورا آدمی" از سیم احمد۔ نفیس اکیڈمی کراچی ١٩٨٩ء

٤۔ "ایضاً"

٥۔ "غالب کون؟" از سلیم احمد

٦ تا ١٢ ایضاً"۔

"غالب کا خط خالد اختر کے نام"

مشفق خواجہ کراچی

سعادت و اقبال نشان' اختر فلک معنی و بیان' محمد خالد المتخلص بہ اختر کو غالب خستہ کا سلام پہنچے۔ تمہاری کتاب "مکاتیب خضر" بہ سبیل ڈاک آئی۔ تمہارا نام نامی پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اس لیے تعجب ہوا کہ مجھ غریب الدیار کو تم نے کیوں شایان لطف گردانا۔ یہاں بہت سوں سے تمہارے بارے میں پوچھا لیکن کوئی آشنائی و آگاہی کا مدعی نہ ہوا۔ تقریظ سے کھلا کہ تم بہت بڑے ادیب ہو' ظرافت میں ید طولی رکھتے ہو' یعنی عجیب و غریب ہو۔ لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تقریظ نویس مسمی محمد کاظم کون ذات شریف ہے۔ میرے زمانے میں چھاپے کی کتاب پر تقریظ وہ لکھتا تھا جو چار دانگ عالم میں نامور ہوتا تھا۔ اب مدح اور بھٹی کے منصب کے لیے مادح اور بھاٹ کا مشہور ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ بہرحال تقریظ کے مطالعے سے یہ معلوم ہوا کہ تم نے میرے انداز روش میں نامہ نگاری کی کوشش کی ہے۔ اگر تقریظ میں بالصراحت یہ امر ملحوظ نہ ہوتا تو میرے لیے یہ قیاس کرنا بعید از امکان تھا کہ تم میرے مقلد ہو۔ میں نے کتاب کی ورق گردانی کی' مومن و صہبائی کو بھی دکھائی' مفتی صدر الدین آزردہ سے بھی مشورت کی لیکن یہ سب متفق اللسان ہو کر کہتے ہیں کہ تم نے جو مشقت کھینچی ہے اور جس طرح جگر خون کیا ہے' اس کا مجھ غریب کی نامہ نگاری سے کوئی تعلق نہیں۔ اس بات کو چند مثالوں سے ذہن نشین کرو۔ منشی ابن انشا کے نام کے مکتوب میں تم نے لکھا ہے: "ہاں بھئی رہتے تو تم شہر آشوب کراچی میں ہو"۔ میں نانجار بھلا ایسا کیوں لکھتا کہ مجھے معلوم ہے شہر آشوب رہنے کی نہیں' پڑھنے اور سننے کی چیز ہے۔ مولانا ماہر القادری کے نام کے خط میں تم نے کئی جگہ "قصہ" کی جمع "قصائص" لکھی ہے۔ لعنت ہو مجھ پر اگر میں "قصہ" کی جمع "قصص" کے سوا کچھ اور سمجھوں۔ "قصائص" از روئے لغت غلط از روئے لغویت درست۔ اسی خط میں تم لکھتے ہو: "اصل حال اب مجھ پر باز ہوا۔" بھائی "حال" کوئی دروازہ نہیں کہ باز ہو۔ "باز" کے معنی کھلنے کے ضرور ہیں لیکن استعمال کا موقع و محل دیکھ لینا چاہیے۔ "حسن پرست" کی جمع تم "حسن پرستگان" لکھتے ہو۔ "کندۂ ناتراش" کی جگہ "ناکندۂ تراش" ارشاد فرماتے ہو۔ حیرت ہے کہ تمہیں کوئی ٹوکتا بھی نہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور شفیق الرحمٰن کے تم بچپن کے یار ہو۔ دیکھو یہ دونوں کیسی عمدہ اردو لکھتے ہیں مگر بے فیض معلوم ہوتے ہیں کہ تم سے صحیح اردو لکھنے کا راز چھپا کے رکھا۔

عزیزی نیس احمد فیض کے نام کے خط میں تم لکھتے ہو: "خبر تمہارے قلمروئے روس کو مراجعت کی دیکھی۔" میرے زمانے میں "مراجعت" کے معنی "لوٹنے" کے تھے' تم نے ان معنی کو لوٹا کر "تشریف لے جانے" کے معنی میں لکھا ہے۔ یہ لغوی تصرف تمہاری زبان دانی پر دال ہے۔ "قلمرو روس" کی جگہ تم نے "قلمروئے روس" لکھا ہے۔ کسرۂ اضافت کی جگہ یائے مجہول لانا' مجہولانہ فعل ہے۔ اسی خط میں تم نے ایک لفظ "خشمی" لکھا ہے۔ یہ لفظ تم نے کس لغت میں دیکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی خود ساختہ لغت میں دیکھا ہو گا۔ ایسی بے پر کی تو صاحب برہان قاطع بھی نہ اڑاتا تھا۔ کیا "خشم" سے غصے کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ یہ ویسے ہی ہے کہ جیسے کوئی "غصہ" سے "غصگی" بنا لے۔

بھائی! میری ان باتوں پر "خشگی" نہ کرنا۔ تمہاری کتاب کا غلط نامہ تیار کرنا مقصود نہیں۔ یہ چند باتیں محض اس لیے لکھ دی

ہیں کہ تمہاری کتاب کے پڑھنے والے تمہارے لغوی تصرفات کو میری تقلید کا نتیجہ نہ گردانیں۔

تمہارے تقریظ نگار نے اطلاع دی ہے کہ تمہیں زبان اہل فرنگ سے بے حد رغبت ہے اور یہی زبان تمہارا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ایسی صورت میں زبان اردو سے تمہاری بے اعتنائی بعید از فہم نہیں' لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم اردو کی بجائے زبان اہل فرنگ میں کیوں نہیں لکھتے۔ اس زبان میں لکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ تمہاری اردو کی غلطیوں پر کسی کی نظر نہیں جائے گی۔ مگر خدا کے لیے دوسروں کی زبان میں ویسے تصرفات نہ کرنا جیسے اردو میں کرتے ہو۔ صاحبان فرنگ کے نزدیک یہ امر نامطبوع قرار پائے گا۔

میں نے تمہاری کتاب از لوح تاتمت نہیں پڑھی کہ اب زیادہ مشقت کھینچنے اور دکھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تاہم کہیں کہیں سے اسے دیکھا ہے۔ باتیں بکھانے کا ہنر تم خوب جانتے ہو۔ یہ امر مطبوع خاطر ہوا کہ تم نے اہل مذہب کا مذاق خوب اڑایا ہے۔ جو کام ہم شعرا کلام موزوں کی صورت میں انجام دیتے ہیں' وہی تم نے نثر ناموزوں میں کر دکھایا ہے۔ کل ملیح آباد کے جوش ملنے آئے تو سامنے تمہاری کتاب رکھی تھی۔ انہوں نے اسے ادھر ادھر سے دیکھا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام کے خط پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے' یہ منشی مولویوں کی خبر خوب لیتا ہے۔ لیکن جب اپنے نام کا خط پڑھا تو ارشاد فرمایا: "اس شخص کا کوئی اعتبار نہیں' کبھی سچ بولتا ہے اور کبھی جھوٹ۔"

بندۂ روسیاہ عرض کرتا ہے کہ سچ جھوٹ کا فیصلہ کرنا تو مشکل ہے لیکن بعض لوگوں کے ساتھ تم نے جو ناملائم سلوک روا رکھا ہے' وہ اخلاق کے منافی ہے۔

بھوگ سنانے میں تمہارا جواب نہیں۔ مثلاً" الطاف حسین قریشی کو مشورہ دیتے ہو کہ وہ اپنے رسالے کا نام "زندگی" کی بجائے "ورندگی" رکھ لے۔ یہ خوش طبعی نہیں گزاف ہے۔ شائستگی کا اقتضا ہے کہ ظرافت اور پھکڑپن میں امتیاز کیا جائے۔

انتظار حسین کے بارے میں بھی تمہاری رائے کی اصابت مظنون ہے۔ تم اسے مشورہ دیتے ہو کہ لاہور میں رہ کر لکھنؤ کو یاد نہ کرے۔ راوی کے کنارے گومتی کو تصور میں نہ لائے۔ تم کون ہوتے ہو یہ مشورہ دینے والے۔ تمہیں کوئی تمہارے وطن بہاولپور سے زبردستی خارج کروے تو پھر قدر عافیت معلوم ہو گی۔ مسلمانوں کو اندلس سے نکلے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ وہ آج تک اس کے لیے روتے ہیں۔ کیا قطب مینار اور تاج محل اور دلی کی جامع مسجد اور لکھنؤ کے قیصرباغ کے لیے چالیس پچاس برس بھی نہیں رویا جا سکتا؟ میاں! ہوش کے ناخن لو اور ایسی باتیں نہ کرو جن کا کوئی سر پیر نہ ہو۔

اور ہاں' یہ مختار مسعود سے تمہیں کیا پرخاش ہے۔ اس کا گلہ رکھتے ہو کہ اس نویسندۂ بے بدل کی کتابیں سفید چکنے کاغذ پر کیوں چھپتی ہیں اور پھر کیوں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ تم اس بے چارے کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو۔ کہتے ہو اس نے مینار پاکستان کی جو کہانی لکھی ہے وہ خود نمائی کی داستان ہے۔ مینار پاکستان مختار مسعود کی نگرانی میں بنا تھا' کیا اسے حق نہیں کہ وہ اپنے حوالے سے اس کی داستان بیان کرے۔ تم مشورہ دیتے ہو کہ مختار مسعود کو ان مزدوروں کا احوال لکھنا چاہیے تھا جنھوں نے اس مینار کو تعمیر کیا۔ یہ تو ویسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی شاہ نامہ لکھنے پر فردوسی کی تعریف کرے اور تم کہو فردوسی کا کیا کمال ہے' اصل کام ان اہل حرفہ کا ہے جنھوں نے کاغذ بنایا اور روشنائی بنائی اور خامہ بنایا۔ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو فردوسی شاہ نامہ نہیں لکھ سکتا تھا۔ تم مقر ہو کہ تمہاری کتاب "کھویا ہوا افق" مہتمم مطبع کے گودام میں پڑی پڑی کرم خوردہ ہو گئی۔ اگر ایسا حادثہ مختار مسعود کی کتاب کو

پیش نہیں آیا تو یہ حسد کی نہیں شکر کی جا ہے کہ کوئی مو سسہ تو محبوب خلائق ہوا۔ تم کچھ بھی کہو' مختار مسعود کی ادبی حیثیت مبتل نہیں کی جا سکتی۔ میری اس گزارش سے تم یہ نہ سمجھنا کہ مجھے مختار مسعود سے کوئی ذاتی علاقہ ہے۔ نا بھائی! میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟

ہائے ظالم! تو نے میرے مخدوم زادے اور خانوادۂ نواب علاء الدین علائی کے چشم و چراغ مرزا جمیل الدین عالی کو بھی نہ بخشا۔ اس کی نثر نویسی کے بارے میں ایسا زہر اگلا ہے کہ میری طبیعت منغض ہو گئی۔ ایسی حالت تو کبھی خود عالی کی نثر پڑھتے ہوئے بھی نہیں ہوئی۔ میاں! کیوں ناسپاسی و حق ناشناسی کرتے ہو' دل سے مہرو آزرم کو نکالتے ہو۔ شنید ہے کہ تمہاری اس کتاب پر جو مہتمم مطبع کے گودام میں پڑی پڑی کرم خوردہ ہو گئی تھی' عالی نے گندم کا انعام دلوایا تھا۔ اس نیکی کا اجر اس بے چارے کو خوب ملا۔

اچھا اب اجازت دو۔ کوئی بات بری لگے تو معاف کر دینا مگر خدا کے لیے انتقال کے خیال سے میرے انداز تحریر میں کوئی اور کتاب نہ لکھ دینا۔ میری جان! اپنا راستہ الگ نکالو تاکہ تمہارے لکھے کو دیکھ کر لوگ یہ کہیں کہ ابداع اس کو کہتے ہیں' جدت طرز اس کا نام ہے۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو تمہاری تحریر دیکھنے والے یہی کہیں گے کہ یہ چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے۔ خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔

اپنے کرم فرماؤں سے نجات کا طالب

غالب

(۳۰/ اگست ۱۹۸۹ء)

"غالب عدم سے اس دنیا میں"

"اس مرقع چغتائی کو کیا کہوں؟ (اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا) خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔ نہ دیوان غالب ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بہرحال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

خیر اتنا تو ہوا کہ "چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ جمع کر دیئے گئے۔ حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت' ان کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اشعار میں اکثر جھلکیاں دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

(اندازے از فاروق [illegible] رشید پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس)

غالب اور تصوف

پروفیسر تنویر حسین

شیخ شہاب الدین سہروردی اپنی کتاب "عوارف المعارف" میں لکھتے ہیں کہ "تصوف ایک جامع و مانع لفظ ہے" جو فقر اور زہد سب پر حاوی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ زہد اور فقر کے علاوہ کچھ اور اوصاف اور اضافات ہیں' جب تک وہ نہ پائے جائیں' صوفی صحیح معنوں میں صوفی کہلانے کا حق دار نہیں ہو سکتا' اگرچہ وہ زاہد اور فقیر کیوں نہ ہو۔"

معروف کرخیؒ کہتے ہیں کہ "تصوف کے معنی ہیں' حقائق کا علم حاصل کرنا' مخلوق کے ہاتھ میں از قبیل نعائم و اقتدار جو کچھ ہے' اس سے یکسر رو گرداں ہو جانا۔"

"ابو محمد حریریؒ" فرماتے ہیں "تصوف کے معنی ہیں کہ جملہ اخلاق حمیدہ اور اوصاف طیبہ کے ایوان میں داخل ہو جانا اور ہر قسم کے اخلاق رذیلہ سے پاک صاف ہو جانا۔"

جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں۔ "تصوف یہ ہے کہ حق تجھے تیرے وجود سے الگ کر کے ہلاک کر دے اور پھر جو زندگی وہ تجھے دے' وہ صرف اس کے لیے ہو۔ میرا تصوف قرآن و سنت میں مقید ہے۔ جو بات قرآن و حدیث سے ثابت نہ ہو' وہ مردود ہے۔"

علامہ حافظ ابن قیمؒ "مدارج السالکین" میں کہتے ہیں۔ تصوف سلوک حقیقی کا ایک گوشہ ہے اور اس کا کام نفس کی تہذیب اور اس کا تزکیہ ہے تاکہ اس کو رفیق اعلیٰ کی صحبت کی سیر کے لیے تیار کر دے۔ اس علم کا قلب سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں قلب ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے اس کو علم باطن کہتے ہیں۔ ابو نصر سراجؒ "کتاب اللمع" میں کہتے ہیں۔ "صوفیانہ لباس پہن لینے سے کوئی شخص صوفی نہیں ہو سکتا۔ تصوف تو اصلاح باطن کا نام ہے نہ کہ پیوند لگی ہوئی گدڑی کا۔"

"ابو سعید ابوالخیر کے مطابق تصوف نام ہے نفس کو غیر اللہ میں مشغول ہونے سے باز رکھنے کا۔"

میں اپنے مضمون میں غالب کو صوفی ثابت نہیں کرنا چاہتا اور ان کی ذاتی زندگی کے مختلف گوشوں کا مطالعہ کرنے سے بھی ان کا صوفی ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ وہ خود کہتے ہیں۔

یہ مسائل تصوف' یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے' جو نہ بادہ خوار ہوتا

لیکن تصوف پر ان کے اشعار پڑھ کر اس ذات عظیم کا احساس ضرور بیدار ہوتا ہے' جو کائنات کو حیرت انگیز طریقے سے چلا رہا ہے۔ اس ذات باری تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی محبت ہی کے ذریعے ہم مادہ پرستی اور نفس کی بیماریوں سے آزاد رہ سکتے ہیں۔

تیرہویں صدی میں جب مسلمان زوال کا شکار ہو چکے تھے تو اس وقت دہلی ایک ایسا شہر تھا' جہاں غالب جیسے چند فنکار موجود تھے۔ سکھوں' مرہٹوں' رہیلوں اور جاٹوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ جب دہلی' قتل و غارت' لوٹ مار اور قحط سالی کا مرکز بن گئی تو ان حالات نے شاعری کو بھی متاثر کیا اور شعراء تقدیر پرستی اور تصوف کے مضامین نظم کرنے لگے۔

اس میں شک نہیں کہ غالب انسانی احساسات اور انسانی جذبوں کا سب سے بڑا شارح ہے۔ اس کی بذلہ سنجی' رندمشربی'

عشق بازی اور شوخی اسے ہر دور کا مقبول اور نمائندہ شاعر بنا دیتی ہے لیکن میرے خیال میں جہاں غالب واقعی غالب نظر آتا ہے' اس میں اس کی تصوفانہ شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری بذات خود ایک ایسا عمل ہے کہ اگر اس سے تطہیر نفس کا کام نہ لیا جائے تو یہ محض عشق مجازی کی روداد بن کر رہ جائے گی۔ غالب کو میر درد جیسا صوفی شاعر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کے تصوفانہ خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حقائق و معارف کی کتب اور رسالوں کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔

الطاف حسین حالی تو یہ کہتے ہیں کہ ان کے متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہم عصروں بلکہ بارہویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعراء میں ممتاز بنا دیا۔

یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہے غیب غیب' جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں' وہ حقیقت میں غیب الغیب ہے۔ اس کو شہود سمجھنے میں ہماری مثال ایسی ہے' جیسے کوئی خواب میں خود کو جاگتا ہوا دیکھے۔ غالب چونکہ فنکاری اور ہنرمندی کا دامن ہرگز نہیں چھوڑتے' اس لیے انہوں نے اس شعر میں اپنی ذہنی اپج کی بلندی کا مکمل ثبوت دیا ہے۔

دہا آباد عالم' اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو' مے خانہ خالی ہے

دنیا ایک ایسی چیز ہے کہ اسے چھوڑنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ غالب نے بڑے خوبصورت انداز میں دنیا کی خوبصورتی اور اس کے آباد ہونے کی تعریف بھی کی ہے اور اہل ہمت کے فقدان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا

خواجہ میر درد نے بھی تو کہا ہے۔

اے درد! اس جہان میں آکر' صدائے غیب
بے پردہ جس سے ہووے' وہ پردہ ہے ساز کا

یعنی دنیا میں جو حجاب ہیں' وہی پردۂ ساز کی طرح اسرار الٰہی ظاہر کر رہے ہیں۔

غالب کا یہ مشہور شعر دیکھیے۔

عشرت قطرہ ہے' دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا' ہے دوا ہو جانا

تصوف اور شاعری کا مزا الگ الگ لیا جا سکتا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے' بت شکنی میں

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

بہت سے لوگ اس شعر کو غالب کی جدت پسندی اور اوبی روایت شکنی کے حوالے سے تشریح کرتے ہیں حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ معرفت الہٰی کی راہ میں سنگ گراں انسان کی اپنی ہستی ہی تو ہے۔

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجو
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

غیر سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ ہے۔ یعنی میں جس قدر خدا کے بارے میں دن رات پیچ و تاب میں رہتا ہوں' اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجود واجب سے بعد ہے۔

ہم موحد ہیں' ہمارا کیش ہے ترک رسوم'
ملتیں جب مٹ گئیں' اجزائے ایماں ہوگئیں

تمام ملتوں اور مذہبوں کا ترک کرنا ہی موحد کے نزدیک اصل مذہب ہے۔

جب وہ جمال دل فروز' صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز' پردے میں منہ چھپائے کیوں؟

اب ذرا غالب کے فارسی کلام سے چند مثالیں دیکھئے۔

رواج صومعہ ہستی ست زینہار مرو
متاع میکدہ مستی ست' ہوشیارہیا

میکدے کی پونجی مستی ہے۔ ذرا مستی حاصل کرنے کے لیے ذرا ہوشیار ہو کر آنا چاہیے۔

سوز ترا رواں ہمہ در حویشتن گرفت
از داغ' تہمتے بہ جگر بستہ ایم ما

تیرے سوز اور تری آگ کو جان نے اپنے اندر جذب کرلیا ہے۔ اب ہم اپنے جگر کو داغ دار کہتے ہیں' اصل میں اس پر تہمت رکھتے ہیں۔

عالم آئینہ رازاست' چہ پیدا' چہ نہاں
تاب اندیشہ نداری' بہ نگاہ دریاب

اگر تو سوچنے سے عاری ہے تو آنکھوں ہی سے عالم کا نظارہ کر' یہ باطن و ظاہر کا یعنی اللہ تعالیٰ کے بھیدوں کا مظہر ہے۔

در گرم روی سایہ و سرچشمہ نجوئیم
با ماسخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت

ہم ہمیں آگے جانے کی جلدی ہے۔ ہم سایہ و سرچشمہ یعنی طوبیٰ و کوثر پر آرام نہیں کرسکتے۔

قفس و دام را گنا ہے نیست
ریحش در نہاد بال و پرست

قفس و دام دونوں جانوں کے لیے اذیت والے مقام ہیں۔ قفس اور دام سے مراد رہتا ہے یعنی بال و پر گرنے کے لیے اور جاندار مرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔

یک گریہ پس از ضبط دو صد گریہ، رضاده
تا تلخی آں زہر تو انم بہ گلوبرد

جب دو سو مرتبہ رونے کو ضبط کروں تو ایک ایک مرتبہ تو رونے کی اجازت دے تا کہ اس ضبط کے زہر کی کڑواہٹ تو حلق سے دور کر سکوں۔

تاجر شوق دراں رہ بتجارت نہ رود
کہ رہ انجامد سرمایہ بغارت نہ رود

شوق ہی کا تاجر اس راستے پر نہیں چلتا کہ جو راستہ چلنے سے ختم ہو کر رہ جائے اور سرمایہ لوٹا نہ جائے۔

چیں کہ نخل بلند است و سنگ ناپیدا
زمیوہ، آنہم قد خود زشاخساز، چہ حظ

جب نخل اس قدر بلند ہے اور پھل جھاڑنے کے لیے پتھر بھی نہیں ہے تو جب تک پھل خود درخت سے نہ گرے یعنی جب تک جاذبہ عنایت ہم کو خود اپنی جانب نہ کھینچے یعنی شاہد حقیقی اپنی جھلکی نہ دکھائے' ہم کو کیا فائدہ؟

میرے خیال میں غالب تصوف کے کوچے سے آشنا تھا اور اس نے انسانی قلب کی واردات و کیفیات کی جس اچھوتے اور انوکھے انداز سے معوری کی ہے' یہ اسی کا حصہ ہے۔ آج کا انسان مادہ پرست ہے اور خدا سے دور ہے' اس لیے اسے سکون قلب' استغنا اور قرب الٰہی کے لیے غالب کے صوفیانہ کلام کا مطالعہ کرنا ہوگا۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں غالب کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

"غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کہتے رہ گئے۔

(مرسلہ فہیم خالد پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

چودہ طبق روشن ہو جاتے

"ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہا کہ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا ارے میاں تین کوس کیوں گئے؟ میرے پچھواڑے کی پیپلیاں کیوں نہ کھائیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے۔"

(مرسلہ آصف منظور پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

غالب دو سو سال سے غالب

ہارون الرشید تجسم سرگودھا

وقت سیل رواں ہے جو زندگی کو اپنے بہاؤ کے زور سے خش و خاشاک کی طرح بہائے جا رہا ہے۔ وقت کے ایک لمحے کو بھی سکندر اعظم ایسے فاتحین بھی نہ روک سکے۔ وقت گذر جاتا ہے۔ مہتاب وقت اپنے دامن میں کچھ منور کرنیں محفوظ کر لیتا ہے۔ جو سالہا سال تک اس کے دامن میں مقید رہتی ہیں۔

شاعری وقت کے ساتھ ارتقائی منازل طے کرتی ہے۔ ادب زندگی کے چوراہے پر کھڑا ہو کر وقت کو مختلف اطراف سے دیکھتا ہے۔ مختلف تجربے کرتا ہے۔ اور مختلف اوقات میں ان کہی باتوں' اچھوتے تجربات' اور انمول ادبی خزینوں کو پابند شعور و آگہی کر لیتا ہے۔ یہی آگہی اور آگہی اور آگاہی مستقبل کے ادب کو ادبی آئینے مہیا کرتی ہے۔

مرزا اسد اللہ خان غالب (۱۸۶۹۔ ۱۷۹۷ء) نے شعر و سخن کے ایسے آئینے کشتہ گان ادب کے لیے وراثت کے طور پر چھوڑے ہیں۔ جس میں ہر دور اپنا چہرہ دیکھ سکتا ہے۔ غالب کے فکر و فن پر آج تک کوئی غالب نہ آسکا۔ اور نہ ہی اس کے فن کو شکست ہوئی۔ بلا مبالغہ غالب کی شاعری معجزہ فن کی نمود ہے۔

غالب نے کہا تھا۔

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے!
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے!

غالب کیا تھا۔ غالباً غالب کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ وہ زینت پسند پیدائشی شاعر تھا۔ اس نے روشنی پر چلنے کی بجائے اپنے لیے اپنی راہوں کا تعین کیا۔ وہ لفظوں' جذبوں' اور فن کا شہنشاہ تھا۔ لفظ اس کے سامنے بے بس اور غلام کی حیثیت سے رہتے تھے۔ وہ جس طرح چاہتا لفظوں کو اپنے آئینے میں ڈال کر شاعری کو آئینہ دکھاتا۔

تشبیہات' استعارات' تلمیحات' اور تراکیب کا سہارا لے کر غالب نے اردو شاعری میں وہ میدان کاری کی کہ آج بھی بڑے بڑے شعراکرام انگشت بدنداں ہیں۔ غالب نے لفظ کی حرمت کو عزیز جاں سمجھا اور اسے وقت کی قربان گاہ پر قربان ہونے سے بچایا۔ غالب نے روایت سے انحراف کرنے کے باوجود روایت کی روح کو مرنے نہ دیا۔

غالب کو عرف عام میں مرزا نوشہ کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آگرہ اپنے تاج محل کی وجہ سے مشہور ہے کیونکہ شاہ جہان نے اپنی محبت کو امر کرنے کے لیے یہاں ایک تاج محل بنوایا یہ تاج محل ممتاز محل کی یاد کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آگرہ کو اپنی خوش بختی پر اس لیے بھی ناز کرنا چاہئے کہ یہاں محسن ادب' شہنشاہ غزل' خدائے سخن مرزا اسد اللہ خان غالب نے ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو جنم لیا۔ "اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے" کہتے ہوئے ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۳ برس کی عمر میں وفات پاگئے۔ غالب مقلد نہیں مجتہد تھے۔ انہوں نے تقلید کی بجائے نئی راہیں تراشنے کا فریضہ انجام دیا۔ انہوں نے شاعری کو دیوانگی ہی نہیں بلکہ مہذب سنجیدگی اور فرزانگی قرار دیا۔ ان کے ہاں تنقیدی شعور زندگی میں آسودگی اطمینان و سکون کا

پیام' جرات و صداقت' تجس' ایک لطیف ذہنی خلش' بے چینی' انفعالیت' اور کہیں کہیں قنوطیت نظر آتی ہے۔ حسن و عشق کے بارے میں بھی وہ ہوس پرستی' اور سوز مستی کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ تخلیق فن دراصل عشق صادق کی تڑپ' اور شعلہ سوزاں سے پروان چڑھتا ہے۔ جس طرح پیچ یا قلم گلستان کی قسمت' تحریر کرتے ہیں۔ اسی طرح شاعری کا پیچ گلستان ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ اور غالب کی شاعری کا پیچ خون جگر کی نمو ہے۔ جس نے داخلیت اور سطحی خارجیت دونوں کے پر پیچ حلقوں سے نکل کر عالم گیر جذبوں کی نمائندگی کی ہے۔ اسی لیے غالب کی غزل حدیث دل سے بڑھ کر حدیث زندگی کا روپ دھار چکی ہے۔ اس نے لفظوں کے بجائے کراں سمندر سے آفاقیت کا دروازہ کھول کر خود کو بحر بے کراں کر دیا ہے۔

ان کی شاعری کے اشارے اور علامتیں ان کے فن میں نئے رنگ اور نئے آہنگ کا موجب ہیں۔ غالب کو عالمی سطح پر فلسفی' مفکر' ماہر نفسیات' ماہر اخلاقیات' حکیم وقت' یا نباض وقت تسلیم نہیں کیا گیا لیکن ان کی تخیل پرواز اور فلسفہ حیات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی بڑی حکیمانہ' فلسفیانہ باتیں کی ہیں۔ خیالات کی ندرت اور جدت طرازی محض شاعرانہ نہیں بلکہ حکیمانہ بھی ہے۔ زندگی کی آرزو' تجربات زندگی' جوش طبعی و ظرافت اور فطرت میں مستغرق ہو کر غالب نے تجربات و حقائق کا ایک خزانہ دریافت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب کی بہت سی پرتیں ہیں ہر پرت ایک نیا رنگ و روپ لیے ہوئے ہے۔ ہر شعر جہان معنی ہے۔ کئی اشعار کی تشریح ایک ایک کتاب کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے خیالات کی وسعت ایک محشر خیال ہے۔ وہ خلوت و جلوت میں وسعت خیالات کا ایک ایسا طوفان رکھتا ہے کہ لفظ خیالات کی دوری سے اور خیالات لفظوں کی ڈوری سے بندھے قرطاس پر بکھرنے لگتے ہیں۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہو گا

ظاہر ہے کہ یہ شعر کتنا سادہ ہے۔ لیکن وسعت معانی کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ شہد کی مکھی کا باغ میں جانا' پھولوں پر بیٹھنا' پھولوں کا رس چوسنا' پھر کسی درخت پر اس رس کو چھتے کی شکل دے دینا۔ شہد کی مکھیوں کا چھتہ جوبن پر آجانا۔ شہد کا نکالنا' اور موم کا بچ جانا' موم سے موم بتی کا بننا' موم بتی کا جلنا پروانوں کا اس کے گرد گھومنا اور پھر شمع پر جان دے دینا بہت بڑے عوامل ہیں۔ اسی لیے غالب کہتے ہیں۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دیجو
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

غالب کے کلام میں گہرائی' سہل ممتنع' وسعت خیال اور ندرت بیان دیوان غالب کے اس شعر سے بخوبی عیاں ہوتی ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

دیوان غالب کا یہ پہلا شعر حمد بھی ہے اور گلہ بھی اور ادبی رنگ کا اظہار بھی ہے' فلسفہ و دانائی کا شاہکار بھی ہے۔ ایران کی

رسم سے لے کر انسان کی بے ثباتی' دنیا میں فریاد کرنے کا انداز اور فطرت سے اس بات کا شکوہ کہ انسان کی اپنی آواز بھی اختیاری نہیں اور وہ ایک بلبلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

غالب کیا ہر انسان کی نمائندگی اور جذبوں کا اظہار ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ غالب نے معانی کی پہلو داری میں کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا کلام مجموعی طور پر آفاقی جذبوں کا نمائندہ ہے۔ انسان کے اخلاقی پہلوؤں پر غالب کے یہ دو اشعار انسانی چارٹر کے اہم ترین اجزا ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

دیکھنے میں یہ دونوں اشعار سادگی کا مرقع ہیں لیکن تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کا ہر پہلو ان اشعار میں مقید ہے۔ وحدت الوجود کا مسئلہ غالب کے کلام میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ شاہد حقیقی کے نور سے معمور اور ہر چیز میں اس کا ظہور ہے۔ ہرا ہرا سبزہ زار گراہ فلکی کی گردش' بحر و باراں کے ہنگامے' دریاؤں اور سمندروں کی متلاطم خیز موجیں' خوشگوار اور وسیع فضا اور رنگا رنگ کے پھول' بہار کی بہاریں برسات کی رنگینیاں' اجلی کرنیں' غنچوں کا تبسم' پرندوں کی چہچہاہٹ' چمنوں کی سرسراہٹ' شفق کی لالی' گویا ہست و بود کے مظاہر وحدت الوجود اور وحدت المشہود کے مظاہر ہیں۔

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

غالب ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

خشک سے خشک مضامین کو انوکھے پیرائے میں بیان کرنے کے علاوہ کئی اشعار میں غم و آلام کے باوجود خوشی کی کرن نکلتے نظر آتی ہے۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی' نغمہ شادی نہ سہی

یا پھر لکھتے ہیں۔

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

غالب کا یہ شعر قابل توجہ ہے۔

دریا ز حباب آبلہ پائے طلب تست
نور نظر اے گوہر نایاب کو جائی

غالب کا یہ شعر کئی دیوانوں پر حاوی ہے جس میں زندگی کا مدعا مقصد اور تلاش حق کی دعوت دی گئی ہے۔
قصیدہ گوئی میں بھی غالب اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ قصیدے پر غزل کا رنگ غالب ہے لیکن اپنے ممدوح کو پیش کرنے میں غالب نے اپنا غلبہ قائم رکھا ہے۔ فکر و فن کی جولانیاں ان کے خطوط میں بھی موجود ہیں۔ اردوئے معلیٰ ان کی نثر اور ان کی خطوط نویسی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ غالب کے خطوط غم دوراں اور غم جاناں کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ایک عہد کی داستان ہیں۔ ایک ایسی داستان جس میں برصغیر پاک و ہند کے سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، ادبی اور ثقافتی حالات اپنی اپنی جگہ آئینے کی مانند ہیں۔
غالب کی پیدائش کے دو سو سال کا جشن اہل علم و بینش سے ایک سوال کرتا ہے۔ کہ غالب کے بعد اس جیسا ہمہ جہت شاعر و ادیب اب تک کیوں نمودار نہیں ہوا۔ سچی بات ہے کہ غالب پر غالب آنا ناممکن ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ آنے والا کل بھی غالب کے فکر و فن کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرے گا۔

"غالب عدم سے اس دنیا میں"

"پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رہا ہوں۔ وہ زندگی کی ستم ظریفی تھی یہ موت کی چھیڑ ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں

(مرسلہ کاشف پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

"غالب کو افسوس رہا تو بس یہ کہ ان کی پوری قدر اپنے دور میں نہ ہو سکی اور حسرت رہی تو یہ کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق رنگ محل تعمیر نہ کر سکے جس میں وہ پرسکون زندگی گزار سکتے اور یہی حسرت تعمیر دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو راہ غالب نے اپنے شعر و ادب میں اختیار کی تھی اب بھی اس پر کئی کاروان فکر و نظر گامزن ہیں اور اسے غالب کی روشن ضمیری اور وسیع النظری کا فیضان نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔" (سلطان صدیقی، نقوش غالب نمبر ۳ ص ۱۹۰)

(مرسلہ حافظ محمد شاہد پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

نالہ حزن انگیز بر وفات غالب

مولانا الطاف حسین حالی

غالب نے جب کہ روضہ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اس دن کچھ اصل شہر کی افسردگی نہ پوچھ
عاشق کا دل بھی یاد سے اس غم میں سرد تھا
حالی کہ جس کو دعوی تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
تھا گرچہ اک سخنور ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلے میں آ کے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا
میں اور صبح و شام یہ اندوہ جانگزا
دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا
سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا
تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

وفات غالب بروز دو شنبہ بعد از دوپہر بتاریخ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعد ۱۲۸۵ھ

غالب

علامہ محمد اقبال

فکر انسان پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ‎ ‎ ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تاکجا
تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر ترا ‎ ‎ زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر ‎ ‎ محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر ‎ ‎ خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ‎ ‎ ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں ‎ ‎ آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

اے جہان آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ‎ ‎ ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر ‎ ‎ یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر

دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

خراجِ عقیدت

جگر مراد آبادی

لاریب کہ اس رمز سے واقف تھی تری ذات
افسانہ ہمہ رنگ، و حقیقت ہمہ رنگ

اے وہ کہ تری ذات گرامی، بہ ہمہ رنگ
قدرت کی جو ہم راز، تو فطرت کی ہم آہنگ

اے وہ کہ تری فکر، بہ ہر طرز، و بہ ہر صنف
ہم شعلہ، و ہم شبنم، وہم شیشہ وہم سنگ

اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا، نغمہ فطرت
اے وہ کہ ہر اک نقش ترا، روکش ارژنگ

اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبش لب سے
اک جنت شاداب ہر ایک غنچہ ہے دل تنگ

ہر پھول ترے باغ کا، فردوس بہ دامن
ہر خار ترے دشت کا، انگشت شفق رنگ

اقلیم سخن ہے، ترے اعجاز نفس سے
ہم نغمہ، وہم شیشہ، وہم نکہت، وہم رنگ

اک گوشہ دامن میں ترے، دجلہ جیحوں
اک موج نفس بھی، تری رقصاں، جمن و گنگ

تھے ملک سخن میں ترے، ہم عصر ہزاروں
تنہا تھی، تری ذات، گر صاحب اورنگ

تو نظم میں بھی، نثر میں بھی مجتہد العصر
لیکن، وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ

تو نے، اسے گنجائش کونین عطا کی
ہر چند، بہت تھا، کبھی دامان غزل تنگ

عرفی، و نظیری، و ظہوری، و فغانی
تیرا کوئی ہم سر، نہ تیرا کوئی ہم آہنگ

لاریب، کہ اس رمز سے، واقف تھی تری ذات
افسانہ ہمہ رنگ، و حقیقت ہمہ رنگ

الحق، کہ تری وسعت تخیل کے آگے
صحرا کف خاکستر و گلشن قفس رنگ

غزل

احسان دانش

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا --- غالب

صبح نے لوٹا اثاثہ شمع کی تنویر کا
ذائقہ کتنا ہے تلخ اس خواب کی تعبیر کا

مسکراتی چاندنی تھی بارش رنگ جنوں
چاند کا ہالہ تھا ہر حلقہ میری زنجیر کا

جب پریشانی کی رت آئی تو آنکھیں کھل گئیں
تھا ستاروں سے بھی رشتہ ہاتھ کی تحریر کا

برق کے تیشے نے کاٹے ہیں گھٹاؤں کے پہاڑ
کس سے رکتا راستہ سورج کی جوئے شیر کا

صرف لفظوں کی کھنک کانوں میں رس بھری رہی
جب کھلے معنی اجالا بجھ گیا تحریر کا

پشت کی دیوار پر پھیلی ہے زنجیروں کی بیل
کربلا کا خون خاکہ بن گیا تقدیر کا

جب کہ میں اپنے مصور کا ہوں شہکار قلم
میرے آئینے میں دھبہ آئے کیوں تصویر کا

رہ گئی صرف اس یقیں سے مفلسی کی آبرو
خود ہی مل جائے گا جو ہوگا مری تقدیر کا

دانش آئینے میں بچپن ہے نہ وہ دور شباب
توبہ توبہ یہ بھی اک رخ تھا مری تصویر کا

"مکاتیب غالب جدید نثر نگاری کا بہترین نمونہ"

انعام اللہ انعام بہاولنگر

جدید اردو نثر نگاری کا سنگِ بنیاد دراصل غالب ہی نے رکھا۔ الجھی ہوئی اور پر پیچ کی بجائے غالب نے سیدھے سادھے انداز میں اردو نثر "خطوط غالب" کا آغاز کیا۔ وہ اپنی شخصیت اور طبیعت کے اعتبار سے رہبر بھی تھا۔ غالب پرانے پیمانوں میں پینے کا عادی نہ تھا۔ ان کی تخلیقی حس یا قوت بڑی طاقتور تھی۔ وہ ایک مشکل بات کو نئے انداز میں اور آسان طریقے سے کہہ دیتا تھا۔ اردو نثر اس سے پہلے نثر کی بجائے شاعری معلوم ہوتی تھی۔ جیسے ملا وجہی کی "سب رس" کو بھی اردو نثر نگاری کا ترقی یافتہ اور ممتاز نمونہ قرار دیا گیا ہے اس سے قبل اردو نثر میں لہجے کا دیہاتی پن موجود تھا۔ لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اردو نثر ترقی کرتی گئی۔ غالب نے تو اسے سادہ اور آسان زبان بنا دیا۔ اپنے دوستوں اور احباب کو خطوط کی شکل میں نثر کے نمونے دیئے۔ ان کے مکاتیب میں سادگی' و سلاست' بے ساختگی اور سادہ مدعا نگاری ہے۔ اردو نثر کے تمام محاسن موجود ہیں۔ ایک خط میں اس انداز تحریر کے متعلق لکھتے ہیں۔ " میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط کو کچھ اس طرح سے شروع کرتے ہیں:

"مار ڈالا تیری جواب طلبی نے" غالب کا یہی انداز تحریر ہے جس نے اردو نثر نگاری کو جدید نثر نگاری میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے اس انداز تحریر میں جدتیں پیدا کیں جس سے ان کی تحریر میں ایک کشش پیدا ہوگئی جو پڑھنے والے کو لطف دے جاتی ہے۔

یوسف مرزا کے نام ایک خط میں یوں رقمطراز ہیں:

"کوئی ہے۔ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب وہ آئے۔"

یہ ڈرامائی کیفیت اور یہ جدید نثر اردو نثر میں ایک انقلاب ہے۔ غالب کے اس جدید انداز تحریر نے جدید اردو نثر نگاری کو ایک دلکش لہجہ عطا کیا۔ اس سے اردو نثر کو ہلکا پھلکا اور رواں انداز ملا۔

یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ غالب کے انداز تحریر پر فارسی کے اثرات ہیں لیکن اس سے ان کی نثر مشکل کی بجائے رنگین نظر آتی ہے انہوں نے قدرتی اور فطری طریقوں کو اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب کی نثر جدید نثر نگاری کے تمام تر تقاضے پورے کرتی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے کہ خط نگاری ایک کاروباری سی چیز لگتی ہے لیکن بعض لوگوں نے اسے آرٹ بنایا ہے مرزا غالب وہ پہلے شخص ہیں جن کی زندگی کے پورے حالات خطوط کے ذریعے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میرزا کے جدید انداز نگارش کی یہ خوبی ہے کہ وہ بے تکلف لکھتے تھے وہ الفاظ ڈھونڈنے کی بجائے عام اوبی بول چال کا سہارا لیتے تھے مرزا سے پہلے کسی نے بھی خط و کتابت کا یہ انداز اختیار نہیں کیا تھا۔ میری مہدی کے نام ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں:

"آہاہا!۔۔۔۔۔ میرا پیارا مہدی آیا' آؤ بھائی' مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔"

علاؤ الدین علائی کو لکھتے ہیں۔

"میری جان علائی ہمہ دان" "جان غالب مگر جسم سے نکلی ہوئی جان۔"

اس انداز نے واقعی مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے غالب نے اپنی ظرافت طبع سے کام لیا ہے اور اپنے خطوط میں بذلہ سنجی اور شگفتگی کے پھول کھلائے ہیں۔ ماہ رمضان میں ایک خط کا انداز تحریر اس طرح ہے۔

"پانی، حقے اور روٹی کے ٹکڑے سے روزے کو بہلاتا ہوں۔"

انہوں نے اپنے خطوط میں جزئیات نگاری اور منظر کشی بھی کی ہے جو کہ آج کے کسی بھی افسانے یا ناول کی خصوصیت ہوتی ہے۔ ایک خط کا انداز کچھ اس طرح سے ہے۔

"آج شنبہ 21 جنوری یہاں مقام ہے۔ نو بج گئے ہیں۔ بیٹھا حقہ پی رہا ہوں اور خط لکھ رہا ہوں۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

"میں بہ مجرد استماع اس خبر کے ڈاک میں بیٹھ کر گیا۔ ان کو دیکھا، چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں۔ مگر پہنچنے کو گیا، منگل کو آیا، آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔"

غدر کے بعد ایک خط تفتہ کے نام اس طرح لکھتے ہیں۔

"تم پر اس کی مثال اس وقت کھلتی اگر تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی۔ اور کپڑے میلے، پائنچے لیرلیر، جوتی ٹوٹی ہوئی۔" غالب کے خطوط سے اس وقت کے ماحول اور ان کی ذات سے متعلق بھی پتہ چلتا ہے۔ مرزا تفتہ ہی کو ایک خط میں اپنے شب و روز کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں جس شہر میں ہوں۔ اس کا نام بھی دلی اور اس محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے لیکن ایک دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔"

ان مثالوں سے ہم اس کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اردو نثر غالب کے ادبی مذاق سے متاثر ہوئی ہے اور ان کے خطوط جدید اردو نثر کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ انہوں نے اپنے خطوط میں اپنی دلی کیفیت کو سیدھے سادھے اور بے تکلف انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے اس انداز تحریر میں جو سادگی' تاثیر' خلوص' اور حسن ہے وہ شاید ہی اس زمانے اور اس زمانے سے قبل اردو نثر میں ملتا ہو۔ اس لحاظ سے ہم غالب کو جدید خطوط نگاری کا امام بھی کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے نثر نگاری کے اعتبار سے اردو نثر میں میٹھا رس بھرا ہے اور اسے مزید سادہ اور سلاست سے لبریز کیا ہے انہوں نے پرانی روش کو چھوڑ کر اردو نثر کو زندہ نثر بنایا ہے۔

غالب نے القاب و آداب اور مزاج پرسی کا قدیم طریقہ ترک کر کے نئے طریقے ایجاد کیے "ہاں صاحب تم کیا چاہتے ہو۔" "میاں" "برخوردار" "بندہ پرور" "پیر و مرشد" "بھائی صاحب" ان کے خطوط ان الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ میرزا غالب کی نثر میں مقالہ نگاری' مکالمہ نگاری' ڈراما' رپورتاژ' آپ بیتی' مختصر کہانی جیسی خصوصیات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر غالب کچھ بھی نہ ہوتے صرف اپنے خطوط بطور یادگار چھوڑ جاتے تو بھی انہیں دوام حاصل ہو جاتا۔

اردوئے معلی کے انداز تحریر کے متعلق میر مہدی لکھتے ہیں

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ملک غلام صابر

مرزا غالب کا شمار ان عظیم ادبی ہستیوں میں ہوتا ہے جو جریدۂ عالم پر بہت سے انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ مرزا غالب کو اس جہان فانی سے عدم کو سدھارے دو سال کا طویل عرصہ ہو چکا ہے۔ مگر آج بھی ادبی محافل میں ان کے افکار زیر بحث آتے رہتے ہیں۔

افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان میں اردو ادب کا طالب علم غالب کے صرف چند ادبی معاشی اور معاشرتی رویوں سے آشنا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ اس کے اندر کتنا بڑا انسان بیٹھا ہوا تھا اور نہ ہی کوئی اس کے ادراک کی سعی کرتا ہے۔ ادبی دنیا سے متعلق ہر شخص اس حقیقت کو تسلیم کرے گا کہ مرزا صاحب کی شاعری اور ان کی ذات پر جو تحقیقی کام بھارت میں ہوا ہے' اس کا عشر عشیر بھی پاکستان میں نہیں ہوا۔ گزشتہ چند سالوں میں بھارت میں غالب اکیڈیمی کے تحت وسیع پیمانے پر تاریخی دستاویزات اور ادبی شخصیات کے حوالے سے گرانقدر تحقیقی کام ہوا جسے انہوں نے نہ صرف صفحۂ قرطاس پر محفوظ کیا بلکہ مختلف کرداروں سے غالب کی معاشی و معاشرتی زندگی کو بھی اجاگر کیا۔ تین ویڈیو کیسٹ میں جن کا دورانیہ تقریباً چھ گھنٹے بنتا ہے کے ذریعے مرزا غالب کی ادبی اور گھریلو زندگی بڑے دلچسپ اور موثر انداز میں پیش کی ہے جس کے بعد اب ادب کے خوگر طلباء' اساتذہ اور بہت سے دوسرے افراد بھی غالب کو بہتر انداز میں جاننے اور پہچاننے لگے ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی ایک دو پروگراموں میں منجھے ہوئے ٹی۔ وی کریکٹر ایکٹر محمد قوی خان کے ذریعے مرزا غالب کو عام لوگوں سے متعارف کروانے کی کوشش کی مگر غالب کا صحیح حق ادا نہیں کر سکے (ہندوؤں نے بھی اپنی مسلم دشمنی کی وجہ سے کہیں کہیں ڈنڈی ضرور ماری ہے) اگر مرزا غالب کی معاشرتی زندگی کے حوالے سے کسی طالب علم سے پوچھا جائے تو اس کے ذہن میں غالب کا جو نقشہ فوری طور پر ابھرتا ہے اس میں مرزا غالب ایک مفلوک الحال شاعر کے روپ میں نظر آتے ہیں جو شراب کے رسیا ہیں' قرض لیکر واپس نہیں کرتے' فضول خرچی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ آم کھانے کے شوقین ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ادبی تحقیق کے حوالے سے بھی آج مرزا غالب کی چند مشہور زمانہ غزلوں کے سوا باقی شاعری سے بہت کم لوگ واقف ہیں اردو کی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے والا طالب علم بھی غالب کے چند اشعار (جو ضرب المثل کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور زبان زد عام ہیں) کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ یہ غالب جیسے عظیم شاعر' پر مروت انسان اور منفرد نثر نگار سے سراسر زیادتی ہے۔ غیر جانبدار اور تعصب سے مبرا نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو شاید اقبال بھی اقبال نہ ہوتے۔ اگر ہم تاریخی شواہد اور مرزا غالب کی زندگی کے عمیق مطالعے کے بعد دیانتدارانہ تجزیہ کریں تو یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مرزا غالب جو خاندانی ترک تھے ان کے دادا عہد شاہ عالم میں ہندوستان وارد ہوئے۔ ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں عبداللہ بیگ کے گھر ایسے بچے نے جنم لیا جس نے ... مرزا غالب کی حیثیت سے بڑی شہرت پائی۔ جاگیر پر قبضہ ہونے کے بعد فیروز پور جھرکہ

کی ریاست سے سات سو روپے سالانہ پنشن پر گزارا ہونے لگا۔ غالب کی صغر سنی میں باپ اور چچا کی وفات کے بعد اہم گھریلو ذمہ داریاں مرزا صاحب کے کندھوں پر آ پڑیں جسے تاحیات بڑی خوشدلی سے نبھاتے رہے۔ ۱۳ سال کی عمر میں لوہارو کے مرزا الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے شادی کے بعد گھریلو ذمہ داریاں اور بڑھ گئیں مگر آمدنی میں اضافہ نہ ہوا۔ دہلی کی طرف ہجرت کے بعد حلقہ احباب بھی بڑھ گیا جوانی بھی جوبن پر تھی' خدمت گاروں اور عزیزوں کا مالی بوجھ بھی سر پر تھا' ان حالات میں معمولی پنشن پر گزارا اور پھر وضع داری کو قائم رکھنا غالب ہی کا غالب کمال ہے۔ انتہائی نامساعد حالات میں بھی دوستوں' عزیزوں سے منہ نہ موڑنا غالب کی عظمت کی دلیل ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تین سال کے لیے پنشن کا بند ہو جانا' تین بیٹوں کا صغر سنی میں ہی فوت ہو جانا' ادبی محافل اور شعری مجالس کا ختم ہونا' غدر میں قریبی دوستوں اور عزیزوں کی ہلاکت' قرض خواہوں کا تقاضا یہ سب ایسے تلخ حقائق ہیں جنھوں نے غالب کی زندگی میں انگارے بھر دیئے مگر غالب کے حوصلے کا کمال دیکھیے کہ سب کچھ کمال ضبط سے برداشت کر گئے اور اپنی فطری شوخی اور ظرافت کا دامن نہ چھوڑا اپنی نثر اور نظم میں ایک ایسا منفرد اسلوب چھوڑ گئے جو آج بھی اردو ادب کے محققین اور خوشہ چینوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ "داستان تاریخ اردو" کی طبع دوم میں یہ الفاظ آج بھی درج ہیں کہ اردو ادب پر مرزا غالب کا احسان عظیم ہے انہوں نے خطوط نگاری میں ایک نئی طرح ڈالی انہوں نے القاب و آداب' مزاج پرسی و خیریت نگاری کا قدیم دستور جس سے اعراض کرنا' روا نہ رکھا جاتا تھا' یکسر ترک کر دیا۔ "میرے دل کے چین" بندہ پرور' پیر و مرشد' یار! مار ڈالا تیری جواب طلبی نے' وغیرہ کے الفاظ سے خط کا آغاز کرنا غالب ہی کے لیے مخصوص تھا اور ان کے پیروکار آج تک یہی زبان استعمال کر رہے ہیں جس سے تحریر میں حسن پیدا ہوتا ہے مرزا غالب کی اردو شاعری اور نثر نگاری پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے مگر ان کی فارسی شاعری پر بہت کم اہل علم و دانش نے قلم اٹھایا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب کی فارسی شاعری کا ذکر کیے بغیر اور اس کا مطالعہ کیے بغیر مرزا صاحب کی شاعری پر قلم اٹھانا بہت بڑا ظلم ہے تین چار دہائی پہلے تک غالب کے فارسی اشعار نقل کرنے اور دوران گفتگو استعمال کرنے کا چلن عام تھا مگر اب وہ صورتحال نہیں ہے اس کا اہم سبب فارسی سے ہمارا مجرمانہ اغماض ہے حالانکہ فارسی زبان' اردو کی جڑ ہے اور جڑوں کے بغیر کوئی درخت کھڑا نہیں ہو سکتا' بنیادوں کے بغیر کوئی عمارت نہیں اٹھ سکتی۔ ایران میں شدید عرب دشمنی کے باوجود فارسی میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے عربی پڑھنا اور جاننا ضروری ہے انگریزی' اطالوی اور فرانسیسی ادب پر عبور حاصل کرنے کے لیے یونانی اور لاطینی زبانیں پڑھنا ناگزیر ہے تو فارسی کے بغیر اردو کس طرح پڑھی اور پڑھائی جا سکتی ہے' کس طرح سمجھی جا سکتی ہے۔ نام نہاد نقادوں' دانشوروں اور پروفیسروں نے فارسی سے اپنی جہالت اس طرح چھپائی کہ غالب کے اردو کلام ہی کو پورا غالب قرار دے دیا حالانکہ اپنی ساری نکتہ آفرینیوں اور معجزہ نمائیوں کے باوجود غالب کا اردو کلام محض ایک ٹریلر ہے جبکہ اصل فلم تو اس کا فارسی کلام ہے اس کے فارسی اشعار کی تعداد گیارہ ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے شیفتہ نے غالب کو ظہوری اور عرفی کا ہم پایہ قرار دیا ہے کچھ اہل علم تو یہ رائے رکھتے ہیں کہ برصغیر میں فارسی شاعری کا عہد زریں ایک ترک (امیر خسرو) سے شروع ہو کر دوسرے ترک (غالب) پر ختم ہو گیا۔ غالب ہی کو یہ دعویٰ فریب دیتا ہے کہ

نزول من بہ جہاں بعد یک ہزار و دویست
ظہور خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ!

غالب کا یہ شعر فارسی ادب میں ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

آں ذات پاک مرتبہ دان محمدؐ است

ایک اور جگہ غالب متوازن معاشرے کا خواب دیکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

گلزار را اگر نہ ثمر، گل بہم نہد

درویش را اگر نہ سحر، شام ناں دہد

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے آج کے سکول تفہیم غالب میں کوئی کردار ادا کر سکیں گے؟ کیا اونچے طبقے کے بچے جو انگلش میڈیم سکولوں میں محنت کش بچے کے گر سیکھتے ہیں' غالب کو سمجھ سکیں گے فیوڈلزم اور زبردستی کا شکار ہمارا معاشرہ مرزا غالب کے کلام کا تحفظ کرے گا؟

اگر موجودہ صورتحال برقرار رہی تو فارسی شاعری کی طرح غالب کا اردو کلام بھی قصہ پارینہ بن جائے گا اور مرزا غالب کی روح پاکستان کے گلی کوچوں میں شاید یہ شکوہ کرتی پھرے کہ

ع بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مرزا غالب کی "قاطع برہان" نے لوگوں کو ایسا برافروختہ کر دیا تھا کہ جواب تو خیر در کنار' اکثر زبان درازیوں پر اتر آئے تھے برا بھلا کہتے' گالیاں دیتے اور فحش خط لکھتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کے پاس مولانا حالی بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خط اسی قسم کا آیا مرزا صاحب نے لفافہ مولانا حالی کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ مولانا نے پڑھنا شروع کیا اور ایک جگہ پر خط میں ماں کی گالی بھی لکھی تھی مولانا کو پڑھنے میں تکلف ہوا تو مرزا صاحب نے ان کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور خود پڑھ کر کہنے لگے۔

"کم بختوں کو گالیاں بھی دینی نہیں آتیں۔ بڈھے یا ادھیڑ کو ماں کی گالی نہیں دینی چاہیے بلکہ بیٹی کی۔"

ایک مرتبہ رمضان شریف کا مہینہ ختم ہونے کے بعد مرزا صاحب قلعہ گئے تو بہادر شاہ ظفر نے پوچھا:

"کسے مرزا صاحب! آپ نے کتنے روزے رکھے؟"

مرزا نوشہ نے نہایت ادب کے ساتھ عرض کیا۔

"پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

بیت الحکمت صادق آباد کا گوشہ غالب

گوہر ملسیانی

حصول علم میں قلم اور قرطاس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ فکر انسانی انہیں کے توسط سے محفوظ ہوئی۔ افکار و تجربات کی متاع بے پایاں صدیوں سے انہیں کے ذریعے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہے۔ حکمت سے معمور اذہان اپنی تخلیقات کو انہیں وسائل کے ذریعے پر تاثیر بناتے اور طالبان علم و آگہی کے شعور کو زرخیز کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ یوں کتاب نے جنم لیا اور پھر تعلیم و تعلم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کتب خانے معرض وجود میں آئے۔ علم کی دنیا میں محققین کا کردار افکار کو ایک تسلسل عطا کرنے اور تخلیق کی دنیا کو شاداب بنانے میں بے حد اہم ہے۔ شعور کی پختگی نے کتاب کی اہمیت کو اور اجاگر کیا۔ اس طرح علم دوست صاحبان اقتدار، حکومت کے سربر آوردہ نمائندگان اور خود علمائے کرام نے کتب خانوں کی سرپرستی کرکے ہر دور میں علم و ادب اور فکر و فلسفہ کے طلباء کی پیاس بجھانے کی کوشش کی ہے۔

عصر حاضر میں علوم کی حیرت انگیز ترقی نے کتاب کی ضرورت کو واضح کر دیا ہے۔ ماضی کے علمی خزانے آج بھی علم کے ارتقاء میں اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ حکومتوں نے کتب خانوں کی اہمیت کو سنبھالا دیا اور تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ عوامی سطح پر بھی کتب خانے قائم کیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ صاحبان ثروت اور علم و ادب سے محبت رکھنے والے افراد بھی اس میدان میں اترے۔ اس طرح ذاتی کوششوں سے بھی کئی کتب خانے وجود میں آئے۔

پاکستان بھر میں ایسے کئی کتب خانے موجود ہیں جو شہروں سے لے کر قصبات بلکہ دیہات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ صادق آباد میں بھی ایک ایسا ہی کتب خانہ موجود ہے۔ جو اس علاقے کی ایک اہم شخصیت جناب میر سید زاہد حسین کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ انہوں نے اپنے اس کتب خانے کا نام عباسیہ دور کے بیت الحکمت کے حوالے سے منتخب کیا ہے اور ان کی سعی پیہم واقعی اسے بیت الحکمت کا نام دینے میں حق بجانب ہے۔

بیت الحکمت سے میرا تعلق بھی دس پندرہ سال سے چلا آ رہا ہے۔ اس کتب خانے میں تقریباً" پینتالیس ہزار کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں سینکڑوں نایاب کتب موجود ہیں۔ نقوش صادق کے غالب نمبر کے لیے جناب میر سید زاہد حسین سے اجازت لے کر ان کے شعبہ غالب کا جائزہ لیا تو یہ شعبہ بھی دیگر شعبوں کی طرح بے حد زرخیز نکلا۔

میر صاحب فروری یا مارچ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد میرٹھ سے یہاں تشریف لائے۔ ان کے خاندان میں علم سے محبت اور اس کے فروغ کی جد و جہد کرنے والی شخصیات موجود رہی ہیں۔ تفسیر ابن کثیر کی اشاعت کی سعادت بھی ان کے اجداد کو حاصل ہے۔ ان کے دادا جان میر محمد یٰسین کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ میرٹھ ہی میں وزیر حضوری کرنل ہاشمی کی ایک وقیع لائبریری تھی۔ انہوں نے ایک ایوان اپنی لائبریری کے لیے تعمیر کیا تھا اس میں یہ کتب خانہ تھا مگر پاکستان کی تخلیق کے بعد وہ کتب خانہ بھارت میں رہ گیا۔

میر صاحب سے کتب کے حوالے سے گفتگو ہوئی تو آپ نے بتایا کہ بچپن ہی سے انہیں کتابوں سے محبت تھی۔ آغاز میں سید

امتیاز علی تاج کا پھول ان کے مطالعہ میں رہا۔ میر صاحب نے ماضی کو آواز دیتے ہوئے کہا کہ صادق آباد ایک چھوٹا سا شہر تھا آبادی دس بارہ ہزار ہوگی ان کے گھر زمیندار اخبار آتا تھا۔ جسے گھر میں پڑھا جاتا تھا۔ ان کے والد صاحب کو کتابوں سے بے حد محبت تھی۔ علامہ اقبال اور ظفر علی خاں سے بہت پیار تھا۔ بہارستان چھپی تو ان کے ابا جان خرید کر لائے۔ پھر تمدن ہند بھی ان کے ہاں آئی۔ اس طرح کتابوں کا ذخیرہ شروع ہوا اور انھیں مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔

میر صاحب ایس۔ ای کالج بہاولپور کے طالب علم رہے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد ان کے محبوب استاد تھے۔ بی۔ اے میں داخلہ لیا مگر قائداعظم کے اعلان پر کہ طلباء میدان عمل میں نکل آئیں اور تحریک پاکستان میں شامل ہو جائیں تعلیم چھوڑ کر سیاست میں آگئے۔ قائداعظم کے بے پناہ شیدائی اور محترمہ فاطمہ جناح کے بیٹے کہلانے کو قابل عزت سمجھتے ہیں۔

میر صاحب ۱۲ سال کی عمر سے کتابیں خرید کر پڑھنے کے شائق تھے۔ مولانا محمد علی جوہر' جواہر لال نہرو گاندھی کی کتب بھی ان کے مطالعہ میں آئیں۔ خواجہ حسن نظامی کے طرز تحریر سے بھی متاثر ہوئے۔ ۱۹۳۹ء میں میرٹھ گئے اور نوچندی کے میلے سے جوش کی کتب خرید کر لائے۔ جوش کی ضبط شدہ کتاب "کمپنی کے فرزندوں کے نام" گھر میں چھپ کر پڑھتے تھے۔ یہ شعر آج میر صاحب کی زبان پر ہے۔

کس زبان سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو

دہر میں انسانیت کے نام کو بالا کرو

ادبی مشاہیر بھی میر صاحب کے ہاں تشریف لاتے رہے۔ سید مبارک شاہ کے ساتھ ایم۔ اسلم اور رئیس احمد جعفری آئے۔ رحمٰن کیانی' عبدالقدوس ہاشمی' احمد شاہ نورانی۔ سردار عبدالقیوم خاں' ڈاکٹر ایوب قادری' تقریباً پچاس کے قریب پاکستانی شخصیات تشریف لاتی رہی ہیں۔

میر صاحب کے سیاسی ذوق کو حمید نظامی نے پروان چڑھایا۔ اساتذہ میں ممتا صاحب' اقبال احمد صدیقی' پروفیسر صادق علی' پروفیسر حبیب اللہ اور ڈاکٹر محمد ساجد ان کی محبوب شخصیات ہیں۔ علمی ادبی ذوق ان اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ علمی ذوق رکھنے والے اساتذہ میں محمد سعید لدھیانوی' ڈاکٹر عبداللطیف نقش' منظور احمد منظور قابل ستائش ہیں۔ میر صاحب نے بتایا کہ حمید نظامی نے مولانا صلاح الدین احمد سے متعارف کروایا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سے بھی ملاقات ہوئی۔

کتب خانے کے بارے میں دریافت کیا تو میر صاحب نے بتایا کہ ان کے کتب خانے میں سیاست' اسلامیات' ادبیات' شاعری' تاریخ غرضیکہ ہر پہلو پر کتب موجود ہیں۔ ابو الکلام آزاد' محمد علی جوہر' مولانا عبدالماجد دریابادی' مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی' شبلی نعمانی' ڈپٹی نذیر احمد' مولانا تھانوی' طالب ہاشمی' یوں سمجھیے ہر گوشہ کتابوں سے لبریز ہے۔ اس وقت' سچ' صدق' صدق جدید' الہلال' البلاغ کامریڈ وغیرہ کے مکمل فائیل موجود ہیں۔ علامہ اقبال کا گوشہ بے حد زرخیز ہے۔ مخطوطات بھی اور انگریزی کتب بھی ہیں۔ مولانا جوہر پر بہت سی کتابیں تھیں۔ میر صاحب نے شکوہ کیا ایک صاحب جوہر کے حوالے سے پچاس کے قریب کتب اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے لے گئیں مگر واپس نہ کیں۔ وہ شاکی ہیں کہ انتظامیہ کے افسران اور دیگر شخصیات کتابیں لے جاتی ہیں لیکن مطالعہ کے بعد واپس نہیں کرتیں۔ بلکہ اب تو بہت سی نایاب کتب چوری بھی ہو چکی ہیں۔ اب میر صاحب کی لائبریری مکمل طور پر بند رہتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخم خوردہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کتابیں مختلف ذرائع سے چوری کی جا رہی ہیں۔ اس لیے اب وہ کسی

پر اعتبار نہیں کرتے۔ ایک سوال پر میر صاحب نے جواب دیا کہ مستقبل میں یہ کتابیں کس کے حوالے کروں سب تو لٹیرے ہیں کون سی لائبریری محفوظ ہے۔ میری رائے پر کہ اپنی لائبریری کسی یونیورسٹی کے حوالے کر دیں اس طرح علم و ادب کے طلباء مستفید ہوتے رہیں گے اور آپ کے لیے صدقۂ جاریہ ہوگا۔ میر صاحب خاموش رہے اور کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔

گوشہ غالب کا جائزہ میرا موضوع تھا چنانچہ میر صاحب نے بے حد شفقت فرمائی اور مجھے گوشہ غالب کی کتابیات کو تحریر میں لانے کی اجازت دی۔ میر صاحب نے اپنا ماٹو "کتابیں ہیں چمن اپنا" بنا رکھا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اپنی شاندار کوٹھی میں لائبریری کو چار کمرے دے رکھے ہیں۔ کچھ گوشے ترتیب سے رکھے گئے ہیں مگر اہمی لائبریری کو قرینے سے ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ پینتالیس ہزار کے قریب کتب اور پھر رسالہ جات کا بے پناہ ذخیرہ۔ ایک کمرہ بھرا پڑا ہے۔ کاش میر صاحب اس لائبریری کو طالبان علم و تحقیق کے لیے مفید بنائیں۔

گوشہ غالب کی تفصیل درج ذیل ہے۔ میر صاحب کا کہنا ہے کہ کچھ کتب ابھی ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں یا ان کی پرانی قیام گاہ میں ہیں۔ بہر کیف جن کتب تک میری رسائی ہو چکی ان کا یہاں اندراج کر رہا ہوں تاکہ کسی وقت غالب پر کام کرنے والے محققین کی رہنمائی ہو سکے :۔

تفصیل کتب بیت الحکمت گوشہ غالب

قدیم کتب

۱۔ کلیات غالب فارسی۔ در مطبع خاص نول کشور ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء۔

یہ کتاب پرانی طرز میں چھپی ہوئی ہے ہر صفحہ پر آمنے سامنے مصرعے ہیں درمیان میں اوپر سے نیچے لکیر ہے۔ خط قدرے ویز ہے۔

۲۔ اردو دیوان غالب کی شرح جس کا تاریخی نام "وثوق صراحت" از مولوی محمد عبدالعلی المتخلص بہ والہ۔ مطبع نامی فخر نظامی حیدر آباد دکن۔ کتاب میں غالب کے اشعار کی مختصر شرح ہے آخر میں تاریخی قطعہ درج ہے۔ جس سے تاریخ ۱۳۱۳ھ نکلتی ہے گویا سن عیسوی ۱۸۹۶ء بنتا ہے۔

۳۔ شرح دیوان اردو غالب موسوم بہ "وجدان تحقیق" حصہ اول

خاکسار محمد عبدالواجد المتخلص بہ واجد فارسی مدرس سٹی ہائی اسکول علاقہ سرکار نظام فرزند حضرت والہ مرحوم مصنف وثوق صراحت در مطبع فیض منبع فخر نظامی بمقابل طبع آمد حیدر آباد دکن ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۲ء۔ کتاب کے پہلے ۱۴ صفحات پر مصنف نے اپنے والد مولانا والہ کے علم و فضل اور ان کی کتاب وثوق صراحت کے متعلق لکھا ہے اور اس کا ضمیمہ لکھنے اور صحت نامہ کا تذکرہ درج ہے۔ کچھ فارسی میں قطعات ہیں۔ پھر صفحہ ایک سے شروع کر کے کتاب کا سرنامہ دیا ہے۔

ماشاءاللہ لا قوۃ الا باللہ

حصہ اول ----- باب الالف

وثوق صراحت موسوم بہ وجدان تحقیق

اس ضمیمہ کو خاکسار محمد عبدالواحد' واحد تخلص فرزند مولانا مولوی محمد عبدالعلی والہ مرحوم مدرس گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول حیدر آباد دکن نے تصنیف کیا۔
مطبع نامی گرامی فخر نظامی واقع حیدر آباد دکن میں طبع ہوا۔
صفحہ ۲ سے شرح شروع ہوجاتی ہے اور ردیف الف سے آغاز ہے جو صفحہ ۱۳۷ پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔ پھر مصنف کی فارسی غزل ہے۔ کل صفحات ۱۳۳ ہیں۔

۴۔ یادگار غالب مرتبہ الطاف حسین حالی۔ نامی پریس کانپور میں چھپی (محمد اللہ رعد) حسب ضابطہ رجسٹری کرائی گئی۔ ۱۸۹۷ء

صفحہ ۱ = جناب مرزا یعنی اسد اللہ خاں متخلص بہ غالب دہلوی کی زندگی کے حالات اور ان کی اقسام نظم و نثر اردو و فارسی کا انتخاب اور ہر قسم پر جداگانہ ریمارکس مرتبہ خاکسار الطاف حسین پانی پتی۔
صفحہ ۲۔ خالی ہے' صفحہ۔ ۳' ۴ پر فہرست۔
صفحہ ۵۔ غالب نام آورم و نشانم مپرس + ہم اسد للہم و ہم اسد الہیم
شبیہ مبارک نجم الدولہ دبیر الملک جناب مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب مرحوم پھر صفحہ ۱ تا ۸۔ دیباچہ'
صفحہ ۹۔ آغاز کتاب' حاشیے کے باہر عنوانات درج ہیں۔
صفحہ ۱۰۶ سے دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

مرزا کے کلام پر ریویو اور اس کا انتخاب

دیباچہ اور آغاز کتاب کے اوپر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تحریر ہے۔ کل صفحات ۴۱۹ ہیں۔
صفحہ ۱۶۸۔ قطعات' ۱۷۱۔ رباعیات۔ ۱۷۴' نثر اردو۔ ۱۹۷۔ نظم و نثر فارسی
۲۰۵۔ انتخاب غزلیات فارسی۔ ۲۷۱ صفحہ سے نظیری اور غالب کے اشعار کا تقابلی جائزہ ۲۸۰ سے ظہوری اور غالب۔ ۲۸۶ سے رباعیات فارسی۔ ۲۹۶ سے قصائد۔ ۳۲۳ سے قطعات ۳۲۵ سے نثر فارسی نظم کا مقابلہ نظیری نیشاپوری شاعر دور اکبری۔
۳۲۹ سے نثر فارسی کا انتخاب از مہر نیمروز۔ ۳۶۵ سے انتخاب از دستنبو۔ ۳۶۹ سے از دیباچہ ثانی درفش کاویانی۔ ۳۷۲ سے تقریظات و دیباچہ ہائے دیوان فارسی' دیباچہ دیوان تفتہ ۳۷۸ سے تقریظ تذکرہ گلشن بے خار۔ ۳۷۹ سے انتخاب از مکاتیات
۴۱۱ سے ظہوری اور غالب کی نثر اور مثنوی کا مقابلہ۔ ۴۱۳۔ شیخ علی حزیں اور مرزا کے طرز بیان کا مقابلہ۔ ۴۱۶ سے مرزا غالب اور ابوالفضل کے طرز بیان کا مقابلہ۔
صفحات ۴۲۰ تا ۴۳۸ اور کتاب کا حصہ ہیں لیکن اس نسخہ میں نہیں ہیں۔

۵۔ مہرنیم روز ۱۳۳۳ھ' مطبع نامی منشی نو لکشور لکھنؤ

۶۔ دیوان غالب اردو مع سوانح عمری نظامی بدایونی۔ نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۵ء۔ دیوان غالب اردو بہ طرز جدید و بہ تصحیح مزید مع دیباچہ و سوانح عمری حضرت مصنف۔ از خاکسار نظامی بدایونی۔
نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوا ۱۹۱۵ء صفحات ۲۹۴۔ آخر میں صحت نامہ ہے جو ردیف وار مرتب کیا گیا ہے۔ دیباچہ میں

لکھتے ہیں۔
"اب سے پہلے چند در چند ایڈیشن دیوان غالب کے چھپ چکے ہیں۔ جن میں سے ۳ نسخے ایسے ہیں جو مرزائے مرحوم کی زندگی میں شائع ہوئے ہیں اور ایک آدھ کی تصحیح بھی مرزا سے منسوب کی گئی ہے۔ ان کے سوا چار پانچ نسخے متفرق مطبعوں سے نکلے ہیں۔ نیز دو تین شراح نے بذیل شرح دیوان کا بڑا حصہ چھاپ دیا ہے۔ مگر ان سب مطبوعہ نسخوں میں کوئی نسخہ ایسا نہیں دیکھا گیا جو کم از کم دس پانچ فاحش غلطیوں کا حامل نہ ہو۔ ایسی صورت میں کہ خود مرزا کی زندگی میں دیوان شائع ہوا اور واقفین فن شرح کے ساتھ ان کا کلام چھپا، میں پھر بھی ایک نہیں بیسیوں غلطیوں کا رہ جانا تعجب کی بات ہے۔
غالب' فارسی بکاری وزارت فرہنگ و ہنر شنبہ دہم اسفند ۱۳۴۷ھ '۱۹۱۸ء
دیوان غالب (حبیبی) مرتبہ شیخ عبدالقادر گلزار محمدی سٹیم پریس لاہور میں چھپوایا ۸۔ جنوری ۱۹۱۹ء
ارودئے معلی حصہ اول مع دوم از غالب۔ انوار المطابع لکھنؤ نمبر ۳' ۱۲۸۵ھ '۱۹۲۲ء
(اس میں ہجری سن غلط درج کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۲ء کے مطابق ۱۳۴۱ھ بنتا ہے)
دیوان غالب (حبیبی) شیخ الٰہی بخش ولد محمد جلال الدین تاجران کتب کشمیری بازار لاہور۔ ۱۳۴۲ھ '۱۹۲۳ء
یادگار غالب' مرتبہ حالی۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور۔ ۱۹۲۳ء
کلیات غالب فارسی۔ در مطبع خاص منشی نو کشور لکھنؤ رونق افزائی طبع شد ۱۹۲۵ء
.مہر نیم روز بہ تصحیح و تحشی سید اولاد حسین شاداں بلگرامی پروفیسر اورینٹل کالج لاہور' شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور' ۱۹۲۵ء
حاشیہ کے باہر فارسی میں فارسی الفاظ کی تصحیح اور وضاحت ہے۔ پھر حاشیہ میں مصادر کے معانی فارسی مترادف مصادر میں درج کیے گئے ہیں اور معنی بھی ہیں۔ صفحہ ۱۲۵' ۱۲۶ پر فرہنگ ہے اور ۱۲۷ تا ۱۳۲ اردو میں غالب کے حالات ہیں۔ آخری صفحہ پر یکم جنوری ۱۹۲۵ء درج ہے۔ قیمت صرف ۸ (آٹھ آنے) ہے۔ سرورق کی پشت سے کتاب کا آغاز ہے اوپر صرف بسم اللہ درج ہے۔ ہر صفحہ کے اوپر ایک کونے پر مہ نیمروز اور دوسرے پر کلیات نثر غالب تحریر ہے۔
غالب امرتسر' مارچ' اپریل' مئی' جون ۱۹۲۷ء۔ مدیر میرزا شجاع مروی
یہ تین رسالے ہیں۔ ہر پرچے کی پیشانی پر "اردو کی علمی و ادبی دلاویزیوں کا ماہوار مجموعہ" درج ہے۔
(الف) غالب امرتسر۔ مارچ ۱۹۲۷ء جلد اول نمبر ۳۔ دفتر غالب شجاعت منزل امرتسر (نو روز نمبر)
اس کے مضامین =
۱۔ غالب کا مذہب از میرزا شجاع مروی ص ۳
۲۔ شعرائے ہم عصر غالب کا اثر از مولانا گوہر صاحب رامپوری' ص ۹
۳۔ بہار (نظم) مرزا غالب' ص ۱۲
۴۔ غالب کی فارسی غزلیات' از میرزا شجاع مروی ص ۱۷
۵۔ شرح غالب از حکیم فیروز الدین احمد طغرائی مدیر وکیل ص ۳۲

۶۔ ستائش حسن (نظم) از مرزا بیضا خاں ص ۳۴
۷۔ غزل گرامی جالندھری، ص ۵۰
۸۔ بہار (نظم) سر محمد اقبال (پیام مشرق) ص ۶۱
۹۔ انتخاب غزلیات اردو، مدیر، انتخاب غزلیات فارسی از مدیر ص ۵۶
(ب) غالب امرتسر، اپریل، مئی، جلد اول شمارہ نمبر ۵، ۶
مضامین =
۱۔ غالب کی ابتدائی مشق، علامہ علی میر طباطبائی ص ۴
۲۔ شرح غالب، حکیم فیروز الدین احمد طغرائی، ص ۷
۳۔ شعرائے ہمعصر پر غالب کا اثر از مولانا ذوالفقار علی خاں گوہر ص ۱۰
۴۔ مرزا غالب مرحوم (نظم) از راحت سرحدی ص ۵۱
۵۔ غالب و آزردہ از مدیر ص ۷۰
(ج) غالب امرتسر، ماہ جون ۱۹۲۷ء شمارہ ۷، جلد اول
مضامین =
۱۔ غالب (نظم) مولانا وحشت (رضا علی) ص ۴
(شذرات میں مولانا غلام قادر گرامی جالندھری کی وفات کو زبان فارسی کا نقصان کہا ہے)
۲۔ مرزا غالب کا کلام اردو و فارسی از حافظ محمود خاں شیرانی ص ۵
۳۔ شعرائے ہم عصر پر غالب کا اثر از مولانا گوہر، ص ۱۲
۴۔ انتخاب غزلیات اردو و فارسی، ص ۲۳، ۲۴
۵۔ شرح غالب از فیروز الدین احمد طغرائی۔ ص ۳۱

مرقع چغتائی دیوان غالب اثر چغتائی۔ پیش لفظ انگریزی میں ڈاکٹر محمد اقبال، ۱۹۲۸ء
غالب۔ ڈاکٹر سید عبد اللطیف، جہانگیر بک ڈپو، کھاری باؤلی، دہلی ۱۹۲۸ء
مکمل اردوئی معلی مجموعہ رقعات غالب۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور ۱۹۳۰ء
دیوان غالب، عکسی رنگین ----- تاج کمپنی لیمٹڈ لاہور۔ ۱۹۳۰ء
یادگار غالب، مرتبہ حالی۔ شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور ۱۹۳۲ء
نگار، غالب کی شوخیاں نمبر مدیر نیاز فتح پوری جنوری ۱۹۳۲ء
محاسن کلام غالب (اردو) نوشتہ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم، مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) طبع ثالث ۱۹۳۵ء
صحیفہ غالب از طارق، دار التالیف ہند، کی دروازہ لاہور۔ ۱۹۳۵ء

۲۲۔ نقش چغتائی۔ دیوان غالب مصور' جہانگیر بک ڈپو کلب لاہور چابکسواراں ۱۹۳۵ء
نذر۔ غالب کے نسخہ حمیدیہ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں اپنی اس کوشش کو افتخار الملک ہزہائینس' نواب حمید اللہ خاں بہادر فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہ' کی علم دوستی و ادب نوازی کو نہایت خلوص کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔ محمد عبدالرحمن چغتائی۔

۲۳۔ غالب نامہ۔ شیخ محمد اکرام ------ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ۱۹۳۶ء
۲۴۔ مکاتیب غالب' مرتبہ امتیاز علی عرشی۔ مطبع قیمیہ بمبئی (ریاست رامپور) ۱۹۳۷ء
۲۵۔ روح غالب۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین زور' ادارہ رفعت منزل خیریت آباد حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء
۲۶۔ مرزا غالب کا روزنامچہ' خواجہ حسن نظامی' حسین نظامی اینڈ سنز ایڈیٹر منادی دہلی۔ ۱۹۴۰ء
۲۷۔ سوانح غالب۔ غلام رسول مہر' شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۴۱ء
۲۸۔ خطوط غالب۔ مجموعہ مہیش پرشاد۔ نظر ثانی عبدالستار صدیقی۔ پہلی جلد' ہندوستان اکیڈیمی صوبہ متحدہ' الہ آباد ۱۹۴۱ء
۲۹۔ انتخاب غالب۔ امتیاز علی عرشی' مطبع قیمہ بمبئی ۱۹۴۲ء
۳۰۔ انتخاب غالب۔ عبدالرزاق' اقبال اکیڈیمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور ۱۹۴۳ء
۳۱۔ فلسفہ کلام غالب۔ شوکت سبزواری' قومی کتب خانہ بریلی ۱۹۴۶ء
۳۲۔ مکاتیب غالب۔ چوتھا نسخہ ۱۹۴۶ء
۳۳۔ غالب' غلام رسول مہر' شیخ مبارک علی لاہور' ۱۹۴۶ء

۱۹۴۷ء

۳۴۔ متفرقات غالب' سید مسعود حسن رضوی' ہندوستان پریس لاہور
۳۵۔ فرہنگ غالب۔ امتیاز علی خاں عرشی' کتاب خانہ لاہور
۳۶۔ مکاتیب غالب۔ ایضاً"

تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان بھارت میں شائع ہونے والی کتب

۱۹۴۹ء

۱۔ نادرات غالب' آفاق حسین آفاق' ادارہ نادرات نیپئر روڈ کراچی

۱۹۵۰ء

۲۔ ذکر غالب' مالک رام' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر دہلی
۳۔ سرگزشت غالب۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور' ادارہ ادبیات اردو لاہور

۱۹۵۲ء

نگارشات غالب، پروفیسر عبدالرزاق جمالی، ملک نذیر احمد تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور

۱۹۵۷ء

مطالعہ غالب، اثر لکھنوی، دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔
دیوان غالب، سید امیر حسین نورانی، رام کمار پریس بک ڈپو لکھنؤ۔
تلامذۂ غالب، مالک رام، مرکز تصنیف و تالیف نکودر۔

۱۹۵۸ء

غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی ۳۔ چوتھا ایڈیشن۔
دیوان غالب معہ شرح مرتبہ جوش ملسیانی، آتما رام اینڈ سنز دہلی

۱۹۵۹ء

نکات غالب، نظامی بدایونی، نظامی بک ایجنسی بدایوں۔ یو۔ پی۔ انڈیا
قادر نامہ غالب، مرتب تحسین سروری، مکتبہ نیا راہی کراچی
شرح دیوان غالب۔ یوسف سلیم چشتی، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور

۱۹۶۰ء

کلام غالب نسخہ قدوائی، جلیل قدوائی، ادارہ نگارش و مطبوعات کراچی۔
مقام غالب، سید مبارز الدین رفعت، سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدر آباد دکن۔
فکر غالب، پرتھوی چندر، نیو تاج آفس، اردو بازار، دہلی
اردوئے معلی غالب نمبر، خواجہ احمد فاروقی، شمارہ اول۔

۱۹۶۱ء

غالب فکر و فن، ڈاکٹر شوکت سبزواری، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی
غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ خلیق انجم، مکتبہ شاہراہ دہلی۔
ماہنامہ تحریک دہلی، غالب نمبر، انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی۔

۱۹۶۲ء

یادگار غالب، خواجہ الطاف حسین حالی، اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔

۱۹۶۳ء

۲۱۔ غالب اور دوسرے مضامین' نظیر حسنین زیدی' مسعود اکادمی ناظم آباد ۳ کراچی
۲۲۔ کلیات غالب اردو' خاں اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی' مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور
۲۳۔ یادگار غالب' خواجہ الطاف حسین حالی' مجلس ترقی اردو لاہور

۱۹۶۵ء

۲۴۔ دیوان غالب مصور' حنیف رامے' نیا ادارہ لاہور
۲۵۔ شرح دیوان غالب' حسرت موہانی' الکتاب کراچی۔
۲۶۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے' اکبر علی خار' کتاب کار پبلی کیشنز رامپور' یو۔ پی۔
۲۷۔ مرزا غالب کی شوخیاں' مولانا عبدالباری آسی۔ مکتبہ دین و ادب کچا احاطہ لکھنؤ۔

۱۹۶۶ء

۲۸۔ اصلاحات غالب' علی حیدر طباطبائی' مرتبہ محمد عبدالرزاق' راشد' عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن۔
۲۹۔ مرقع غالب' مرتبہ پرتھوری چندر' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

۱۹۶۷ء

۳۰۔ احوال و نقد غالب' محمد حیات خاں سیال' نذر سنز لاہور
۳۱۔ بیان ادب شمارہ دوم مئی ۶۷' مرتضیٰ حسین فاضل (دیوان غالب کی ایک نادر قلمی شرح) دفتر بیان ادب D-۳۷۹۶
اندرون لوہاری دروازہ لاہور۔
۳۲۔ عود ہندی۔ مرتب سید مرتضیٰ حسین فاضل' مجلس ترقی ادب لاہور
۳۳۔ کلیات غالب فارسی' ایضاً"
۳۴۔ عکسی دیوان غالب' غلام رسول مہر' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور
۳۵۔ محاورات غالب' نریش کمار شاد' انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔
۳۶۔ روح المطالب فی شرح دیوان غالب' شاداں بلگرامی مرحوم' شیخ مبارک علی لاہور
۳۷۔ سرگزشت غالب' مرزا محمد بشیر' پائنیر پریس کمرشل ایریا۔ پی۔ ای' سی' ایچ سوسائٹی کراچی

۱۹۶۸ء

۳۸۔ تماشائے اہل کرم' مرتبہ مرزا ظفر الحسن' ادارہ یادگار غالب کراچی۔
۳۹۔ غالب کون ہے؟۔ سید قدرت نقوی' دانش کدہ حسین آگاہی ملتان۔
۴۰۔ غالب اور آہنگ غالب' ڈاکٹر سید یوسف حسین خاں' غالب اکیڈمی نئی دہلی۔

سرود غالب، مرتبہ یوسف بخاری دہلوی، دیباچہ، خاتمہ اور روشنی، سید مرتضیٰ حسین فاضل، شیخ مبارک علی لاہور۔
مقام غالب، عبدالصمد صارم، ادارہ علمیہ انار کلی لاہور۔

۱۹۶۹ء

نامہ ہائے فارسی، غالب، سید اکبر علی ترمذی، غالب اکیڈمی دہلی نو۔
محاسن کلام غالب، نذیر احمد، مکتبات لاہور۔
مفہوم غالب، صاحبزادہ احسن علی خاں، مکتبہ میری لائبریری لاہور۔
کلیات غالب فارسی (غزلیات)، تحقیق سید وزیر الحسن عابدی، مکتبہ میری لائبریری لاہور۔
غالب دیاں غزلاں، دلشاد کلانچوی، مکتبہ میری لائبریری لاہور۔
قصائد و مثنویات فارسی مرزا غالب، مطبوعات مجلس یادگار غالب پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
افادات غالب، تحقیق سید وزیر الحسن عابدی،------ایضاً"------
قادر نامہ از غالب------ایضاً"------
مہرنیم روز از غالب------ایضاً"------
قطعات و رباعیات، ترکیب بند وغیرہ از غالب------ایضاً"------
غزلیات فارسی مرزا غالب------ایضاً"------
سبد چیں، سید وزیر الحسن عابدی------ایضاً"------
دستنبو، «۱» غالب------ایضاً"------
دیوان غالب، تحقیق حامد علی خاں------ایضاً"------
خطوط غالب جلد دوم (۳)------ایضاً"------
اشاریہ غالب مرتبہ سید معین الرحمٰن------ایضاً"------
پنج آہنگ مرزا اسد اللہ خاں غالب------ایضاً"------
درفش کاویانی، غالب------ایضاً"------
غالب ذاتی تاثرات کے آئینے میں، (مختلف ادباء)---ایضاً"۔
بین الاقوامی غالب سیمینار مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسن خاں، صد سالہ یادگار غالب کمیٹی نئی دہلی۔
دیوان غالب، مرتبہ مالک رام------ایضاً"------
دستنبو، غالب------ایضاً"------
بزم غالب، عبدالرؤف عروج---- ادارہ یادگار غالب کراچی
دود چراغ محفل، سید حسام الدین راشدی------ایضاً"------
غالب سب اچھا کہیں جسے، پروفیسر کرار حسین------ایضاً"------

۲۶۔ غالب نما' ۱۹۴۷ء تا ۱۹۶۸ء پاکستانی مطبوعات کا اشاریہ' مرتب ابن حسن فقیر--------ایضاً"--------

۲۷۔ غالب کا فسوخ' مرتب مسلم ضیائی'--------ایضاً"--------

۲۸۔ پنج آہنگ فارسی' خطوط کا ترجمہ' محمد عمر مہاجر--------ایضاً"--------

۲۹۔ تلاش غالب' نثار احمد فاروقی' (مرزا غالب کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط' نو دریافت کلام) کتابیات لاہور

۳۰۔ دیوان غالب' مرتبہ سردار احمد جعفری (ہندی) "اصل اشعار ناگری رسم الخط میں ہیں' اردو دیباچہ کا ہندی میں ترجمہ ہے۔ اشعار ایک صفحہ اردو' ایک صفحہ ناگری" ہندوستانی بک ٹرسٹ باز بلڈنگ بمبئی

۳۱۔ باقیات غالب' وجاہت علی سندیلوی' نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔

۳۲۔ غالب کے رومان' ڈاکٹر عارف بٹالوی' الفلاح پبلی کیشنز اردو بازار لاہور۔

۳۳۔ نظر غالب' وحید قریشی' سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔

۳۴۔ دیوان غالب نسخہ طاہر' تمہید و تعارف' گوہر نوشاہی۔ ایضاً"۔

۳۵۔ انتخاب غالب' مشرف انصاری--------ایضاً"--------

۳۶۔ غالب تصویر کا دوسرا رخ' تجسس اعجازی' دارالاحباب' ۱۲ ناوان محل روڈ لکھنؤ۔

۳۷۔ غالبیات' عبدالقوی دسنوی' نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔

۳۸۔ بھوپال اور غالب' عبدالقوی دسنوی' شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال۔

۳۹۔ غالب اردو کلام کا انتخاب' محمد مجیب' مکتبہ جامعہ لیٹڈ نئی دہلی۔

۴۰۔ غالب ایک مطالعہ۔ ممتاز حسن' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۴۱۔ غالب نام آور' (سہ ماہی اردو کے مضامین کا انتخاب)--------ایضاً"--------

۴۲۔ ہنگامہ دل آشوب' سید قدرت نقوی'--------ایضاً"--------

۴۳۔ مہرنیم روز ترجمہ سید عبدالرشید فاضل'--------ایضاً"--------

۴۴۔ غالب اور ابوالکلام' عتیق صدیقی' مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی۔

۴۵۔ غالب کی تخلیقی تخیل' شہید صفی پوری' ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔

۴۶۔ دستنبو' مترجم مخمور صدیقی' الکتاب کراچی۔

۴۷۔ اردو ڈرامہ' مرزا غالب' منجو قمر' نگاہ پبلی کیشنز بیگم بازار حیدر آباد۔

۴۸۔ عیار غالب' مالک رام' علمی مجلس دلی

۴۹۔ دبستان غالب' ناصرالدین ناصر' مکتبہ الفتح شارع علامہ اقبال لاہور۔

۵۰۔ تصویر خیال' ابرار سلطان قدوائی' قدوائی پبلی کیشنز' ٹیا محل دہلی۔

۵۱۔ ۱۹۶۹ء وفات غالب کا سواں سال' مرتب اشرف قدسی' ادارہ معاشرتی بہبود ساہیوال۔

۵۲۔ ڈائری یونائیٹڈ بنک' تصاویر صادقین' صد سالہ ۱۸۶۹ء تا ۱۹۶۹ء۔

۵۳۔ دیوان غالب نسخہ شیرانی' مجلس ترقی ادب لاہور۔
۵۴۔ دیوان غالب نسخہ حمیدیہ------ایضاً"------

۱۹۷۰ء

۱۔ غالب نام آورم' نادم سیتاپوری' سنگ میل لاہور۔
۲۔ نقش غالب' اسلوب احمد انصاری' غالب اکیڈمی نئی دہلی۔
۳۔ غالب شاعر امروز و فردا' ڈاکٹر فرمان فتح پوری' اظہار سنز لاہور۔
۴۔ شہنشاہ سخن' ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی' مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی۔
۵۔ جشن غالب' حضرت اور میرٹھ' حکیم سیف الدین احمد' روٹری ملک میرٹھ۔
۶۔ ماہ نو غالب نمبر' مطبوعات پاکستان لاہور۔

۱۹۷۱ء

۱۔ غالب اور فرہنگ غالب' ڈاکٹر یوسف حسین خاں' غالب اکیڈمی نئی دہلی۔
۲۔ یادگار حالی' مرتب مالک رام' مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' دہلی۔
۳۔ قومی زبان' غالب نمبر' انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔
۴۔ نقوش غالب نمبر ۳۔ محمد طفیل' ادارہ فروغ اردو لاہور۔
۵۔ ماہ نو غالب نمبر' مطبوعات پاکستان لاہور۔

۱۹۷۲ء

۱۔ غالب ۔بیلو گرافی' ڈاکٹر محمد انصار اللہ' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
۲۔ مشکلات غالب' نیاز فتح پوری' نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔
۳۔ غالبیات کے چند مباحث' ابو محمد سحر' نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔
۴۔ غالب اور ذکاء' ضیاء الدین احمد شکیب' غالب اکیڈمی نئی دہلی۔
۵۔ غالب کی تہذیبی شخصیت' جیلانی کامران' خالد اکیڈمی راولپنڈی۔
۶۔ ماہ نو غالب نمبر' مطبوعات پاکستان۔

۱۹۷۳ء

۱۔ تعبیر غالب' نیر مسعود' کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔

۱۹۷۴ء

۱۔ غالب اور انقلاب ستاون' ڈاکٹر سید معین الرحمن' سنگ میل لاہور۔

۱۹۷۵ء

۱۔ غالب اور سرور' ایم حبیب خاں' انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی۔
۲۔ سہ ماہی غالب' ادارہ یادگار غالب کراچی۔

۱۹۷۶ء

۱۔ دیوان غالب' مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن' شیرا اکیڈی لاہور۔
۲۔ سہ ماہی غالب' ادارہ یادگار غالب کراچی۔

۱۹۷۷ء

۱۔ فسانہ غالب' مالک رام' مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔
۲۔ دعائے صباح از غالب' مرتبہ کالیداس گپتا رضا' ول ہیلی کیشنز بمبئی۔
۳۔ فیضان غالب' عرش ملسیانی' غالب اکیڈمی نئی دہلی۔
۴۔ غالب اور فن تنقید' اخلاق حسین عارف' ایضاً۔
۵۔ سہ ماہی غالب' ادارہ یادگار غالب کراچی۔
۶۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں حصہ اول' سید صباح الدین عبدالرحمن' معارف پریس اعظم گڑھ ششماہی غالب' ادارہ یادگار غالب کراچی۔

۱۹۷۸ء

۱۔ دیوان غالب' مرتبہ مالک رام' دیوان غالب کا یہ نسخہ مطبع نظامی کانپور کے نسخے پر مبنی ہے جو ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ غالب کا سب سے آخری صحیح کردہ متن ہے اور اس میں کلام بھی سب سے زیادہ ہے۔

۱۹۷۹ء

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں حصہ دوم' صباح الدین عبدالرحمن' معارف پریس اعظم گڑھ۔
۲۔ غالب کے نئے خطوط' انور سدید' مکتبہ اردو زبان' ریلوے روڈ سرگودھا۔

۱۹۸۰ء

۱۔ غالب کے معنوی اساتذہ' ظفر ادیب' مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ نئی دہلی۔
۲۔ غالب کون ہے؟ سید محمد مہدی' نئی آواز جامعہ نگر' نئی دہلی۔

۱۹۸۱ء

۱۔ غالب اور صفیر بلگرامی، مشفق خواجہ، عصری مطبوعات کراچی۔

۱۹۸۲ء

۱۔ غالب اور عصر غالب، ڈاکٹر محمد ایوب قادری زور، غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی۔

۱۹۸۳ء

۱۔ مثنویات غالب اصل فارسی مع اردو ترجمہ، ظ، انصاری، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔
۲۔ غالب، شخص اور شاعر، مجنوں گورکھپوری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

۱۹۸۴ء

۱۔ تفتہ اور غالب، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری، غالب اکیڈمی نئی دہلی۔

۱۹۸۵ء

۱۔ مطالعہ خطوط غالب، عبدالقوی دستوی، نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔
۲۔ محاسن کلام غالب، عبدالرحمن بجنوری، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ۔
۳۔ گفتار غالب، مالک رام، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔
۴۔ مراۃ الغالب، شرح دیوان اردو، سید وحید الدین بیخود جانشین داغ، عثمانیہ بکڈپو کلکتہ۔

۱۹۸۶ء

۱۔ احوال غالب، پروفیسر مختار الدین احمد، انجمن ترقی اردو ہند دہلی
۲۔ غالب ایک مطالعہ، ممتاز حسین نصرت پبلشرز امین آباد لکھنؤ
۳۔ غالب اور اقبال کی متحرک جمالیات، یوسف حسن خاں (مرحوم) نگارشات لاہور
۴۔ دیوان غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی
۵۔ غالب کا جہاں اور، انور سدید، کاروان ادب ملتان لاہور

۱۹۸۷ء

۱۔ جناب غالب کا ایک باب تحقیق کی روشنی میں، ڈاکٹر ملک حسن اختر، مکتبہ عالیہ لاہور
۲۔ غالب کا فن، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ادارہ ادب و تنقید لاہور
۳۔ مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات، شکیل الرحمان، معصوم پبلی کیشنز کشمیر یونیورسٹی برہنگہ،

۱۹۸۸ء

۱۔ غالب اور اقبال' ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف' بکن بکس گلگشت ملتان
۲۔ غالب کون ہے؟ شریف الحسن' نگارشات لاہور
۳۔ ششماہی غالب' ادارہ یادگار غالب کراچی

۱۹۸۹ء

۱۔ غالب رائل پارک میں' اے حمید' فیروز سنز لاہور۔
۲۔ غالبیات رسالہ نقوش میں ذخیرہ! نائیلہ انجم' الفیصل لاہور۔
۳۔ انتخاب خطوط غالب مرتبہ خلیق انجم' مونو مینٹل پبلشرز نئی دہلی۔
۴۔ غالب کا علمی سرمایہ' ڈاکٹر سید معین الرحمن نے یونیورسل بکس اردو بازار لاہور۔
۵۔ ششماہی غالب' ادارہ یادگار غالب کراچی۔

۱۹۹۰ء

۱۔ توضیحی و تشریحی کتابیات غالبیات' سجاد احمد لاڑ' فہیم اکیڈمی راجن پور۔
۲۔ غالب شکن اور یگانہ' ڈاکٹر نجیب اختر' کاروان ادب اردو بازار لاہور۔
۳۔ غالب اور تصوف' سید محمد مصطفیٰ صابری' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔
۴۔ غالب پر چند تحریریں' ڈاکٹر سادت علی صدیقی' انجمن ترقی اردو ہند' نئی دہلی
۵۔ عظمت غالب' عبدالمغنی' انجمن ترقی اردو ہند دہلی۔
۶۔ غالب کی راہگذر' واحد سحری' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔

۱۹۹۱ء

۱۔ مطالعہ غالب' ڈاکٹر گوہر نوشاہی' مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور۔
۲۔ غالب سے اقبال تک جلد دوم' ایم حبیب خاں' عبدالحق اکادمی دہلی۔

۱۹۹۲ء

۱۔ ششماہی غالب' اردو یادگار غالب کراچی۔
۲۔ غالب پریشاں' انیس ناگی' جمالیات ۲۲ گنگا رام مینشن' روڈ لاہور۔
۳۔ غالب اور اردو غزل' عبدالرحمن عباسی چریا کوٹی' نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔
۴۔ اوراق معانی فارسی خطوط' مترجم ڈاکٹر تنویر احمد علوی' اردو اکادمی دہلی۔

۵۔ اشاریہ خطوط غالب جلد اول' مرتبہ ہما اخلاق' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور۔

۱۹۹۳ء

۱۔ اشاریہ خطوط غالب جلد دوم' مرتبہ ساجدہ پروین' شعبہ اردو گورنمنٹ کالج لاہور۔
۲۔ غالب کے خطوط' (۱) مرتبہ خلیق انجم' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔
۳۔ غالب کے خطوط' (۲)-----ایضاً"-----
۴۔ غالب کے خطوط (۳)-----ایضاً"-----
۵۔ غالب کے خطوط (۴)-----ایضاً"-----

۱۹۹۴ء

۱۔ غالب اور مطالعہ غالب' ڈاکٹر عبادت بریلوی ادارہ ادب و تنقید لاہور۔
۲۔ غالب کے نکتہ ہیں' سجاد مرزا' فروغ ادب اکادمی گوجرانوالہ۔
تجزیاتی مطالعہ غالب نامہ' مرتبہ عاصمہ اعجاز' الوقار پبلی کیشنز لاہور۔

۱۹۹۵ء

۱۔ لطائف غیبی از مرزا غالب' مرتبہ ڈاکٹر سیف' الوقار پبلی کیشنز لاہور۔
۲۔ غالب اور عصر غالب' ڈاکٹر محمد ایوب قادری غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی۔
۳۔ غالب شناسی کے کرشمے' افتخار احمد مدنی' پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور۔
۴۔ نقوش غالب' مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن' الوقار پبلی کیشنز لاہور۔
۵۔ نقد غالب' مرتبہ پروفیسر مختار الدین احمد' ایضاً"۔

۱۹۹۶ء

۱۔ وقار غالب' پروفیسر سید وقار عظیم' مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمن' الوقار پبلی کیشنز لاہور۔
۲۔ بیان غالب' شرح دیوان غالب' تالیف آغا محمد باقر' مکتبہ عالیہ لاہور
۳۔ دیوان غالب' فضلی سنز اردو بازار کراچی۔
۴۔ ماہنامہ تخیل لاہور' مدیر طارق سلطان ماوراء پبلشرز بہاولپور روڈ لاہور

۱۹۹۸ء

۱۔ غالب شناسی اور نیاز و نگار' مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر' الوقار پبلی کیشنز لاہور'
۲۔ قومی زبان غالب نمبر دو صد سالہ جشن و صدرت' انجمن ترقی اردو کراچی

۳۔ ماہ نو' غالب نمبر' مطبوعات پاکستان حبیب روڈ لاہور

س۔ن

۱۔ کلیات نثر غالب' مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔

۲۔ مومن و غالب' حکیم سید اعجاز احمد سجز سہوانی' نظامی پریس ادیب منزل فیض آباد

۳۔ عود ہندی۔ مہر غالب' مجموعہ رقعات غالب' مطبع انوار احمد اللہ آباد

۴۔ مرزا غالب کے لطیفے' ترتیب ہادی حسن' عابد بک ڈپو' فرید مارکیٹ کراچی

۵۔ تشریح دیوان غالب (سرورق نہیں ہے)

۶۔ حافظ و غالب' چوہدری نبی احمد باجوہ' ۱۳۔ اے گورنمنٹ کوارٹرز چوبرجی لاہور

۷۔ حل کلیات اردو مرزا غالب' حافظ احمد حسن شوکت' مطبع شوکت المطابع میرٹھ

۸۔ دیوان غالب مع شرح' مولانا غلام رسول مہر' حق برادرز انار کلی لاہور

۹۔ عود ہندی' مرزا غالب' شیخ الٰہی بخش کشمیری بازار لاہور

۱۰۔ نوائے سروش یعنی دیوان غالب مع شرح از غلام رسول مہر' شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

۱۱۔ غالب کے لطیفے' انتظام اللہ شہابی' فرینڈز پبلشرز اردو بازار کراچی۔

۱۲۔ دیوان غالب جدید' نسخہ حمیدیہ۔۔۔۔۔بھوپال

۱۳۔ اردوئے معلیٰ ہر دو حصہ' حکیم حافظ احمد' شیخ ظفر محمد اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

۱۴۔ عود ہندی' مطبع نامی منشی نول کشور' لکھنؤ

۱۵۔ خطوط غالب جلد اول مرتبہ غلام رسول مہر' کتاب منزل لاہور

۱۶۔ خطوط غالب جلد دوم۔ ایضاً۔

۱۷۔ عود ہندی باسم تاریخی مہر غالب' شیخ الٰہی بخش و محمد جلال الدین کشمیری بازار لاہور

۱۸۔ مکاتیب غالب بنام فردوس مکاں والی رامپور' مرتبہ امتیاز علی عرشی' ناظم کتابخانہ رامپور

۱۹۔ عود ہندی در مطبع نول کشور لکھنؤ۔

۲۰۔ اردو معلیٰ در مطبع مجتبائی واقع دہلی۔

۲۱۔ دیوان غالب' تاج کمپنی لاہور' کراچی

۲۲۔ شان غزل' ہم طرح غالب مع دیوان غالب

۲۳۔ دیوان غالب نسخہ عرشی' انجمن ترقی اردو ہند' علی گڑھ

۲۴۔ دیوان غالب کی ہندی فرہنگ' ہندوستانی بک ٹرسٹ ناز بلڈنگ بمبئی ۴

۲۵۔ غالب نامہ' آثار غالب حصہ نثر' شیخ محمد اکرام' تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی

۲۶۔ غالب نامہ' ارمغان غالب حصہ نظم۔ ایضاً۔

۲۷۔ غالب ڈرامے، شوکت تھانوی، ادارہ فروغ اردو لاہور۔

۲۸۔ غالب کے خطوط، انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

۲۹۔ کاس الکریم شرح دیوان غالب فارسی خنور اعجازی، منصرم کتب خانہ کلیمی رتہ احوال راولپنڈی۔

۳۰۔ دیوان غالب فارسی، پاکٹ سائز، مہر کتاب خانہ مشعل اسلام، داتا دربار روڈ لاہور

۳۱۔ دیوان غالب (ہندی رسم الخط) غالب اکیڈمی نظام الدین نیو دہلی

۳۲۔ دیوان غالب گماورا پبلشرز لاہور۔

۳۳۔ جان غالب، انعام اللہ خاں ناصر، تاج کمپنی لاہور

۳۴۔ طنز و مزاح، حصہ نثر، حصہ غالب خطوط۔

۳۵۔ مرثیہ غالب، ایک نظم از حالی، نیو امپیریل بک ڈپو ایجرٹن روڈ دلی۔

۳۶۔ مکمل شرح غالب، عبدالباری آسی، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ۔

غالب نامہ

غالب نامہ، غالب انسٹی ٹیوٹ ایوان غالب نئی دہلی

شمارہ جات = ۱۹۷۷ء، ۱۹۸۱ء --- تا جنوری ۱۹۹۳ء مکمل۔

رسالہ جات

۱۔ اردو غالب نمبر ا، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ شمارہ نمبر ا۔

۲۔ جامعہ غالب نمبر، مدیر ضیاء الحسن، جامعہ نگر نئی دہلی۔

۳۔ ہمانئی دہلی، مدیر عبدالوحید صدیقی، جنگ پورہ نئی دہلی۔

۴۔ علم و فن اردو ڈائجسٹ غالب نمبر، مدیر ایس الرحمان دہلوی، نیا محل دہلی۔

۵۔ علی گڑھ میگزین، غالب۔ مدیر بشیر بدر، علی گڑھ یونیورسٹی۔

۶۔ مجلہ سیفیہ غالب نمبر، نگران عبدالقوی دسنوی، مدیر متین سید، سیفیہ کالج بھوپال۔ (جلد ششم)۔

۷۔ تحریک غالب نمبر، مخمور سعیدی، دریا گنج دہلی۔

۸۔ نیا دور غالب نمبر، ایڈیٹر خورشید احمد، مہیش پرشاد اتر پردیش۔

۹۔ شبستان اردو ڈائجسٹ غالب نمبر مع دیوان غالب مصور، آصف علی روڈ نئی دہلی۔

۱۰۔ ہلال، جلد ۱۶، شمارہ ۱۱، ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔

۱۱۔ ماہ نو، غالب نمبر، ادارہ مطبوعات پاکستان کراچی۔

۱۲۔ گلفشاں لاہور، غالب نمبر مارچ، مرتب سیف زلفی، ۲۲ نکلسن روڈ لاہور۔

۱۳۔ گلفشاں لاہور، غالب نمبر، اپریل۔ ایضاً"۔

۱۴۔ ہمدرد ڈائجسٹ غالب نمبر، ایڈیٹر حکیم سعید احمد، ہمدرد، ناظم آباد کراچی۔

۱۵۔ اردو سہ ماہی جنوری تا مارچ، ادارہ تحریر = جمیل الدین عالی، مشفق خواجہ، انجمن ترقی اردو کراچی۔

۱۶۔ اردو سہ ماہی اپریل تا جون-----ایضاً"-----

۱۷۔ قومی زبان بیاد غالب، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی۔

۱۸۔ العلم سہ ماہی، غالب نمبر، ایڈیٹر سید الطاف علی بریلوی، پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی۔

۱۹۔ نگار غالب نمبر، صدی/برسی، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نیاز منزل ناظم آباد کراچی۔

۲۰۔ اردو نامہ مع اردو لغت، قسط ۲۷۔ ترقی اردو بورڈ کراچی۔

۲۱۔ افکار غالب نمبر، مکتبہ افکار وا لبسن روڈ کراچی۔

۲۲۔ خیابان غالب نمبر، ترتیب ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی پشاور۔

۲۳۔ سب رس غالب نمبر جلد ۳۲، شمارہ ۹، ۱۰، ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد۔ سندھ

۲۴۔ نئی قدریں حیدر آباد، غالب صدی ایڈیشن، اختر انصاری اکبر آبادی، حیدر آباد۔

۲۵۔ الزبیر سہ ماہی، مسعود حسن شہاب۔ اردو اکیڈمی بہاولپور۔

۲۶۔ ادب لطیف لاہور، غالب نمبر، ایڈیٹر ناصر زیدی، سرکلر روڈ، لاہور

۲۷۔ نقوش غالب نمبر ۲، (۱۱۳) نو دریافت بیاض غالب، بخط غالب۔ محمد طفیل ادارہ فروغ اردو لاہور۔

۲۸۔ نقوش غالب نمبر ۱۱۱، ادارہ فروغ اردو لاہور۔

۲۹۔ نقوش غالب نمبر-------ایضاً"-----

۳۰۔ اوراق غالب نمبر، ادارہ: وزیر آغا، عارف عبدالمتین۔ چوک اردو بازار لاہور۔

۳۱۔ فنون غالب نمبر و سالنامہ، احمد ندیم قاسمی، انار کلی لاہور۔

۳۲۔ ماہنامہ کتاب، غالب کا مکمل دیوان، نگران ابن انشاء قومی کتاب مرکز پاکستان لاہور۔

۳۳۔ راوی۔ غالب نمبر نگران پروفیسر محمد منور، گورنمنٹ کالج لاہور۔

۳۴۔ صحیفہ غالب نمبر اول، جنوری، مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، مجلس ترقی اردو لاہور

۳۵۔ صحیفہ غالب نمبر دوم، اپریل-----------ایضاً"-----

۳۶۔ صحیفہ غالب نمبر سوم، جولائی-----------ایضاً"-----

۳۷۔ صحیفہ غالب نمبر چہارم، ستمبر---------ایضاً"-----

۳۸۔ سب رس، غالب نمبر، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد سندھ۔

English Books

The life and Odes of Ghalib by Abdullah Anwar Baig, Urdu Academy Lohari Gate Lahore 1940.

Ghalib His Life and Persian poetry by Dr Arif Shah. Sayyad Gilani Principal Govt College Hyderabad W P, Azam Book Corporation Karachi 3 1956

Ghalib studies, by Abid Riza Badr, Institute of Oriental Studies Rampur 1967

Interpretation of Ghalib, Pandat J.L. Kaul, Messers Atma Ram & Sons Book Sellers Kashmeeri Gate Delhi 1967

Mirza Ghalib, Malik Ram. Nation Book Trust India 1960

Ghalib A Critical Introduction by Fayyaz Ahmad. University of Punjab Lahore. 1969

Ghalib life and letters, by Ralph Russel and Khursheed ul Islam, Union Brothers Ltd. Old Oking Surrey England. 1969

Ghalib, M Mujeeb, Sabitya Academy New Delhi. 1969

Ghalib selected poems, by Ahmad Ali, M E O Roma. 1969

Whisphers of the Angel (Nawa-e-Sarosh), Ghalib Academy New Delhi. 1969

Ghalib No 3, Feroze Sons Lahore 1969

International Ghalib Seminar, Editor by Dr. Yusuf Hussain Khan All India Ghalib Centenary Committee Aiwan Ghalib New Delhi. 1969-70

Ghalib Reveberations by Daud Kamal 1970

Ghalib the poet and his age, by Ralph Russel, George Allen & Unwin Ltd London. 1972

Hundred verses of Mirza Ghalib, by Sofia Sadullah A M Sadullah Karachi Pakistan. 1975

Urdu Ghazals of Ghalib, Translated by Yusuf Hussain, Ghalib Institute New Delhi. 1977

Yadgar-e-Ghalib translated by K H Qadir, Ghalib Institute New Delhi 1990

Ghalib Urdu Ghazals, Dr Yagoob Mirza Ghalib Institute New Delhi 1992

A Dance of Sparks by Annmarie Schimmel, Vikas Publishing House Pvt. Ltd. Kanpur.

مرثیہ

خواجہ الطاف حسین حالی

دل کی باتیں جب اس کی یاد آئیں   کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل   کس کی داد سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب   کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضمون ہے نوحہ استاد   کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں   اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو   سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح   اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم   لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے   بے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

"مباحث"

گوہر ملسیانی

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

(غالب)

اس مطلع دیوان غالب / مطلع غزل اول کے مفاہیم و مطالب میں اہل علم و ادب کے درمیان اختلافات چلے رہے ہیں۔ آج سے بیس سال قبل بھی ایسی ہی اختلافی بحث چلی تھی۔ اب پھر یہی آگ پھر سلگ رہی ہے۔ چنانچہ گذشتہ شائع شدہ مباحث کو یکجا کرتے ہوئے' کچھ باتیں مرتب کے ذہن میں بھی ابھری ہیں۔ آخر میں انہیں بھی بیان کرنے کی جسارت کی ہے۔ ویسے ہر شاعر اپنے اشعار کے مضامین اپنے ہی تصورات و خیالات کے حوالے سے صفحہ قرطاس پر لاتا ہے لیکن جس طرح ایک ہیرے کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں ہر شعر بھی مختلف مطالب رکھتا ہے اور ہر ذہن اپنی اپنی استعداد کے مطابق مفہوم کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

دیوان غالب کا پہلا شعر

محمد اقبال جاوید

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ شعر غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہے اور غالب کے اس دیوان میں بھی شامل ہے جسے "نسخہ حمیدیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ شعر معنوی لحاظ سے بڑا عمیق اور بلیغ ہے۔ دلاویز بھی ہے اور ترانہ ریز بھی' اس وقت عام رواج تھا کہ دیوان کی ابتداء منقبت یا حمد سے کی جاتی تھی۔ غالب کی پہلی غزل کا یہ مطلع "خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے" کے مترادف ہے۔ یہ ایک ایسا شہ پارہ ہے جس میں غالب کے تخیل کی رفعت اور قلم کی عظمت بدرجہ اتم موجود ہے۔ سب سے پہلے غالب ہی کی زبان میں اس شعر کی تشریح دیکھئے۔

ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم سامنے جاتا ہے۔ جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا' بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو' موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

(غالب)

کاغذی پیرہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا نہ سنا' جب تک اس شعر میں کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنائی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو' اس وقت تک اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے مصنف کی یہ غرض تھی کہ نقش تصویر فریادی ہے۔ ہستی

بے اعتباری اور بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا' شعر میں ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی' اس سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا اور مقصود تھا مطلع۔ اس لیے ہستی کے بدلے شوخی تحریر کہہ دیا' شعر بے معنی ہے (طباطبائی)

انسان کی بے بود ہستی اور کشاکش حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ کسی چیز کی بھی ہو باعث تکلیف و رنج ہے۔ حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستی محض ہے بزبان حال دریافت کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کیا' جیسا کہ اس کاغذی پیرہن سے ظاہر ہے۔ (سعید)

مولانا روم کے یہاں بھی ایسا ہی خیال ہے۔ جس کی تصویر دوسرے الفاظ کے رنگ و روغن کے ساتھ کھینچی گئی ہے کہ

بشنو از نے چوں حکایت مے کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

جیسے کہ نے کی آواز اختیاری نہیں ہے۔ بلکہ اس میں فطرتی یہ خاصہ موجود ہے کہ جب وہ نیستاں سے جدا ہو گی اس میں آواز پیدا ہو سکے گی۔ اسی صورت سے تصویر کو لے لیجئے کہ جب وہ صفحہ کاغذ پر کھینچی جائے گی۔ اس کا لباس کاغذی یعنی فریادیوں کا ہو جائے گا۔ ان دونوں خیالوں سے ایک بڑا زبردست نکتہ اور بہت باریک بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ مبداء حقیقی سے جدائی میں اضطراری حالت انسانی مصنوعی نہیں ہے بلکہ وہ اس میں مجبور محض ہے۔ جدائی سے ایسی حالت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اسی خیال کو' بادی النظر میں آتش مرحوم نے ادا کیا ہے' گو ہر ادا نہیں ہو سکا' فرماتے ہیں کہ

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

دریا کو انہوں نے حباب سے اور حباب کو دریا سے جدا کیا ہے۔ گو در اصل حباب دریا سے جدا نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے۔

دریا سے حباب کی ہے جدا تو اور نہیں میں اور نہیں
مل جاؤں گا تجھ میں بعد فنا تو اور نہیں میں اور نہیں

حباب دریا کا ایک قطرہ ہوتا ہے۔ جو ایک نیا تماشہ دکھا دیتی ہے اور بادی النظر میں اس کی یہ صورت ہو جاتی ہے۔

(عبدالباری آسی)

گویا اصل سے جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخی تخلیق کی زبان حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔

ہر پیکر تصویر سے مراد جملہ حیوانات جمادات اور نباتات سے ہے۔ یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں جب موجودات عالم کا یہ حال تو نقش ہستی کا اپنا بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔

(بے خود دہلوی)

معلوم یہ ہوا کہ ہر شے زبان حال سے فریاد کر رہی ہے کہ اے ہمارے پیدا کرنے والے! اے مصور بے بدل! تو نے ہماری تخلیق و تشکیل میں کیا کیا صنعتیں اور کیا کیا تکلفات صرف کیں۔ لیکن قیامت یہ ہے کہ ہم بے دست بروفنا ہیں۔ نہ قرار ہے نہ ثبات ہے۔ اگر مٹانا تھا تو بنانے میں اتنا اہتمام اتنا تکلف کیوں کیا۔

(اثر لکھنوی)

اس نگار خانہ عالم کی ہر ہر چیز نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبان حال سے اپنی ناپائداری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے۔

(نیاز فتح پوری)

گویا خالق کائنات کا ایک کام مصوری ہے۔ اس نے پردۂ عدم پر وجود کے نقش بنائے ہیں۔ جن کی گوناگونی اور بوقلمونی اہل نظر کے لیے حیرت انگیز ہے۔ عام طور پر نقش یا تصویر کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کے اندر نقاش نے یا تو زندگی کے ساکن پہلوؤں کا آئینہ پیش کیا ہے یا زندگی کی متحرک اور مضطرب کیفیات کو رنگوں اور خطوں میں شامل کر دیا ہے۔ تصویر نہ ہلتی ہے اور نہ بولتی ہے جو کچھ کہنا چاہتی ہے خاموشی کی زبان یا زبان حال سے ادا کرتی ہے۔ لیکن کسی مصور کا کمال یہ نہیں کہ وہ زندگی کی حرکت کو سکون سے بدل دے۔ مصور حقیقی زندگی کا ترجمان ہے اور زندگی سراپا تغیر ہے۔ کوئی چیز جمادات، نباتات، حیوانات، انسان تک لمحہ بھی اپنی حالت پر قائم نہیں رہتی۔ انسان اس لاانتہائی انقلاب میں ثبات ڈھونڈتا ہے۔ لیکن ثبات کہاں۔ بقول اقبال

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

انسان کی سرسری نگاہ نے خاک و سنگ کو جامد سمجھ لیا۔ جو تغیر جہاں پڑا ہے۔ وہیں پڑا ہے۔ جب تک خارج کی کوئی قوت اسے جنبش نہ دے وہ نہیں ملتا۔ نیوٹن کی طبیعات نے بھی مادے کے اندر جمود کے قانون کو اصلی اور اساسی سمجھا اور حرکت کو مادے سے جدا حقیقت قرار دیا۔ لیکن طبیعات کی ترقی نے انسان کو اس بصیرت تک پہنچا دیا کہ جمود کہیں نہیں۔ جامد دکھائی دینے والا مادہ سراپا حرکت ہے۔ اس لاانتہائی حرکت نے فریب نظر کے لئے جمود کا ایک سیما پیدا کر دیا ہے۔ عارفوں کی نظر طبیعی سائنس والوں سے بہت پہلے حقیقت تک رسا ہو جاتی ہے۔ عارفان حقیقت کو ہستی کے کسی پہلو میں بھی کبھی جمود نظر نہیں آیا۔ ساری ہستی میں زندگی ہی کے مختلف مدارج پائے جاتے ہیں اور زندگی تغیر و اضطراب کا دوسرا نام ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں کسی نہ کسی طرح کی ظاہریا پوشیدہ بے چینی بھی موجود ہے۔ عارف رومی بھی عناصر اربعہ کو زندہ حقیقت قرار دیتے ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند
بامن و تو مردہ باحق زندہ اندر

غالب کے کلام میں جابجا یہ نظریہ حیات پایا جاتا ہے۔ سر دیوان اسی مضمون کا مطلع لکھنا اس امر کی شہادت ہے کہ یہ شاعر کا نظریہ حیات ہے۔ وہ زندگی کی یہی ماہیت سمجھتا ہے۔ یہ شعر صرف انسان کے متعلق نہیں بلکہ ساری موجودات یا نقوش کائنات کے متعلق ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہر تحریر میں شوخی پائی جاتی ہے اور شاعروں کے نزدیک معشوق کا بھی یہ ایک خاصہ ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ ہر تحریر میں بھی یہاں غالب تصویر کی شوخی کا ذکر کرتا ہے۔ جو مصور کی شوخی تحریر کا اظہار کر رہی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ شوخی کا

وہ کیا خاصہ ہے۔ جس سے فریاد پیدا ہو' شوخی کے اندر بے تابی بھی مضمر ہوتی ہے اور زیادہ بے تابی سے ہر زندگی کم و بیش گھبراتی ہے۔ توازن و ہم آہنگی سے سکون پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی صفت ہم آہنگی کے دائرے سے باہر نکلتی ہوئی محسوس ہو تو وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جسے شوخی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان کی قوت برداشت کو ایک طرح چیلنج ہوتا ہے۔ شوخی میں کشش اور گریز دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو انسان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور دوسرے پہلو سے طبیعت فرار کی طرف آمادہ ہوتی ہے۔ جو بات ناقابل برداشت معلوم ہو' اسی سے گریز کی تمنا کا نام فریاد ہے۔ لیکن دوسرا پہلو یہ ہے کہ شوخی جاذب نظر و دل بھی ہے ہر موجود چیز شوخی تحریر کی فریادی ہے۔ لیکن باوجود اس کے فنا ہونا نہیں چاہتی کیونکہ اس شوخی میں ایک طرح کی دلکشی بھی ہے۔ فریاد دلوں میں سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی جامد وجود سے تو فریاد کا پیدا ہونا محال ہے۔ اگر کائنات میں ہر نقش شوخی تحریر کا فریادی ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ کائنات مادے کے جامد ذرات سے نہیں بلکہ دلوں سے آباد ہے۔ اجرام فلکی ہوں یا ذرات ارضی سب کے سب دلوں ہی کی بستیاں ہیں۔ خیال کو غالب نے بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔

ازمہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو شش جہت کے مقابل ہے آئینہ

میر درد کا بھی یہی نظریہ تھا۔

آہستہ سے چل میان کہسار
ہر سنگ دکان شیشہ گر ہے

جرمنی کے مشہور فلسفی شوپن ہار کے سارے فلسفے کی اساس یہی نظریہ ہے کہ تمام کائنات ایک بے تاب ارادہ حیات کی مظہر ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں اضطراب ہے اضطراب سے نجات فقط اسی حالت میں ہو سکتی ہے کہ خود زندگی سے نجات حاصل ہو جائے اس خیال کو غالب نے اس شعر میں ادا کیا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

یا دوسری جگہ کہا ہے:۔

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اگرچہ یہ شوخی تحریر جو فریاد آفریں ہے ہر نقش کے اندر موجود ہے۔ مخلوقات میں سے کوئی ہستی اس سے مبرا نہیں۔ لیکن ارتقائے حیات کے ساتھ ساتھ تحریر کی یہ شوخی اور اس کے ساتھ ساتھ فریاد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اشرف المخلوقات حضرت انسان تک پہنچ کر یہ حال ہو جاتا ہے جس کے متعلق غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

قیامت مے دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

سب سے زیادہ اضطرابی کیفیت وہ ہے جسے قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے غالب کے نزدیک قیامت یا محشر محض کسی آئندہ ہونے والے واقعہ کا نام نہیں۔ قیامت اور انسان ہم زاد ہیں۔ جس پردۂ خاک میں انسان بنایا گیا۔ اسی سے قیامت بھی ابھاری گئی انسانیت اور

قیامت یک وقت ایک ہی حقیقت میں سرزد ہوتی ہیں۔ اچھی بری تمناؤں کا طوفان اور اس کے نتائج ہر وقت نفس انسانی پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ مصور کائنات کی شوخی تحریر کا سب سے زیادہ نمائندہ انسان ہے۔ اسی لیے وہ سب سے زیادہ فریادی بھی ہے۔ انسان کو اس کا شوق مضطرب اور بے اختیار رکھتا ہے۔ اس غزل میں غالب نے جو بلیغ مضمون شمشیر سے پیدا کیا ہے۔ وہ حقیقت میں انسان ہی کے بارے میں ہے۔

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

اس طرح انسان بھی ہر وقت تمناؤں میں ہانپتا کانپتا رہتا ہے یہ شعر مطلع ہی کی مزید تشریح ہے۔ اسی طرح اس غزل کا دوسرا شعر بھی انسانی اضطراب کی کیفیت ادا کرتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ فرہاد کو کوئی غیر معمولی مصیبت پیش آئی تھی کہ ایک جانکاہ کام اسے کرنا پڑا یعنی پہاڑ کاٹ کر اس میں سے جوئے شیر لائے۔ جہاں بھی تمنا میں شدت پیدا ہو جائے یہ کیفیت عام ہو جاتی ہے۔

چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

ہر عاشق کو ہر رات یہ کالا پہاڑ کاٹ کر صبح کی جوئے شیر لانی پڑتی ہے۔ جب تک دل ہے اور دل میں تمنائیں بھڑکتی ہیں۔ اس وقت اسیر اور پابہ زنجیر ہو جانا بھی اس کا علاج نہیں تمنا کی بے تابی ایک باطنی کیفیت ہے۔ ظاہری آزادی یا پابندی سے اس پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جس خیال کو مطلع میں انوکھی تشبیہ سے ادا کیا ہے۔ اسے مقطع میں بڑی جدت سے بیان کیا ہے۔

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

معنی آفرینی، ندرت تشبیہ اور بلاغت کے لحاظ سے مقطع، مطلع کا ہم پلہ ہے۔ بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ مطلع کی شوخی تحریر کی چنگاری مقطع میں آہن گداز آگ بن گئی ہے۔

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم)

غالب کا یہ شعر جو سر مطلع دیوان ہے ان کی شوخی فکر کا بلانک و شبہ آئینہ دار ہے۔ انہوں نے حمد کے پردے میں خدا سے گلہ کیا ہے کہ اے خدا کہ جب تو نے ہر مخلوق کو فنا کے لیے پیدا کیا تو پیدائش میں اس قدر کمال کا اظہار کیوں کیا؟ بالفاظ دیگر جب ہست کر کے مٹانا منظور تھا تو ہست کرنا ہی کیا ضرور تھا۔ یہ توارد بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ غالب کے جرمن ہم عصر شوپن ہار نے بھی ہستی کے متعلق یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ ہستی سراپا کشمکش اذیت اور شر ہے ہستی کی تہ میں ارادہ کار فرما ہے اور سارا فساد اسی کا پیدا کردہ ہے۔

(پروفیسر سلیم چشتی)

نقش: صورت، ہر چیز جو عالم وجود میں آئے، ہستی نگار خانہ عالم
فریادی: فریاد کرنے والا، پناہ مانگنے والا، مبتلائے غم
شوخی تحریر: نقش کی رعنائی، تخلیق کی ستم ظریفی
کاغذی پیرہن: فریادی کا لباس چونکہ کاغذ جلد پھٹ جاتا ہے لہٰذا کنایہ ہے عدم ثبات سے

پیکر تصویر: تصویر کے نقش و نگار، کوئی بھی چیز جو تصویر کی طرح دلآویز یا خوبصورت ہو، کنایہ ہے مخلوقات کے وجود ظاہری سے۔
شاعر حیرت سے پوچھتا ہے کہ یہ سارا نگار خانہ عالم کس کی (مراد خدا سے ہے) تخلیق کی ستم ظریفی پر فریادی بنا ہوا ہے۔
یہاں کی ہر چیز دلآویز ہونے کے ساتھ ساتھ جتائے غم اور بے ثبات بھی کیوں نظر آتی ہے؟ خدا کو اسے جتائے غم اور فنا آمادہ بنانا
تھا۔ تو اس سے زندگی کو اس قدر دلآویز بنایا ہی کیوں؟

غالب نے صرف لفظ نقش سے پورا نگار خانہ عالم مراد لیا ہے نقش کی رعایت سے تحریر کہا ہے جو تخلیق کے معنی ادا کرتا
ہے۔ گویا یہ ساری کائنات خدا کی تحریر ہے۔ صرف لفظ شوخی سے یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ تخلیق کا کرم بھی بڑا پر ستم ہے۔ کاغذی
پیرہن سے نہ صرف جتائے غم ہونا بلکہ بے ثبات ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ تصویر سے تخلیق کا حسن اور کمال ظاہر کر
دیا ہے۔ خوبصورت اور کاریگری کو نمایاں کرنے والی چیز کو تصویر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ انگریزی کا ایک عام محاورہ ہے۔ "تصویر کی
طرح خوبصورت" تصویر عام طور پر کاغذ پر بنائی جاتی ہے۔ لہٰذا کاغذی پیرہن میں یہ رعایت بھی ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ غرض کہ اس
شعر کا ہر لفظ ایک گنجینہ معنی ہے جو دوسرے لفظ کو زور پہنچا رہا ہے۔ الفاظ کم سے کم اور معنی نہ صرف زیادہ بلکہ لطیف سے لطیف تر
اسی کو قادر الکلامی کا اعجاز کہتے ہیں جو اب کے نگار خانے میں غیر فانونی نقوش ثبت کر جاتا ہے۔ (وجاہت علی سندیلوی)

(اخذ و ترتیب)
(اردو کے دس عظیم شاعر از محمد اقبال جاوید
ایڈیشن ۱۹۸۳ء علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور)

مطلع دیوان غالب

منظور احسن عباسی

دنیائے علم و ادب میں بھلا ایسا کون شخص ہے جو اس خیال کو ہذیان نہ سمجھے کہ پاک و ہند کے سب سے بڑے شاعر نے اپنے
شعر کی جو شرح خود بیان کی ہے وہ غلط ہے۔ مسئلہ اور بھی زیادہ سنجیدہ ہو جاتا ہے اور کہنے والا یہ بھی کہے کہ شعر کا وہ مطلب جو میں
سمجھا ہوں وہی صحیح ہے۔

اس کے باوجود راقم الحروف "ہذیانی" کہ دلدادۂ غالب ہے، پورے اعتماد سے کہتا ہے کہ مطلع دیوان غالب کا وہ مطلب جو
ان کی طرف منسوب ہے، نہایت غلط ہے۔ شعر یہ ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

اب وہ مطلب سنئے جو اس شاعر بے عدیل نے اپنے اس شعر کا خود بیان کیا ہے:

"ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلود
کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت

تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے' یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

(عود ہندی)

واضح ہو کہ کسی امر کا موجب رنج و ملال و آزار ہونا اور بات ہے اور کسی مظلوم کا داد طلب اور فریادی ہونا کچھ اور ہے۔ کسی جسمانی کرب و اذیت یا ناگزیر افتاد کی پیش آمد پر رنج و ملال میں مبتلا ہونے والا شخص کاغذی پیرہن پہن کر حاکم کے سامنے کبھی پیش نہیں ہوتا اور کس خطہ ارض میں یہ رسم تھی؟ ہاں یہ درست ہے کہ ایک شخص جس کو اس کے حق سے محروم رکھا گیا ہے وہ بلاشبہ حق رسی و داد طلبی کے لیے کاغذی لباس پہن کر حاکم کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ میں نے خود ایک شخص کو دیکھا جس نے اپنی شکایات ایک بہت بڑے کاغذ کے تختے پر لکھ کر بطور پیرہن کے اپنے اوپر پہن لیا تھا۔ دن کو مشعل جلانا یا خون آلود کپڑے کو بانس پر لٹکانا بھی بلاشبہ مظلومیت کا اظہار اور داد طلبی کی ایک صورت ہے۔ گذا باندھنا جو کہاوت ہے وہ بھی اسی قسم کی اظہار مظلومیت ہے' لیکن مقصد ان تمام صورتوں میں "داد طلبی" ہے رنج و ملال اور آزار کا اظہار نہیں ہے۔ اس کا طریقہ کپڑے پھاڑنا' سر پیٹنا یا گریہ و بکا سے کام لینا ہے۔ کاغذی لباس پہننا ہرگز نہیں ہے۔

پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آخر "شوخی تحریر" ایسی کون سی اذیت وہ صورت حال ہے کہ اس کے باعث نقش آمادہ فریاد یا مبتلائے رنج و ملال و آزار ہو جائے۔ مع ہذا شوخی تحریر کی تخلیق کردہ تصویر کو اعتبار محض قرار دینے کی کوئی توجیہ نہیں کی گئی۔ اس کو اعتبار محض ہی قرار دینا تھا تو شوخی تحریر کی بجائے غیر واضح یا مبہم تصویر کہنا چاہیے تھا۔ غرض معنی شعر کی یہ چول کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔

راقم الحروف کے نزدیک شعر واضح المعنی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اشعار غالب جو کاغذی لباس میں پیش ہیں وہ گویا ہر خدائے سخن سے داد طلب ہیں اور داد طلبی کی نوبت اس لیے آئی کہ شعر غالب کا حق پذیرائی ادا نہیں ہوا۔

کمال اسماعیل اصفہانی کا یہ شعر بالکل اسی خیال کا ترجمان ہے:

کاغذیں جامہ پوشید و بدرگاہ آمد
زادۂ خاطر من تابدہی داد مرا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے اپنے اس شعر کے مطالب کو کمال اسمٰعیل اصفہانی المتوفی ۶۳۵ھ سے اخذ فرمایا ہے۔ اگر ندرت معنی کے ساتھ جدت ادا نہ ہوتی تو ہم بلا تامل کہتے کہ غالب کا مطلع کمال اصفہانی کے شعر کا معنوی سرقہ ہے۔

شعر غالب میں "نقش" استعارہ ہے۔ انشاء شعر سے "کہ" کنایہ ہے ذات شعر سے۔ شوخی تحریر معنی خوبی تحریر۔ پیکر تصویر معنی شعر (جو جذبات کی تصویر کشی کرتا ہے)۔ کاغذی پیرہن ہونا کنایہ ہے داد طلبی سے۔

شعر کا مطلب یہ ہوا کہ غالب نے خوبی تحریر کے نقوش سے جو تصویر کشی کی ہے یعنی وہ اشعار جو انہوں نے تخلیق کیے ہیں وہ کاغذی پیرہن اس لیے ہیں کہ ان کو خاطر خواہ داد نہیں ملی اور طالب داد ہیں۔

ہم اگرچہ اس کو سحی شاعرانہ کہہ سکتے ہیں لیکن جہاں تک شعرِ غالب کا تعلق ہے، یہ سعی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ ان کے عہد سے لے کر اب تک شعرِ غالب کی داد خاطر خواہ نہیں دی جا سکی۔

(صحیفہ غالب نمبر حصہ پنجم شمارہ ۶۳، اپریل ۱۹۷۳ء)

شمس الرحمان فاروقی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

زمانہ تحریر: ۱۸۱۶ء

اس بات کی وضاحت اب غالباً ضروری نہ ہو کہ اس شعر کے بارے میں طباطبائی کا یہ فیصلہ درست نہیں ہے کہ "مصنف کا یہ کہنا کہ ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، میں نے یہ ذکر نہ کہیں دیکھا نہ سنا۔" کاغذی پیرہن پہن کر دادخواہی کے لیے جانا مشہور قدیم ایرانی رسم ہے اور کمال اسمٰعیل کا یہ شعر اس کے وجود کی دلیل کے لیے کافی ہے۔

کاغذیں جامہ بہ پوشید و بدر گاہ آمد
زادۂ خاطر من تا بہ دہی داد مرا

اس رسم سے ملتی جلتی رسم کا سراغ قدیم روم میں بھی ملتا ہے۔ قدیم رومائی رواج کی رو سے داد خواہ یا امیدوار لوگ حاکم کے پاس سفید لباس پہن کر جایا کرتے تھے چنانچہ انگریزی کا لفظ Candidate بہ معنی "امیدوار" اسی رسم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ انگریزی میں Candid کے معنی "صاف" کے ہیں اصل لاطینی میں Candid کے معنی تھے "سفید" اور Candidatus کے معنی "سفید لباس پہننے والا" یعنی امیدوار۔"

غالب نے اس شعر کی تشریح میں لکھا ہے۔ "نقش کس کی شوخیِ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے، اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، موجب رنج و آزار ہے۔" شارحین غالب نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ شعر انسان کے ضعیف البنیان ہونے کے خلاف احتجاج ہے، لیکن طباطبائی اس سے متفق نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ شعر میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو حالانکہ معاملہ ہستی اعتباری سے نفرت کا نہیں، بلکہ صرف اس بات کا ہے کہ کاغذ کا لباس دلالت کرتا ہے فریاد اور داد خواہی پر، اور فریاد و داد خواہی غالباً اس بات کی ہے کہ مصور نے ازراہ شوخی تصویر کو ناپائدار بنایا ہے۔ ایک نکتہ یہ بھی پیدا کیا گیا ہے کہ تصویر خالق سے جدا ہو کر صفحۂ قرطاس میں محبوس ہو جانے کی شکایت کر رہی ہے۔

شعر کے الفاظ ایک اور بھی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور خود غالب کی شرح اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ پہلے مصرعے کا کلیدی فقرہ "کس کی" ہے یعنی ابھی یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کی "شوخیِ تحریر" کے خلاف نقش فریادی ہیں دوسرے الفاظ ہیں، یہ شعر ہستی کی بے ثباتی یا زندگی کے موجب رنج و آزار ہونے کے بارے میں تو ہے، لیکن اس کا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس کے جبر و اقتدار کے ہاتھوں ہر چیز مجبور ہے؟ مصرع اولیٰ کا "کس کی" استعجابیہ سے زیادہ استفہامیہ ہے۔ ممکن ہے کہ اگر "کس کی شوخیِ تحریر" کا صحیح جواب مل جائے تو "پیکرِ تصویر" کی داد خواہی ہو سکے۔

"نقش" دراصل انسان ہے' جو صورت تصویر بے زبان ہے اور زبان بے زبانی سے یہ فریاد کر رہا ہے کہ ہمیں کس نے جتلائے آزار کیا؟ اس نکتے پر بھی غور کیجئے کہ نقش بے زبان ہوتا ہے اور یہ بے زبانی ہی اس کے فریادی ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح کا قول محال غالب کو بہت عزیز تھا۔

مراعات النطیر (نقش' تحریر' کاغذی' پرہن' پیکر' تصویر) کے علاوہ غالب نے اس شعر میں تجنیس صوتی کا بھی خوب اہتمام کیا ہے فریادی' کس کی' شوخی' کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر۔ مصرع ثانی میں "ہر" پر خاص تاکید ہے جو "پیکر تصویر" کے دورائے مہملہ سے ٹکرا کر مصرع میں شدت اور اسرار کے عنصر کا اضافہ کرتی ہے۔

مصرع اولی کا اسلوب انشائیہ یعنی استفہامی ہے استفہام غالب کا خاص انداز ہے' ممکن ہے انہوں نے استفہام اور اس طرح کے دوسرے انشائیہ اسالیب کا فن میر سے سیکھا ہو۔ لیکن دیوان کا پہلا شعر' جس کا مضمون حمد پر مبنی ہونا چاہیے تھا۔ تنظیم دو جہاں کو معرض سوال میں لاتا ہے۔ یہ شوخی یا آزادہ روی یا عالی دماغی' غالب کی مخصوص ادا ہے۔ میر بھی خالق کائنات کے نظم و نسق کو معرض سوال میں لائے ہیں' مثلاً دیوان اول ہی میں کہتے ہیں ۔

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

لفظ "شوخی" کو دیکھ کر گمان گذرتا ہے کہ میر کا شعر غالب کے ذہن میں رہا ہوگا۔ لیکن خالق کائنات کی شوخی کا مضمون اور اس پر طرہ یہ کہ اس شوخی کو موضوع سوال بنانا اور ایسے شعر کو سر دیوان رکھنا' یہ شوخی غالب سے ہی ممکن تھی۔

واضح رہے کہ بیان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ (1) خبریہ (2) انشائیہ۔ خبریہ بیان وہ ہے جس کے اوپر جھوٹ یا سچ کا حکم لگ سکے۔ انشائیہ بیان وہ ہے جس پر جھوٹ یا سچ کا حکم نہ لگ سکے۔ مثلاً یہ بیان جزیہ ہے "میں انسان ہوں۔" ظاہر ہے کہ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ بیان جھوٹ ہے یا سچ۔ مندرجہ ذیل انشائیہ ہیں: "کیا میں انسان ہوں؟" "انسان بنو۔" کاش وہ انسان ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان بیانات کے اوپر جھوٹ یا سچ کا حکم نہیں لگ سکتا۔ چونکہ انشائیہ بیان میں معنی کے امکانات کی کثرت ہوتی ہے اس لیے انشائیہ بیان کو خبریہ بیان پر ترجیح دیتے ہیں۔

(تفہیم غالب' ص ۲۲)

غالب کے اردو دیوان کا پہلا شعر

مشکور حسین یاد

پہلے شعر سے میری مراد غالب کے اردو دیوان کی پہلی غزل کا یہ مشہور مطلع ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب کے ابتدائی معروف شارحین سے قطع نظر جدید ترین شارح تفہیم نگار شمس الرحمن فاروقی صاحب نے بھی اس شعر یا

مطلع کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کیا اور جدید ماہرین لسانیات کے بقول کسی ادبی متن کی کوئی قرات آخری قرات نہیں ہوتی اس لیے انصاف ممکن بھی نہیں ہے۔ چنانچہ اب جو کچھ میں عرض کروں گا اسے بھی حرف آخر نہیں کہا جاسکتا۔ تفہیم غالب کے مزید امکانات پیدا ہوسکتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

فاروقی صاحب نے یہ صحیح لکھا ہے کہ اس بات کی وضاحت اب غالباً ضروری نہ ہو کہ اس شعر کے بارے میں طباطبائی کا یہ فیصلہ درست نہیں ہے کہ مصنف کا یہ کہنا کہ ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے' میں نے یہ ذکر نہ کہیں دیکھا نہ سنا کاغذی پیرہن پہن کر داد خواہی کے لیے جانا مشہور قدیم ایرانی رسم ہے"----- فاروقی صاحب نے بات یہیں ختم نہیں کی بلکہ اس رسم سے ملتی جلتی رسم کا سراغ قدیم روم میں بھی ڈھونڈ نکالا۔ وہ لکھتے ہیں "قدیم رومائی رواج کی رو سے داد خواہ یا امیدوار لوگ حاکم کے پاس سفید لباس پہن کر جایا کرتے تھے۔ چنانچہ انگریزی کا لفظ Candidate بہ معنی امیدوار اسی رسم کی طرف اشارہ ہے۔ انگریزی میں Candid کے معنی "صاف" کے ہیں۔ اصل لاطینی میں Candid کے معنی تھے "سفید" اور Candidatus کے معنی "سفید لباس پہننے والا یعنی امیدوار"------ یہاں فاروقی صاحب اردو کے الفاظ سفید پوش اور سفید پوشی کا بھی ذکر کر دیتے تو لطف آجاتا کہ ہمارے یہاں تو سفید پوش لوگوں کی تمام عمر ایک طرح کی امیدواری میں گزر جاتی ہے۔ یعنی سفید پوشی کو قائم رکھنے والی بات۔ خیر یہ تو میں نے ویسے ہی لطف معنی کے ضمن میں ذکر کر دیا ہے۔

اس کے بعد فاروقی صاحب اس شعر کے بارے میں غالب کی تشریح کا حوالہ دیتے ہیں یعنی خود غالب کا کہنا ہے "نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے' اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو' موجب رنج و آزار ہے"------ فاروقی صاحب نے غالب کی اس مختصر لیکن معنی خیز شرح پر اپنی طرف سے کچھ کہنے سے قبل شارحین غالب کے معنوی اضافوں کا ذکر کیا ہے جو میری دانست میں اتنے قابل اعتنا نہیں ہیں مثلاً یہ کہنا کہ یہ شعر انسان کے ضعیف البیان ہونے کے خلاف احتجاج ہے" انسان ہی کے نہیں پوری کائنات کے ضعیف البنیان ہونے کے خلاف احتجاج کہنا چاہیے' جس میں انسان بھی آجاتا ہے------ یا یہ نکتہ کہ تصویر فالتو ہے جدا ہو کر صفحہ قرطاس میں محبوس ہونے کی شکایت کر رہی ہے۔" میں سمجھتا ہوں اس طرح کے نکات آج کے جدید ذہن کو کوئی خاص انداز میں متاثر نہیں کرتے۔ البتہ یہ نکتہ سن کر ذہن مولانا روم کی مثنوی کے اس مشہور شعر کی طرف ضرور جاتا ہے جو یقیناً اس تشریح سے زیادہ تاثر لیے ہوئے ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند
از جدائیہا شکایت می کند

البتہ فاروقی صاحب نے یہ بالکل درست کہا ہے کہ جس طرح طباطبائی نے ہستی اعتباری سے نفرت والی بات کی ہے غالب کے زیر بحث شعر میں نفرت کی ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ شارحین غالب کا اس طرح ذکر کرنے کے بعد فاروقی صاحب نے زیر بحث شعر پر خود غالب کی تشریح کے حوالے سے اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے:

"شعر کے الفاظ ایک اور بھی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور خود غالب کی شرح اس سلسلے میں ہماری راہنمائی کرتی ہے۔ پہلے مصرعے کا کلیدی فقرہ "کس کی" ہے۔ یعنی ابھی یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچی کہ وہ کون سی ہستی ہے جس کی شوخی تحریر کے خلاف نقش فریادی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ شعر ہستی کی بے ثباتی یا زندگی کے موجب رنج و آزار ہونے کے بارے میں تو ہے

لیکن اس کا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس کے جبر و اقتدار کے ہاتھوں ہر چیز مجبور ہے؟ مصرع اولی کا "کس کی" استعجابیہ سے زیادہ استفہامیہ ہے۔ ممکن ہے اگر کسی کی شوخی تحریر کا صحیح جواب مل جائے تو پیکر تصویر کی داد خواہی ہو سکے۔ نقش دراصل انسان ہے صورت تصویر بے زبان ہے اور زبان بے زبانی سے فریاد کر رہا ہے کہ ہمیں کس نے جلائے آزار کیا؟ اس نکتے پر بھی غور کیجئے کہ نقش بے زبان ہو رہا ہے اور یہ بے زبانی اس کے فریادی ہونے کی دلیل ہے۔ اس طرح کا قول محال غالب کو بہت عزیز تھا۔"

اول تو غالب نے جو اپنے اس شعر کی تشریح کی ہے اس کی طرف شارحین غالب نے فاروقی صاحب سمیت پوری طرح توجہ نہیں دی ورنہ غالب کی تشریح میں بقول فاروقی صرف "ایک اور بھی معنی" کی طرف ہی راہنمائی نہیں ملتی، بہت سے معانی کے امکانات جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے فاروقی صاحب نے پہلے مصرع کے فقرے "کس کی" کو کلیدی کہہ کر تمام شعر کے معنی کو ایک طرح بے جہت کر دیا ہے۔ اس تمام شعر کا کلیدی لفظ تو ایک ہی ہے اور وہ ہے شوخی جس کی طرف شارحین نے بہت کم توجہ دی ہے۔ شوخی کی طرف فاروقی صاحب کی پوری توجہ ہوتی تو وہ "کس کی" فقرہ کو استعجابیہ کے بجائے استفہامیہ کہنے پر کبھی زور نہ دیتے۔ انہی کے قول کے مطابق استفہامیہ غالب کا خاص انداز سہی لیکن فاروقی صاحب اس نفسیاتی حقیقت کو کیسے فراموش کر گئے کہ استفہام جس طرح استعجاب میں مضبوطی کے ساتھ گھات لگا کر بیٹھتا ہے اس طرح واشگاف انداز میں سامنے آنے سے اس میں یعنی استفہام میں نہ وہ مضبوطی قائم رہتی ہے اور نہ ہی حسب دل خواہ وسعت اور پھیلاؤ اس کو نصیب ہوتا ہے۔ مصرع اولی کا اسلوب یقیناً انشائیہ ہے لیکن روایتی انداز کا یعنی خالی پھیکا استفہامیہ ہرگز نہیں ہے۔ چلئے پھر بھی اگر فاروقی نے اسلوب کو انشائیہ کہہ دیا ہے تو خالی پھیکا استفہامیہ تو وہ نہیں رہا لیکن استعجاب کے بغیر استفہام پر زور دینا کوئی زور دار بات نہیں۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا اس شعر کا کلیدی لفظ شوخی ہے اسی لیے ذرا غور و فکر کے بعد فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ شعر کا اصل مسئلہ کسی کی شوخی تحریر نہیں ہے بلکہ تحریر کی شوخی ہے۔ غالب نے "کسی کی" شوخی تحریر کہہ کر سوال نہیں اٹھایا بلکہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے شوخی تحریر کی طرف خاص توجہ دلائی ہے ورنہ شوخی تحریر کے خالق کو کون نہیں جانتا۔ لفظ شوخی کے معنی پر پوری طرح توجہ نہ دینے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ دوسرے شارحین غالب کو تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں جدید زمانہ کے ذہین تفہیم نگار یعنی ہمارے شمس الرحمن فاروقی بھی یہ فرما رہے ہیں کہ "یہ شعر ہستی کی بے ثباتی یا زندگی کے موجب رنج و آزار ہونے کے بارے میں تو ہے لیکن اس کا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس کے جبر و اقتدار کے ہاتھوں ہر چیز مجبور ہے۔" گویا ہر چیز کا مجبور ہونا کوئی بری چیز ہے۔ دیکھنے کی بات یہی ہے کہ اس شعر میں جبر اس طرح کا کوئی برا تاثر نہیں دے رہا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ مصور نے تصویر کو ناپائیدار بنایا ہے لیکن ازراہ شوخی ناپائیدار نہیں بنایا بلکہ خود تصویر میں شوخی بھر دی ہے جس کی وجہ سے اس میں یعنی تصویر میں دیگر صلاحیتوں کے علاوہ یہ صلاحیت بھی پیدا ہو گئی کہ وہ فریاد کرنے اور داد خواہی سوال اٹھانے کے قابل ہوئی۔ شوخی کے لفظ نے تمام شعر میں ایسی تیزی و طراری اور زندہ دلی و خوش حالی کی فضا پیدا کر دی ہے کہ خود تصویر کو اپنی ناپائیداری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اسی لیے تو وہ فریاد کر رہی ہے اور انصاف طلب کر رہی ہے کہ ایک طرف تو بنانے والے نے اسے اس قدر خوبصورت اور رعنائی سے بھرپور بنایا ہے اور دوسری طرف اس کے مقدر میں فنا بھی لکھ دی ہے۔ آخر ایسا کیوں کیا گیا ہے اور پھر تصویر کی شوخی ہمیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر رہی ہے (واضح ہو کہ یہ مجبوری پر لطف ہے) کہ بقول غالب ہستی ہزار مثل تصاویر اعتبار محض ہو لیکن ہے بہت اہم اور پر تاثیر' اسی لیے "

موجب رنج و آزار ہے" اس طرح دیکھا جائے تو ہستی کی ناپائیداری میں ایک جہان معانی پوشیدہ نظر آتا ہے اور یہ سب شوخی تحریر کے باعث ہے۔ نقش ہستی کی داد خواہی کا مطلب بھی وہی بات ہے کہ اس کی بظاہر ناپائیداری کے معنی سمجھے سے ہے گویا شوخی تحریر ہمارے ذہن کو بیدار کر رہی ہے کہ ہم ہستی کو بے ثباتی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ مطلب ہماری سمجھ میں آجاتا ہے تو پیکر تصویر کی داد خواہی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس شعر کا بنیادی سوال جیسا کہ فاروقی صاحب نے کہا ہے یہ نہیں بنتا کہ وہ کون سی قوت ہے جس کے جبر و اقتدار کے ہاتھوں ہر چیز مجبور ہے۔ اصل مسئلہ تو تصویر ہستی کو شوخی تحریر کو سمجھنا ہے جس کے باعث یہ عظیم قوت اپنے جبر و اقتدار کو بھی ہرشے کے لیے بابرکت اور جمال افروز ثابت کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تحریر کی شوخی نے نقش ہستی کی فریاد کو بھی بامعنی بنا دیا ہے اور اس نقش کی ناپائیداری کے باعث جو رنج و آزار پہنچ رہا ہے اس کو بھی لطف معنی سے بھر دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے یہ ساری خرابی اس لیے پیدا ہوئی کہ شارحین نے لفظ شوخی کے معنی پر پوری طرح توجہ نہیں دی اور اگر توجہ دی بھی گئی تو زیادہ تر اس لفظ کے فلسفی معنی کو پیش نظر رکھا گیا ورنہ آپ جانتے ہیں شوخی کے معنی تو بہت حیات پرور اور تحریک دینے والے ہیں اور پھر تحریر میں شوخی پیدا ہوئی ہے تو معانی اڈ اڈ کر سامنے آرہے ہیں۔ یعنی غالب کے اس شعر میں محض لفظ شوخی کے باعث عجب معنی خیز تحرک اور تفاعل کی فضا پیدا ہوئی ہے جس پر توجہ کیے بغیر ہم اس شعر کی صحیح معنی میں داد نہیں دے سکتے۔ شوخی کے معنی کے ضمن میں داغ کا ایک شعر یہاں بے محل نہ ہوگا ملاحظہ فرمایئے۔ شوخی کی فعالیت قابل غور ہے:

شوخی و شرم ادائیں تری دو چھریاں ہیں
ایک چلنے کے لیے ایک نہ چلنے کے لیے

شوخی کے معنی کی مزید وضاحت کے لیے خود غالب کے دو شعر پیش کر رہا ہوں۔ پہلے شعر میں شوخی کے فعال ہونے کا مزید ثبوت ہے:

ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں
معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیے

دوسرے شعر میں دھیمے لہجے کے باوجود شوخی کا زور بے تابی دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کے سامنے یعنی شوخی کے سامنے مایوسی اور نومیدی ایک طرف ہو کر رہ گئے۔

نہ لائی شوخی اندیشہ تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

تجنیس

فاروقی صاحب نے اس شعر میں مراعات النظیر اور تجنیس صوتی کا بھی ذکر کیا ہے۔ تجنیس صوتی کے بارے میں تو کچھ وضاحت کی بھی ہے لیکن مراعات النظیر کے ضمن میں تو صرف یہ الفاظ لکھ کر رہ گئے "نقش، تحریر، کاغذی، پیرہن، پیکر تصویر۔" میرے خیال میں انہیں یہ لکھنا چاہیے تھا کہ یہ صنعت بھی اس شعر میں بڑے زور دار انداز میں آئی ہے اور قاری کا ذہن صنعت کے بجائے معانی کی طرف جاتا ہے اور بڑی سرعت کے ساتھ جاتا ہے اور اسی کو صنعت کے استعمال میں اظہار کمال اور چابکدستی کہا جاتا

ہے۔ قادر الکلامی کہا جاتا ہے۔ مراعات النظیر معانی و مطالب میں وحدت پیدا کرتی ہے اور یوں ابلاغ کے لیے بلا کی مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ سو غالب کے شعر میں یہی کچھ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اس شعر کے مصرع ثانی میں حسن تعلیل بھی بے ثباتی کے ضمن میں بڑے ڈھکے چھپے انداز میں جلوہ فگن ہے۔

معلوم نہیں فاروقی صاحب کا ذہن اس طرف کیوں نہیں گیا اور ہاں موصوف نے یہ بھی فرمایا ہے "دیوان کا پہلا شعر جس کا مضمون حمد پر ہونا چاہیے تھا تنظیم دو جہاں کو معرض سوال میں لاتا ہے" ----- جناب والا غالب کا یہی کمال ہے کہ تنظیم دو جہاں کو معرض سوال میں لاکر بھی اس نے حمدیہ شعر کہا ہے۔ لیکن اس شعر میں حمد کی معرفت اسی وقت ممکن ہے جب کہ تحریر کی شوخی کے معنی کو اچھی طرح ذہن میں رکھا گیا ہو۔ البتہ بقول فاروقی یہ ممکن ہے کہ لفظ شوخی کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب کے ذہن میں میر کا یہ شعر رہا ہو:

کوئی ہو محرم شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزم عیش جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

لیکن انصاف سے بتایئے تمام تر احتجاج اور فریاد کے باوجود جو سلیقہ اور جو ادب ہمیں غالب کے شعر میں نظر آرہا ہے میر صاحب کے شعر میں اس کی رمق تک نظر نہیں آتی۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر صاحب نے براہ راست سوال نہیں پوچھا لیکن اس کے باوجود سوال کرنے کا انداز قطعی طور پر خوشگوار نہیں ہے اور پھر شوخی بھی میر صاحب کے شعر میں وہ مثبت معنی نہیں دے رہی ہے جو معنی ہمیں غالب کے شعر سے حاصل ہو رہے ہیں۔

لیکن غالب کے اس شعر کی تشریح کے آخر میں فاروقی صاحب نے بالکل کلاس روم کا سا سماں پیدا کر دیا ہے جب وہ یہ بتا رہے ہیں کہ "واضح رہے بیان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ۱۔ خبریہ ۲۔ انشائیہ۔ خبریہ بیان وہ ہے جس پر جھوٹ یا سچ کا حکم لگ سکے اور انشائیہ بیان وہ ہے جس پر سچ یا جھوٹ کا حکم نہ لگ سکے" لیکن میں سمجھتا ہوں ادب کے قاری کو اور خصوصاً غالب کے قاری کو اتنی معلومات تو خواہ مخواہ ہوتی ہیں اور پھر "شعریات" میں تو ہوتا ہی انشائیہ بیان ہے جس میں معانی کے امکانات بہت ہوتے ہیں۔ شاعری میں تو خبریہ بھی انشائیہ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ پھر معلوم نہیں فاروقی صاحب کو یہ بتانے کی کیوں ضرورت پیش آئی' شاید اس لیے کہ آئندہ اشعار میں وہ اس قسم کے بیانات کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔

کئی برس پہلے میں نے غالب کے اشعار پر کچھ لکھنا شروع کیا تھا' ابھی آغاز ہی کیا تھا پھر نہ معلوم کیوں میں نے لکھنا اچانک بند کر دیا۔ پھر پتا چلا کہ شمس الرحمن فاروقی صاحب نے اپنے شب خون میں یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے تو ایک طرح سے تسلی ہوئی کہ آج کے اہل قلم یہ کام کر رہے ہیں۔ میری خاموشی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ لیکن شب خون کا پرچہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ اب جو تفہیم غالب دیکھنے کا اتفاق ہوا اور پہلے ہی شعر کی تفہیم پر نظر پڑی تو خیال آیا میں نے خواہ مخواہ لکھنا بند کر دیا تھا۔ بہرحال جو کچھ اس پہلے شعر کے بارے میں لکھا تھا وہی ذیل میں درج کر رہا ہوں اور اتنا ہی درج کر رہا ہوں جتنا لکھا تھا۔ میرا مطلب ہے میں نے اپنی بات مکمل نہیں کی تھی ----- ہاں تو وہ چند فقرے یہ ہیں۔

"جو کائنات ہمارے اور آپ کے سامنے ہے اور جس کائنات میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں' اس کائنات کو بیک وقت نقش اور فریادی کہہ کر غالب نے اس کی دو متضاد خصوصیتوں کا اپنے خاص شاعرانہ انداز میں اظہار کیا ہے اور دو متضاد

خصوصیات حرکت اور سکون ہیں۔ نقش اس کائنات کے سکون کو ظاہر کر رہا ہے اور اس کا فریادی ہونا اس کے فعال ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن پوری کائنات کو نقش کہہ کر اس پر ایک ایسا سکون مسلط کر دیا ہے جس کو ہم نہایت آسانی کے ساتھ حیرت سے تعبیر کر سکتے ہیں لیکن عالم حیرت بذات خود ایسے سکون کا مظہر ہوتا ہے جس میں بے شمار فعال کیفیات مضمر ہوتی ہیں۔ غالب نے ان فعال کیفیات کو فریادی کہہ کر ان کی حرکت کو مزید تیزی بخش دی ہے۔ شوخی تحریر کی ترکیب اس مفہوم کو نہ صرف مزید واضح کر رہی ہے بلکہ اس کے معانی میں بھی اضافہ کا باعث ہوئی ہے۔ تحریر کی شوخی خالق کائنات یا مصور کا ذات کے مقصد تخلیق پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے یعنی ہزار فانی ہونے کے باوجود یہ کائنات اپنے اندر ایک ایسا عظیم مقصد رکھتی ہے جس کے باعث اس کا ہر ذرہ فریادی بنا ہوا ہے اور پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ خالق کائنات کو نہیں! اس کے اس ارضی خلیفہ کو جو غافل ہونے پر آتا ہے تو بڑی سے بڑی حقیقت کو ایک چٹکی میں اڑا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو کائنات کی ناپائیداری اور بے ثباتی سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ بس اس کا یعنی آدمی کا عرصہ حیات اتنا سا یا بہت تھوڑا سا ہے یہ کائنات ناپائیدار ہونے کے باوصف بے شمار معانی سے لبریز ہے اور یہیں سے اس شعر میں حمد کا پہلو نکلتا ہے" اور اس لیے یہ شعر بھی حمدیہ شعر ہی ہے۔ لیکن غالب کے انداز خاص کا حمدیہ شعر۔

(محیفہ' شمارہ ۱۳۹' اکتوبر' دسمبر ۱۹۹۶ء)

مولانا حافظ احمد حسن شوکت نذیر اخبار

شحنہ ہند و طوطی ہند و پروانہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لغت نقش بالفتح مصدر۔ لکھنا۔ پاؤں سے کانٹا نکالنا۔ نہرنے سے ناخون تراشنا۔ موچنے سے بال اکھاڑنا۔ غلط حرف یا خط چھیل ڈالنا۔ بازی کا داؤ حسب مراد آنا مثلاً" پوبارہ۔ ایک خراسانی باجہ کا نام۔ جمع نقوش۔ فریاد مرکب و مخفف فرایاد۔ یاد کے آگے آنا۔ بادشاہ یا حاکم کو اپنی مصیبت یاد دلانا۔ شوخ بالضم بواؤ معروف کپڑے اور بدن کی میل یا چیکٹ اور بواو مجہول دلیر۔ جلد۔ چالاک۔ بیباک۔ تحریر لکھنا۔ لونڈی یا غلام کا آزاد کرنا (چونکہ لکھنے سے دل کی بات آزاد ہو جاتی ہے اس لیے وضع ثانی میں لکھنا پر تحریر کا اطلاق ہوا) عمدہ کلام کہنا۔ حشو و زوائد سے کلام کو پاک کرنا۔ عکس اتارنا۔ گاتے وقت گلے سے ٹکری نکالنا۔ موئے قلم سے باریک خط کھینچنا۔ حکیم اقلیدس کی مشہور کتاب کو بھی تحریر بولتے ہیں۔ پیرہن ممکن ہے کہ جداگانہ لفظ مفرد بمعنی لباس وضع کیا گیا ہو اور ممکن ہے کہ پاے رہن یا پائے راہن سے مرکب ہو۔ کیونکہ لباس سر سے پاؤں تک انسان کی برہنگی کو (رہن) قید کر لیتا ہے۔ پیکر صورت۔ قسم۔ طریقہ۔ سانچہ۔ تختہ۔ تصویر۔ صورت کھینچنا۔ جس کا سایہ نہ پڑ سکے۔

حل: یہ شعر جناب باری کی حمد میں ہے نقش یا تصویر سے مراد کوئی خاص نقش یا تصویر نہیں بلکہ کل مصنوعات و مکونات عالم مراد ہیں۔ کیونکہ منجملہ نودنہ نام کے خدائے تعالیٰ کا ایک نام المصور بھی ہے۔ کلام مجید میں آیا ہے یصور فے الارحام کیف یشاء

یعنی خداے تعالیٰ ماؤں کے رحم میں جیسی صورت چاہتا ہے بناتا ہے اور رحم مادر میں ایک قطرۂ آب سے جناب باری کا صورت پیدا کرنا ایسی اعلیٰ درجہ کی صنعت ہے جس پر غور کرنے سے عقل انسانی ششدر رہ جاتی ہے۔ بچہ جب رحم مادر سے نکلتا ہے تو کاغذ جیسی ایک جھلی میں لپٹا ہوتا ہے اور پیدا ہوتے ہی روتا ہے یعنی فریاد کرتا ہے تو یہ معنی ہوئے کہ ہر مصنوع جب عدم سے وجود میں آتا ہے تو صانع حقیقی کی صنعت کا فریفتہ اور دلدادہ ہوتا ہے اور فریاد کرتا ہے کہ مجھ کو اس کی صنعت نے مار ڈالا یعنی میرا دل چھین لیا۔ شوخی سے مراد دلربائی اور معشوقی ہے۔ فریاد سے مراد تسبیح ہے یعنی ہر مصنوع اور موجود جب خلعت وجود پہنتا ہے تو زبان حال یا مقال سے جناب باری کی تسبیح کرتا ہے کلام مجید میں ہے یسبح لہ مافی السموات ومافی الارض یعنی جو شے زمین یا آسمان میں ہے خداے تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے۔ تسبیح کے معنی صانع حقیقی کو عیوب اور نقصانات سے پاک جاننا ہے یعنی جس صنعت سے اس نے ہم کو پیدا کیا ہے وہ ہر طرح کامل ہے اور جمیع نقصانات سے منزہ ہے۔

معنی دوم: خود تصویر اپنے مصور کی صناعی پر فریفتہ ہے اور اس کی دلربائی کی فریادی ہے اور چونکہ حاکم کے اجلاس میں استغاثہ کاغذ پر کھ کر پیش کیا جاتا ہے تو جس کاغذ پر تصویر کھینچی ہوئی ہے یہی گویا اس کا استغاثہ ہے۔ حضرت غالب مرحوم نے عود ہندی میں کسی کے استفسار پر اس شعر کی تشریح میں کہا ہے کہ ولایت میں مستغیث لوگ کاغذ کا پیراہن پہن کر حاکم کے اجلاس میں جاتے ہیں۔ مگر یہ تصریح نہیں کی کہ کونسی ولایت میں۔ شاید کہیں ایسا ہوتا ہو مگر جب خود کاغذی تصویر استغاثہ بن سکتا ہے تو اس تاویل کی چنداں ضرورت نہیں۔

معنی سوم: اگر شعر میں نقش سے سرود مراد لی جائے تو تحریر سے بھی تان یا ٹنگری یعنی آواز اور سردن کی آزاد اور بیخودانہ چلت پھرت مراد لی جائے گی۔ سرود کے ساتھ ٹنگری بہت موزوں ہے تو یہ معنی ہوئے کہ خود سرود ٹنگری کی خوبی پر غش ہے جو صورت سرمدی نے اس میں پیدا کی ہے اور جس کو سن کر بیجان تصویر بھی جس میں حس و حرکت نہیں وجد و حالت میں آکر صوفیوں کی طرح اپنا کاغذی پیرہن چاک کرنا چاہتی ہے اور سرود کی آواز اس لیے فریادی ہے کہ وہ اس ازلی اور ابدی صورت سرمدی کا جزو ہے (کیونکہ خدا تعالیٰ ہروقت متکلم ہے اور اس کی صفت کلام ازلی اور ابدی ہے کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی) جو بد قسمتی سے دنیا میں آ کر جدا ہو گئی ہے جیساکہ مولانا روم فرماتے ہیں۔

بشنو از نے چون حکایت می کند
و ز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

بس یہاں بھی یہی نفیر (فریاد) مراد ہے۔

معنی چہارم: تصویر صنعت صانع کی اس لیے فریادی ہے کہ اس کو کاغذی (فانی اور ناپائدار) لباس پہنایا یعنی صنعت تو کامل ہے مگر مصنوع کا وجود چند روزہ اور فانی ہے پس وہ اس غم سے ہروقت تکلیف میں ہے۔

بلاغت: پہلا مصرعہ سوال یعنی استفہام استعجابی کی صورت میں ہے مگر جواب مذکور نہیں کیونکہ سوال سے خود جواب نکلتا ہے یہ شاعر کا ایک تفنن طبع ہے کیونکہ اگر لفظ (کس کی) جو استفہام پر دال ہے دور کر دیا جائے تو صاف معنی یہ ہیں کہ ہر تصویر اپنے صانع پر عاشق ہے اور فن بلاغت کا قاعدہ ہے کہ اس قسم کے استفہام سے سوال کی عظمت و شان بڑھ جاتی ہے مقصود صرف سامع کو متنبہ یا آگاہ کرنا ہوتا ہے نہ کہ جواب حاصل کرنا۔ مثلاً کوئی آقا اپنے نوکر کو کسی قصور پر کہے کہ "تو نے یہ کیا حرکت کی" ظاہر ہے کہ مقصود سوال نہیں بلکہ استفہام سے سامع کا ملزم یا ساکت کرنا مراد ہے۔

شاداں بلگرامی

مصنف = روح المعانی شرح دیوان غالب اردو

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

لغات: نقش: معنی تصویر۔ معنی و نبی دو یا زیادہ رنگوں سے زینت دینا۔
شوخی: طراری' بے باکی' بے شرمی' چنچل پنا۔

کاغذی پیرہن۔۔۔ یا پیرہن کاغذی۔ کاغذیں جامہ و جامہ کاغذیں' جامہ کاغذ کہ فریادیان پوشند' در قدیم رسم بودہ (بہار عجم)
نوشیروان عادل نے اپنی خواب گاہ سے باہر تک ایک زنجیر باندھ رکھی تھی۔ خواب گاہ والے سرے پر ایک گھنٹی بندھی تھی' ہر داد خواہ اس زنجیر کو آ کر ہلاتا تھا اور وہ کاغذ کے کپڑے پہنے ہوتا تھا۔ نوشیرواں اسے اپنے پاس بلا لیتا اور داد رسی کرتا تھا۔ سلسلہ جنبانی محاورہ اسی عمل سے بنا ہے۔ جہانگیر نے بھی اس کی نقل اتاری تھی' اسے زنجیر داد کہتے ہیں۔ نوشیرواں اس کا موجد ہے۔
مرزا رضا قلی ہدایت شیرازی اپنی فرہنگ انجمن آرای ناصری میں تحریر فرماتے ہیں کہ "وقتی در شہری مقرر کردہ بودند کہ ہر ظلمی کہ از حکام برسد جامہ از کاغذ پوشیدہ
بپای علمی کہ از جانب بادشاہ در میدان خاصہ نصب کردہ بودند و آنرا علم دادی نامیدہ بودند رفتہ بعد تحقیق حال رفع ظلم بشود۔ حافظ گفتہ اند

کاغذیں جامہ بخونابہ بشوئیم کہ فلک
رہنمونیم بپای علم داد نہ کرد

بابا فغانی

زخوباں دادی خواہم فغانی مہربانی کو
کہ سازد کاغذیں پیراہن از طومار افسوں ہم

کمال اسمٰعیل

کاغذیں جامہ پو شید و بدر گاہ آمد
زادۂ خاطر من تا بدی داو مرا

کاغذ مرکب از کاغ و دال نسبت' کاغ بمعنی آواز زاغ۔ ہندی میں کا کا گوے کو کہتے ہیں۔ چونکہ کاغذ کے ہلانے سے اس میں آواز کوے کی بولی سے مشابہ نکلتی ہے' اس لیے قرطاس کا نام کاغذ ہوا۔ اس کا معرب کاغذ آخر بذال معجمہ ہے' کواغذ اس کی جمع لاتے ہیں۔ لیکن صاحب منجد نے آخر میں دال مہملہ ہی لکھا ہے۔ عربی میں قرطاس و طرس بکسر اول کہتے ہیں۔

سب سے پہلے چین میں روئی سے سفید رنگ کا کاغذ بنایا گیا۔ تیسویں ہجری میں سمرقند میں رائج ہوا۔ علی بن محمد فارسی صاحب تاریخ عرب لکھتے ہیں کہ پچاس ہجری میں جب سمرقند فتح ہوا تو یوسف بن عمرو نے کاغذ بنانا سیکھا اور مکے آکر لوگوں کو اس کا بنانا سکھایا۔ لیکن میکائیل کشمیری نے ۸۰ھ میں اس وقت کے لحاظ سے عمدہ بنانے کی تعلیم کی۔ کاغذ خاں بالیغ (چینی) سمرقندی' شامی' مشرق میں مشہور تھے۔

مسعود سعد کے شعر سے معلوم ہوتا ہے۔

آں زاغ گر کہ بر ہوا ی کاغذ
یک نیم از مداو و نیمی کاغذ

کہ کافیون مصدر بھی تھا بمعنی آواز کردن زاغ' کیونکہ ی کاغذ' حال کا صیغہ کاغیدن سے ہے اور شعرا بلق کوے کی تشبیہ میں ہے۔ کاغذ سے مراد سفید کاغذ ہے۔

اس طرح مطلع حمدیہ کے معنی حضرت غالب علیہ الرحمہ نے عودِ ہندی کے ایک جملے میں لکھے ہیں۔

ہستی دنیاوی چونکہ مبدءِ حقیقی سے دور ہو جانے کا باعث ہوئی ہے۔ لہٰذا تصور (انسان) باوجودیکہ اس کی ہستی محض اعتباری ہے مگروہ بھی مبدء سے جدا ہو کر رنج و ملال میں گرفتار ہے اور کاغذ کا لباس پہن کر فریاد کرتی ہے اور داد خواہ ہوتی ہے۔ جبھی تو " الست بربکم" کے جواب میں "بلیٰ" کہا۔ مگر جسم قبول کر کے دنیا میں آنے کے بعد مکروہات دنیوی اور ضروریات جسمانی میں پھنس کر وہ حالت و کیفیت سابقہ باقی نہ رہی۔ لہٰذا دنیوی ہستی سے نفرت اور بیزاری ہے۔ وہی عالم ارواح کا شوق و ذوق ہے اس لیے فریادیوں کا ایسا لباس پہن کر اپنے اوپر ظلم و ستم ہونے کا داد خواہ ہے۔

اگرچہ نقش کے لحاظ سے لفظ تحریر اور معشوق ہونے کی وجہ سے لفظ شوخی متناسب الفاظ ہیں مگر معنویت دور ہوتی جاتی ہے جب تک کہ اس شعر میں کوئی لفظ اظہار شوق اور تقریب الٰہی کے لیے اور نفرت دنیا کے لیے نہ ہو۔ لفظ تحریر جو قافیہ میں آپڑا ہے سب سے زیادہ مخل معنی ہے۔

میں اطلس میں ٹاٹ کا پیوند لگاتا ہوں۔ اربابِ کمال اگر پسند کریں تو خیر ورنہ مردود تو ہے ہی' میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں میں سے کوئی مصرع ہو بلکہ اس مفہوم کو ادا کرتا ہوا کوئی چست مصرع ہو۔

نقش فریادی ہے کس ہستی غم تاثیر کا
نقش۔ فریادی ہے کس کا دوری و گیر کا

نقش فریادی ہے کس کے جو واننگیر کا

جناب غالب مولانا روم کی مثنوی کے پہلے شعر کے۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند   وزجدائیہا شکایت می کند

کے مفہوم کو کہنا چاہتے ہیں۔

از نیستان تامرا ببریده اند   از نفیرم مرد وزن نالیده اند

سلطان محمود ناصر

(از دبستان غالب)   نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

مرزا غالب کا یہ مطلع سرو یوان ان کے شاعرانہ مقام کی نشاندہی اور طرز فکر کی پوری نمائندگی کرتا ہے۔ الفاظ کے پردے میں موسیقی، مصوری اور معنی آفرینی کی جن سخن فہیوں کو جستجو رہتی ہے۔ ان کے حسن ساعت اور ذوق نظر کے لیے یہ مطلع فردوس گوش اور جنت نگاہ سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔

یہی مطلع چونکہ ارباب علم کے لیے ایک اختلافی مسئلہ بنا رہا ہے اس لیے اس کے محاسن پر قلم اٹھانے سے پہلے اس پر اعتراض اور تنقید کا مختصر ساجائزہ لینا ضروری ہے۔

(۱) خود مرزا غالب نے اس شعر کی تشریح میں صرف "کاغذی پیرہن" کی وضاحت ہی پر اکتفا کیا ہے جو قاری کے لیے ناکافی ہے۔

مرزا کے الفاظ یہ ہیں:

"ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

(۲) اتفاق سے مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں اس شعر اور اس کی تشریح سے متعلق کچھ نہیں لکھا، اگرچہ کلام غالب کے بعض پیچیدہ حصوں پر ان کا تبصرہ نہ صرف یہ کہ نہایت جامع شگفتہ اور پر اعتماد ہے بلکہ انہی کے انداز تعارف سے غالب کو سمجھنے کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے۔

(۳) علامہ نظم حیدر طباطبائی، شارح کلام غالب نے اس شعر کے باب میں غالب کی اپنی تشریح پر نہایت بامعنی اضافہ کرنے کے باوجود، نہ معلوم ذہن کی کس کیفیت میں اختتام پر یہ لکھ دیا ہے:

"آخر خود لوگوں نے ان کے منہ پر کہہ دیا کہ شعر بے معنی ہے۔"

طباطبائی نے شعر پر بحث کے دوران جو نکات بیان کیے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

> "غرض مصنف کی یہ ہے کہ ہستی میں مبداء حقیقی سے جدائی و غیریت ہو جاتی ہے اور اس معشوق کی مفارقت ایسی شاق ہے کہ نقش تصویر تک فریادی ہے اور پھر تصویر کی ہستی کوئی ہستی نہیں مگر فنا فی اللہ ہونے کی اسے بھی آرزو ہے کہ اپنی ہستی سے نالاں ہے......"

ایسی اچھی تشریح کے بعد طباطبائی کو یہ بات کھٹک جاتی ہے کہ ایران میں داد خواہ کا حاکم کے سامنے کاغذی لباس پہن کر جانا انہوں نے سنا اور یہاں سے وہ شعر کو بے معنی ثابت کرنے میں زور قلم صرف کرتے ہیں اور بالآخر شعر کے مہمل اور بے معنی ہونے کا فیصلہ دے دیتے ہیں۔

پروفیسر والہ دکنی کی "واضح صراحت" حالی کی "یادگار غالب" سے بھی تقریباً ایک دو برس پہلے ۱۳۱۳ھ بمطابق ۹۶-۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھی اور بہ اعتبار تقدم وقت طباطبائی کی شرح سے تقریباً چار برس پہلے طبع ہو چکی تھی' چونکہ والہ کی شرح کلام غالب پر محض اشارات کی حامل ہے' اس لیے طباطبائی کو نہ صرف یہ کہ کلام غالب کا صحیح معنوں میں پہلا شارح ہونے کا شرف حاصل ہے بلکہ جو عالمانہ معیار شرح وہ قائم کر گئے ہیں وہاں تک اب بھی کسی کی رسائی نہیں ہے۔ تاہم ایک کمزوری اس شرح میں اس لیے آگئی ہے کہ کوئی شعر اگر جلد ان کی عالمانہ گرفت میں نہ آئے تو وہ زیادہ غور و فکر کو کسر شان سمجھتے ہیں اور جو کچھ فوراً زبان قلم پر آئے بیان کر دیتے ہیں' ساتھ ہی انہیں اپنے بعض زاویہ ہائے نظر پر اس درجہ اصرار ہوتا ہے کہ اگر شعر ان پر پورا نہ اترے تو وہ اسے خطائے شاعری ٹھہرا دیتے ہیں۔

بے محل نہ ہو گا اگر طباطبائی کی نفسیاتی کیفیت کے اظہار میں انہی کا ایک جملہ تحریر کر دیا جائے جو انہوں نے شرح دیوان غالب کے بارے میں اپنی ادبی زندگی کے واقعات کے بارے میں لکھا ہے:

> "اور خدا بھلا کرے نواب عماد الملک کا دیوان غالب کی شرح محض ان کی فرمائش سے میں نے لکھی اور کوئی ہوتا تو اس کام کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا"

(۴) طباطبائی کے بعد کئی ایک قابل ذکر شارحین نے اس مطلع پر قلم اٹھایا ہے' لیکن یا تو انہوں نے حسرت موہانی کی طرح غالب ہی کے بیان کردہ مطلب پر اکتفا کیا ہے' یا نظامی بدایونی' سہا' بیخود دہلوی' جوش ملسیانی اور چشتی کی طرح مختصر معانی بیان کر دیے ہیں یا احتجاجاً یہ اضافہ کیا ہے کہ اس شعر کو بے معنی کہنا ظلم ہے' البتہ شاداں بلگرامی نے خاصی طویل بحث بھی کی ہے' اصلاحیں بھی دی ہیں اور کسی نتیجے پر بھی نہیں پہنچے۔

(۵) "گنجینہ تحقیق" میں پروفیسر بیخود موہانی نے نو (۹) شرحوں پر اجمالی رائے اور معترضین کلام غالب کے مسکت جوابات دینے کے باوجود اس شعر کے بارے میں خاموشی ہی اختیار کی ہے۔

(۶) "مطالعہ غالب" میں اثر لکھنوی' غالب کے اکثر اشعار پر حنفی نقطہ نظر سے تنقید کرنے کے باوجود اس شعر کی معنی آفرینی پر دلچسپ بحث کرتے ہیں اور ایک قابل غور نکتہ یوں بیان کرتے ہیں:

> "... کاغذی لباس کی تلمیح ایک ضمنی خوبی ہے نفس مضمون کا سمجھنا رسم کا محتاج نہیں۔"

غرض کہ ان وجوہات کی بنا پر یہ مطلع ہمارے شعر و ادب میں اب تک ایک اختلافی مسئلہ بنا رہا ہے۔ تاہم سوال یہ پیدا ہوتا

ہے کہ اردو کے سب سے بڑے شاعر مرزا غالب جنہوں نے جملہ کمالات شاعری کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ اپنے دیوان کی ترتیب و تدوین میں بے پناہ ذہانت اور احتیاط سے کام لیا ہے' یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ان کے دیوان کی ابتدا ہی ایک مہمل اور بے معنی شعر سے ہو؟ یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ غالب کو اپنے وقت کے عظیم ترین سخن فہموں اور نقادوں کی صحبت میسر تھی' لہٰذا یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ان کے عہد کے کسی باریک بیں کو مطلع سر دیوان کے مہمل اور بے معنی ہونے کا خیال نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے اظہار رائے کی ضرورت محسوس کی' چنانچہ ظاہر ہے کہ یہ غلط فہمی' بعد میں انہی وجوہات سے پیدا ہوئی جن کا ذکر ابتدا میں وضاحت سے آچکا ہے۔

عشق تجسس اور استغراق سے کلام غالب کا بار بار مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ غالب کے کلام کو منفرد اور لازوال بنانے میں جن اوصاف کلام کا دخل ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ اشعار کی صوتی نغمہ ریزی'
۲۔ تنوع کی سحرکاری'
۳۔ آمد و آورد کی حسین رنگ آمیزی'
۴۔ معنی آفرینی کی دل کش دقیقہ سنجی'
۵۔ نادر الفاظ اور تراکیب کی نیرنگی'
۶۔ ظرافت متین کی چاشنی'
۷۔ تشبیہ و استعارے کی خوش اسلوبی'
۸۔ اشارے اور کنایے کی دلکشی'
۹۔ فلسفے کے ادق مضامین کی نرم و نازک ادائیگی'
۱۰۔ مشاہدے کی پہنائی'
۱۱۔ پیچیدہ نفسیات عشق تک رسائی'
۱۲۔ احساسات پنہاں کی ترجمانی'
۱۳۔ مکمل اور متحرک تصویر نگاری۔
۱۴۔ اور' روش عام سے بیگانگی۔

مرزا کی شاعری کی ان بنیادی خصوصیات کے اس سرسری جائزے کے بعد آپ زیر نظر مطلع پر غور فرمائیں اور دیکھیں کہ یہ ایک شعر غالب کی شاعری کے کتنے بنیادی محاسن کا حامل ہے۔

سب سے پہلے جو چیز ذوق سلیم کو مسحور کرتی ہے وہ الفاظ کی مصوری اور عبارت کی نغمگی ہے۔ ذرا شعر کو محض تحت اللفظ پڑھ کر دیکھئے۔۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا؟
کاغذی ہے' پیرہن ہر پیکر تصویر کا

یہ بات مسلمہ ہے کہ شعر کا مطلب اس کے الفاظ ہی سے نکلتا ہے' چنانچہ اس شعر کے معنی تک رسائی کے لیے بھی اس کے الفاظ اور عبارت کا تجزیہ ہی مد ہو سکتا ہے۔

نقش = صورت' شبیہ' تصویر' نگار اور یہ لفظ بجائے خود نقش و نگار کا تصور دیتا ہے۔

فریادی = فریاد کرنے والا' انصاف چاہنے والا' داد خواہ

شوخی تحریر = رنگینی تحریر یہ ترکیب ایک شوخ مصور کا وجود اپنے اندر رکھتی ہے اور شوخی حسن کے پہلو سے خالی نہیں ہوتی۔

کاغذی پیرہن = ناپائیدار لباس' اور تلمیحی طور پر کاغذ کا وہ لباس جو غالب کی اپنی تشریح کے مطابق داد خواہ' حاکم کے سامنے پہن کر جاتا تھا تاکہ بہ زبان حال فریادی دکھائی دے۔

پیکر تصویر = تصویر کا جسم' گویا وجود انسان کا پورا تصور اس ترکیب کے پہلو سے ابھرتا ہے۔

الفاظ کے ان معانی اور تجزیے کی روشنی میں اس مطلع کا مجموعی تصور یہ ہے کہ ایک شوخ اور حسین مصور نے بہ انداز بے نیازی ایک ایسا نقش اپنی شوخی ادا سے بنا دیا ہے جس کی ہر تصویر کاغذی لباس پہن کر ایک پیکر فریاد بن گئی ہے اور حیرت و بیچارگی میں بہ زبان حال اپنے حسین مصور کی اس شوخی پر احتجاج کر رہی ہے کہ ایک تو اسے تخلیق کر کے بے ثابت اور ناپائیداری کا غم عطا کر دیا گیا ہے دوسرے اپنے تصور سے کاغذ پر منتقل کر کے مصور نے اسے اپنی جدائی کا ناقابل برداشت صدمہ بھی دیا ہے۔

اب کنایہ کی آڑ سے اس شعر کے حسن کا نظارہ کریں تو بلیغ معنی یہ نکلتے ہیں:

نقش سے مراد نقشہ عالم ہے اور شوخی تحریر کی ترکیب سے اسی نقاش ازل کا تصور وابستہ ہے جس نے یہ ساری کائنات تخلیق کی ہے اور بقول شاعر چونکہ یہ تخلیق اس کی محبوبانہ ادائے شوخی و استغنا کا نتیجہ ہے اس لیے کائنات کی ہر شے کو شکایت ہے کہ اسے ہستی میں لا کر ایک طرف تو ناپائیدار کر دیا گیا ہے دوسری طرف اسے مقام ارفع سے گرا کر پست کر دیا گیا ہے بصورت دیگر اگر وہ خلق نہ ہوتی تو اپنے خالق ہی کا ایک حصہ رہتی اور اسے اپنے زوال اور فنا کا کوئی خطرہ نہ ہوتا' جیسا کہ خود غالب نے ایک جگہ کہا ہے۔

نہ تھا کچھ' تو خدا تھا' کچھ نہ ہوتا' تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے' نہ ہوتا میں' تو کیا ہوتا؟

بعض شارحین نے اس مقام پر مولانا روم علیہ الرحمتہ کے اس شعر کا حوالہ بھی دیا ہے جو اسی مفہوم کی ایک دوسری شکل ہے۔

بشنو' از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

اس تشریحی وضاحت کے بعد اگر آپ غالب کے بیان کردہ مطلب پر غور کریں تو بقول اثر لکھنوی کاغذی لباس کی تلمیح ایک ضمنی خوبی ثابت ہو گی اور شعر کا یہ معنوی پہلو کہ ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو' موجب رنج و ملال و آزار ہے' شعر کے لطف کو دوبالا کر دے گا۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ بھی قابل توجہ ہے۔

ہمارے شعراء اپنے دواوین کا آغاز ذکر خدا سے کرتے ہیں۔ غالب نے بھی اس بات کو نظرانداز نہیں کیا ذکر خدا ضرور کیا ہے، مگر اپنے مخصوص انداز اور مجذوبانہ شوخی کے ساتھ۔

شعر کی ان معنوی خوبیوں کے بعد ذرا الفاظ کے بے ساختہ حسن مناسبت پر بھی غور فرمائیں۔

نقش، شوخی تحریر، کاغذی پیرہن اور پیکر تصویر، کس قدر متناسب اور ایک دوسرے سے منسلک الفاظ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مصور کے پورے نگار خانے کا سامان ان الفاظ نے فراہم کر دیا اور لفظی مناسبت کی یہ فراوانی اس شعر میں ملتی ہے جو دیگر اوصاف معنوی و شعری کا ایک ہجوم اپنے اندر رکھتا ہے۔

گوہر ملسیانی

آج جب مختلف اہل علم و ادب کے مباحث پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجلس اقبال کے زیر اہتمام غالب کی صد سالہ برسی کی ایک نشست یاد آرہی ہے جب ایک تقریب میں غالب کی شعری روایات پر مختلف اصحاب علم نے مقالات پیش کئے تھے۔ اس وقت راقم الحروف نے اسی مطلع کے حوالے سے ایک پیپر پڑھا تھا جو بعد میں نوائے وقت ملتان میں بھی شائع ہوا تھا۔ اگرچہ مذکورہ بالا فاضل اہل علم کی تشریحات اپنے تصورات اور تضمنیات کے مطابق صحیح اور واضح ہوں گی لیکن میری نظر میں غالب کا یہ مطلع حمدیہ مطلع ہے اور اسے سرِ دیوان پیش کرنے کا انداز بھی حسب روایت غالب کی جدت طرازی کا مظہر ہے۔ آیئے اس کی تشریح کی طرف چلتے ہیں۔

حل لغت کے لحاظ سے اس شعر کے مشکل الفاظ کے مفاہیم و مطالب کچھ یوں ہیں۔

نقش = صورت مراد وہ بچہ جو ماں کے پیٹ سے باہر آکر پہلا سانس لیتا ہے۔

فریادی = فریاد کرنے والا۔ ہر بچہ جب اس نگار خانہ عالم میں آتا ہے اور پہلا سانس لیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی پہلی چیخ بھی ابھرتی ہے اور طبی حوالے سے دیکھا جائے تو جو بچہ پیدا ہوتے ہی چیخ یا رونے کی آواز نہیں نکالتا اسے صحت مند تصور نہیں کیا جاتا اور اس طرح عام مشاہدے کی بات ہے ہر پیدا ہونے والا بچہ اس دنیا میں پہنچتے ہی روتا ہے۔

شوخی تحریر = تخلیق کی شوخی۔ خالق کائنات کا عمل تخلیق اس کی رعنائی اور حسن و جمال۔

کاغذی پیرہن = کاغذ کا لباس، ہر پیدا ہونے والا بچہ ایک باریک جھلی میں لپٹا ہوا ہوتا ہے وہ جھلی اس بچے کا کاغذی پیرہن ہوتی ہے پیکر تصویر، ہر خوبصورت نقش و نگار، پیکر، ہر حسین بچہ۔

پیکر تصویر ہر نومولود بچے کے لیے کنایہ ہے۔

مفہوم واضح ہو چکا ہے اور اس انداز سے سوچنا غالب کی ندرت فکر کا کرشمہ ہے اس لحاظ سے یہ شعر خالق کائنات کی حسین تخلیق۔ افضل و اعلیٰ کاریگری کی تعریف ہے۔ غالب حیرت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تخلیق کی شان بیان کرتے ہیں کہ کس طرح اس دنیا میں آنے والا ہر بچہ اس جدائی اور مفارقت کے غم کی وجہ سے فریاد کناں ہے کہ اے باری تعالیٰ میں پیدائش سے پہلے تیرے نور کا ایک حصہ تھا۔ مجھے تیرا قرب حاصل تھا۔ مجھے حسن و جمال میں رہنے کا شرف حاصل تھا۔ غالب ہی کا شعر ہے اس مفہوم کو ایک اور مقام پر یوں کہتے ہیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

اب مجھے دور کیا جارہا ہے۔ مجھے اس دنیا کے حوالے کیا جارہا ہے۔ جو فانی ہے۔ جس میں مختلف غم ہیں۔ زندگی کے مختلف مراحل ہیں۔ چنانچہ اس مفارقت میں ہر نومولود چلاتا ہے۔ صدمہ حقائق سے دوری اسے اس دنیا میں آتے ہی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس دنیا میں ہر آنے والا حسین و جمیل پیکر اسی طرح کاغذی پیرہن میں ملبوس آتا ہے۔ اس دنیا میں آنے کے بعد اس کا وہ مقام قرب اسی سے چھن جاتا ہے وہ اس وسیع و عریض کائنات میں غم و آلام کا شکار ہو جاتا ہے وہ دنیا کی آلائشوں میں کھو جاتا ہے۔ اس حسن حقیقی سے دور ہونا اسے پریشان کر دیتا ہے۔ جوں جوں یہ بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اتنا ہی اپنے قرب کی مسرت کو بھولتا چلا جاتا ہے رومانوی شاعر ورڈز ورتھ نے بھی اس تصور کو اپنے کلام میں کئی جگہ پیش کیا ہے کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ اس دنیا میں آکر اپنی عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ قرب حضوری سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اس کا وہ حسن و جمال بھی گھٹتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات وہ دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر حقیقت کو بھول جاتا ہے۔

میں نے سادہ سے الفاظ میں اس شعر کے مطالب بتانے کی کوشش کی ہے میری یہ جرات نہیں کہ سکہ بند فضلائے قلم کی آراء کو جھٹلا سکوں اور نہ ہی علمی مباحث کی بھول بھلیوں میں کھو کر اپنے آپ کو منکر ثابت کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ میری اپنی رائے ہے میں غالب کے دیگر کئی اشعار میں بھی مفہوم کے حوالے سے عام روایتی یا عمیق علمی مباحث سے اختلاف رکھتا ہوں اور یہ ہر طالب علم اور خصوصاً غالب و اقبال جیسے شعرائے کرام کے خوشہ چینوں کی کمزوری بھی ہے کہ وہ بلند بانگ دعویٰ رکھنے والے نقاد و فاضلین سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مرزا غالب کا یہ شعر اس کے حمدیہ تصورات کا حسین پیکر ہے اور غالب میں ندرت فکری نہیں روایت کو ندرت سے پیش کرنے کی قدرت بھی ہے اور ایک شعر کے پیش کرنے سے اسی ندرت روایت کا پہلو سامنے آتا ہے کہ غالب نے حمدیہ شعر کو دیوان کے شروع میں پیش کرنے کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔

"زمانی اعتبار سے غالب کا ظہور ایک ایسے دور میں ہوا جب ہندوستان کی پرانی تہذیبی روایت دم توڑ رہی تھی اور مغرب کی یلغار سے نہ صرف نئے علوم کا در کشادہ ہو رہا تھا بلکہ پرانے معاشرے کی ہڈیوں پر ایک نئے معاشرے کی تعمیر بھی شروع ہو گئی تھی۔ اس لحاظ سے غالب کے زمانے میں جہاں ایک طرف شکست و ریخت کا عمل جاری تھا وہاں دوسری طرف ایک نئی تعمیر بھی معرض عمل میں آرہی تھی۔" (انور سدید' نقوش غالب نمبر ۳ ص ۱۶۷)

(مرسلہ حافظ اظہر علی' پنجاب ہائر سیکنڈری سکول آف سائنس صادق آباد)

غزل

مخلص وجدانی۔ مظفر آباد

بند در ہو تو وا کرے کوئی
میری مشکل کا کیا کرے کوئی

ایک سے لوگ شہر کے سارے
کس کے در پر صدا کرے کوئی

بن کے خوشبو وہ گل میں رہتا ہے
گل سے خوشبو جدا کرے کوئی

آج فرصت میں ہیں کئی طوفاں
روشن اپنا دیا کرے کوئی

شوق دیدار دیکھنا مخلص
پھول بن کر ملا کرے کوئی

اعزاز احمد آذر

غزل

(نذر غالب)

تنگی سے اپنی اب محفل کو گرمائیں گے کیا
جو اسیران بلا ہیں گیت وہ گائیں گے کیا

رشتہ ذہن و قلم اور قصہ دار و رسن
جو نہیں خود بھی ہیں سمجھے مجھ کو سمجھائیں گے کیا

ہاتھ کاٹے ہیں زباں بھی کاٹ ڈالو گے مری
اور کچھ اس سے سوا بھی آپ کر پائیں گے کیا

کیا ہوا اب کے نذر صیاد کی گر ہو گئے
یہ بہاروں کے زمانے پھر نہیں آئیں گے کیا

مفتیان شہر کا قصہ ہی آذر چھوڑ دے
بے ضمیری جن کا شیوہ ہے وہ شرمائیں گے کیا

غزل

ارشد ملتانی

کھلتا جاتا ہے بھرم ہر عقدۂ تقدیر کا
رنگ نکھرا ہے حنا کے ناخن تدبیر کا

وہ بھی ہیں شائستہ آداب الطاف و کرم
میں بھی قائل ہوں نگاہ ناز کی تاثیر کا

تو نے اب تک خواب ہی دیکھے ہیں راہ شوق سے
مرحلہ آساں نہیں ہے منزل تعبیر کا

ان کی آنکھوں کے صحیفوں میں ملا جس کو مقام
مرتبہ کتنا ہے اونچا سر مئی تحریر کا

ورنہ ساحل کا سکوں برباد کر دیتا ہمیں
معترف ہونا پڑا ہر موج دامن گیر کا

زخم کھا کر بھی قفس میں مائل پرواز ہے
حوصلہ ہے دید کے قابل دل نخچیر کا

حلقہ زنجیر کی مانند۔ ہے ہر شاخ گل
پھر بہاروں نے نکھارا ہے چمن تعزیر کا

آج مقتل میں سروں کے خوب جلتے وہ چراغ
منتظر ہر شخص ہے اک جلوۂ شمشیر کا

تیرے پروانے سلامت تیرے دیوانوں کی خیر
بے صدا رہتا نہیں خانہ کوئی زنجیر کا

ہو گیا سب کچھ نثار موج طوفان غم
اک سہارا رہ گیا ہے حسرت تعمیر کا

کیوں نہ ہو ارشد مرے اشعار میں طرفہ گداز
معتقد غالب کا ہوں اور معترف ہوں میر کا

غزل

دل نواز دل

مردہ ہے کوئی دیکھ تو زندہ کہیں جسے
ایسا کوئی نفس ہے کہ عیسیٰ کہیں جسے

آزاد دیکھنے میں ہے پر بولتا نہیں
ایسا کوئی نہیں لب گویا کہیں جسے

ہر شخص کی ہے تنگ نظر مانتا ہوں میں
دل بھی کوئی نہیں کہ کشادہ کہیں جسے

دن چڑھ گیا ہے اور وہ آیا نہیں ابھی
گھر میں نہیں ہے رات کا بھولا کہیں جسے

ہر ملک کی ہے ناک جہاں میں جدا جدا
کوئی نہیں کہ چاند سا نقشہ کہیں جسے

گھر اس قدر بڑا ہے کہ چھوٹا کہے کوئی!
پر صحن بھی تو ہو کہ کشادہ کہیں جسے

ہر شخص ہے زمین کا پیوند اے فلک
کوئی نہیں کہ چاند کا ٹکڑا کہیں جسے

نین اور نقش ٹھیک ہیں اس شخص کے مگر
ایسا بھی وہ نہیں ہے کہ تم سا کہیں جسے

ہم درد کوئی بھی تو ملے اس طرح کا دل
زخم جگر کا کھول کے دکھڑا کہیں جسے

غزل

وفا حجازی (مرحوم)

پھر وہ اشکوں کا بھنور یاد آیا
اک سمندر کا سفر یاد آیا

تم نے دیکھا تھا یہ ساحل پہلے
اک سفینہ تھا ادھر یاد آیا

پھر مری آنکھ میں کرنیں پھوٹیں
پھر وہ ہنگام سحر یاد آیا

کس قیامت کا سفر تھا یارو!
مجھ کو ہر خاک بسر یاد آیا

زلف محراب جبیں پہ دیکھی
منظر شق قمر یاد آیا

جس جگہ جا کے قدم رکتے تھے
ایک کھلتا ہوا در یاد آیا

منزلیں جس کو صدا دیتی تھیں
آج وہ میر سفر یاد آیا

جب سر شاخ پرندے چہکے
ایک ٹوٹا ہوا پر یاد آیا

غزل

خادم رزمی

چاہتا ہوں مگر نہیں آتی
سبز رت میرے گھر نہیں آتی

گھاؤ ناسور بنتے جائیں اور
چارہ گر کی خبر نہیں آتی

ایک ایسی بھی چشم تر ہے جو
ہر کسی کو نظر نہیں آتی

دل پہ اک ابر غم برستا ہے
آنکھ ایسے تو بھر نہیں آتی

دن بھی نکلے، مگر کہاں نکلے!
شب بھی آتی ہے، پر نہیں آتی

بے طلے دکھ بھی، خشک ہونے میں
کیوں میری چشم تر نہیں آتی

میرے منہ کو وہ تکنے لگتا ہے
جب اسے بات کر نہیں آتی

بس وہی پائمال ہوتی ہے
خاک، جو تہہ سر نہیں آتی

ایک منظر ہے رت بدلنے کا
دھوپ زیر شجر نہیں آتی

اب اسی راکھ میں ڈھلے رزمی!
جو بظاہر نظر نہیں آتی

نذرِ غالب

سجاد مرزا

شب کو اک دریچے سے چاند جھانکتا پایا
روشنی کے ہالے میں جو گھرا ہوا پایا!
سرد رت کے آتے ہی دل سلگنے لگتا ہے
یاد کے شبستاں میں روز رتجگا پایا!
اجنبی کی صورت وہ جب قریب سے گزرے
اس وصال لمحے میں ربط ٹوٹتا پایا
کون ہے تصور میں، کس کو سامنے لاؤں
آج تک نقاب اس کا میں نہیں اٹھا پایا
وقت کے تغیر کو وہ نظر میں رکھتے ہیں
بوریا نشینوں نے علم بے بہا پایا!
خود کو فتح کرنے کا آگیا خیال اس کو
تخت جب سکندر نے ڈولتا ہوا پایا
آج موسم گل ہے، کل خزاں بھی آئے گی
زندگی کا ہر موسم کس نے ایک سا پایا

نذرِ غالب

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
غالب

علی آذر

شہر کا شہر ہے معروف بکا میرے بعد!
اور اس شخص نے دامن کو سیا میرے بعد
عمر گزری مری اس سوختہ سامانی میں
دل تمہارا ہوا گلزار سا میرے بعد
دوست آزردہ نہیں ہیں تو مجھے کیا پروا!
روتی ہے سسکیاں لے لے کے صبا میرے بعد
تیرگی سے کوئی خورشید درخشاں نکلے
مہرباں اور بھی ہو جائے خدا میرے بعد
میں جو مرجاؤں تو تم کیوں مرو میرے غم میں
نکہت و رنگ رہیں تم پہ فدا میرے بعد
لے کے جاتے ہو مجھے دار سجانے کے لیے
یہ بھی سوچو کہ کسے دوگے سزا میرے بعد
میں کہ غربت کی ہوں منزل پہ ابھی تک آذر
مل ہی جائے تمہیں منزل کا پتا میرے بعد

میرزا اسد اللہ خاں غالب

فراز صدیقی

نہیں درد دل سے بڑھ کر کوئی ترجمان غالب
کہ شعور زندگی ہے مئے آستان غالب

کوئی قصر شعر ہو یا کوئی محفل سخن ہو
وہاں مثل ماہ و انجم ہے عیاں نشان غالب

کریں اہل علم غالب کی ستائش سخن کیا
ادب اور شعر اردو میں ہے صرف جان غالب

ہے نظر نواز غالب کی ادائے دل نوازی
مرے گلشن وطن کی ہے زباں، زبان غالب

جو پاک سرزمیں میں ہے دیار ہند میں بھی
وہی اعتراف عظمت، وہی گلستان غالب

ہے سرود سرمدی بھی ہے فراز معرفت بھی
یہ مسائل تصوف، تشنہ بیان غالب

"تے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا"

زمین غالب

فراز صدیقی

خائف نہیں ہوں خود کو سردار دیکھ کر
نازاں ہوں اپنی جرات کردار دیکھ کر

ہم وہ ہیں جن کے اور بھی بڑھتے ہیں حوصلے
جہد طلب کو عقدۂ دشوار دیکھ کر

گھبرا رہے ہیں تیرگی شب کے تاجور
صبح جہانفروز کے آثار دیکھ کر

میں نظم کر رہا ہوں حقائق نئے نئے
فرسودہ ذکر و فکر کو بیکار دیکھ کر

ہیں بجکلکہ لرزہ براندام اے فراز
جمہور کو آمادۂ پیکار دیکھ کر

غالب کی بد مذاقیاں

مرزا یاس یگانہ

اگرچہ محاکات اور تخیل دونوں چیزیں، شعر کے اصل عناصر ہیں مگر شاعری (اپنے صحیح معنی کے اعتبار سے) دراصل تخیل کا نام ہے۔ محاکات میں جو انداز دلکش پیدا ہوتا ہے وہ اسی تخیل کی بدولت ورنہ خالی محاکات نقالی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ محاکات کا بس اتنا کام ہے کہ جو کچھ دیکھے یا سنے یا جس شے یا جس حالت سے متاثر ہو اس کو الفاظ کے ذریعہ بعینہٖ ادا کردے۔ لیکن ان چیزوں میں کوئی خاص تناسب پیدا کرنا یا کوئی مابہ الامتیاز شے کو دکھانا یا آب و رنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ۔

تخیل مسلم اور طے شدہ باتوں کو سرسری نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ ایک ایک بات پر سو سو دفعہ تنقیدی نظر ڈالتی ہے اور بات میں بات پیدا کرتی ہے۔

گویا تخیل قوت اختراع یا ملکہ استنباطی کا نام ہے۔ قوت تخیل کے استدلال کا طریقہ عام استدلال سے الگ ہوتا ہے۔ وہ ان باتوں کو جو اور طرح ثابت ہو چکی ہیں نئے طریقے سے ثابت کرتی ہے یہ طریقہ استدلال اکثر ایک قسم کا منطقی مغالطہ ہوتا ہے اور حسن تعلیل کی صورت میں نہایت ہی نازک اور حیرت انگیز انداز بیان اختیار کرتا ہے۔

جودت تخیل کے نمونے۔

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں (آتش) لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

ہوتا ہے شہیدوں سے ترے آسمان سفید
اڑتا ہے رنگ چہرہ نیرنگ ساز کا
عمر خضر سے اس کی زیادہ ہو زندگی
دھوون پئے جو یار کی زلف دراز کا
مطلب نہ سرنوشت کا سمجھا تو شکر کر
دیوانہ ہو جو حال قضا و قدر کھلے

اس میں شک نہیں کہ قوت تخیل کسی وقت یا کسی حالت میں بیکار نہیں رہ سکتی۔ محدود مقام ہو یا وسیع بیرڑ راستے ہوں یا سیدھے مگر اپنا کام کیے جائے گی۔ شعرانے فقط گل و بلبل کے افسانے ہجر و وصال کے ترانے میں بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے اور کچھ نہ کچھ تازگی و جدت سے بھی کام لیا ہے مگر ایسے شعراء بس تھان کے ٹرے ہوتے ہیں۔ میدان میں آتے ہی یا تو ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں یا منزل مقصود سے کوسوں بھٹک جاتے ہیں پھر ایسی

شاعری کس کام آئے گی؟

وہ شاعری جو ہر قسم کی جذبات کا آئینہ بن سکے وہ شاعری جو فطرت کے رازہائے مخفی کو کھول سکے' وہ شاعری جو فلسفہ اخلاق و حکمت کے دقائق کو بہ عنوان دلکش حل کر سکے۔ وہ شاعری جو تاریخی واقعات سے نتیجہ خیز مضامین پیدا کر سکے وہ شاعری جو اخلاق و تمدن پر مفید اور گہرا اثر ڈال سکے۔ ایسی اونچی اور بلکی ہوئی تخیل سے کیوں نشوونما پا سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارا لکھنؤ اس اعلیٰ مذاق شاعری سے محروم رہا۔ اگر حضرت آتش و میر انیس و مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہم یہاں پیدا نہ ہوئے ہوتے تو لکھنؤ کا وقار (بہ اعتبار نفس شاعری) قائم نہ ہو سکتا۔ ان حضرات کی شاعری نے البتہ فلسفہ اخلاق و حکمت کے میدان میں وہ کارنمایاں کیے۔ کہ لکھنؤ کی بلکہ زبان اردو کی آبرو رکھ لی۔ لکھنؤ کے دیگر شعراء نے فقط زبان اردو کی خدمتیں کیں مگر نفس شاعری کو کما حقہ' نہ سمجھے۔ میر انیس مغفور نے شاعرانہ کمال کے ساتھ ساتھ زبان اردو کو بھی اتنا سنوارا جو سنوارنے کا حق تھا ورنہ دہلی کے شعراء اس کو ریختہ کے نام سے پکارتے تھے باعتبار زبان اس کو وہ شرف حاصل نہ تھا جو میر انیس نے بخشا۔ لکھنؤ نے اور خصوصاً میر انیس نے اس زبان کو زبان کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ تخیل کی بے ہودہ جست و خیز اور شعر کی بدقسمتی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی جو غالب کے کلام میں پائی جاتی ہے ایسے ماہر فن کے ہاں تخیل کی یہ بے اعتدالیاں اور تغزل میں ایسی بدمذاقیاں (جن کی وجہ سے عام طور پر مذاق سخن بگڑ گیا) نہایت افسوس ناک ہیں۔ اگرچہ غالب نے بہ نسبت متقدمین کے تخیل میں زور پیدا کیا مگر صرف بے محل کی وجہ سے زیادہ تر محنت رائیگاں ہو کر کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہو گئی۔ غالب کی تخیل اور الفاظ سے اکثر دیہاتیوں کی بو آتی ہے۔ یعنی پڑھے لکھے دیہاتی اگر چاہیں تو ایسی شاعری کر سکتے ہیں مگر میر و آتش کے رنگ میں وہی کہہ سکتا ہے اہل زبان ہو۔

بدمذاقی کی مثالیں۔

سر شک سر بصحرا دادہ نور العین دامن ہے
دل بیدست و پا افتادہ بر خوردار بستر ہے

غالب

سرشک کیا ہے نور العین دامن ہے سرشک بھی کیا سربصحرا دادہ۔ دل بے پرست و پاافتادہ کیا ہے؟ برخوردار بستر ہے۔ نور العین۔ برخوردار اور دادہ (دادا) کی رعایت لفظی ملاحظہ ہو۔ برخوردار کے لئے بستر کی رعایت اور نور العین کے لئے دامن کی رعایت۔ سبحان اللہ" کیا کیا رعایتیں ہیں؟ حضرت غالب نے تو لکھنؤ والوں کے بھی کان کاٹے۔ ان مہملات اور خرافات پر بھی غالب پرستوں سے پوچھا جائے تو اس شعر میں (جس پر کبھی شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا) بھی کوئی نہ کوئی فلسفیانہ نکتہ ٹھونس دیں گے۔ مگر اب جاہل بھی سمجھتا ہے کہ اس قسم کی تخیل اک پھلجھڑی ہے جس سے محض طفلانہ مزاج اشخاص دل بہلا سکتے ہیں اور اہل ذوق کو مضحکہ کے سوا کوئی چارہ نہیں ہو سکتا۔

غالب

میں اور صد ہزار نوائے دل خراش
تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

سبحان اللہ "کی ایک ہی کسی اردو کی پھوٹی ہوئی قسمت" جہاں تک ناز کرے بجا ہے۔ غالب پرست ذرا گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ یہ دہلی کی زبان ہے یا کسی دیو زاد کی۔

غالب

بزم قدح سے عیش تمنا نہ رکھ کہ رنگ
صید ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا

مطلب تو یہ ہے کہ بزم سے یہ تمنائے عیش عبث ہے کیونکہ رنگ محفل کو کچھ بھی قرار و ثبات نہیں مگر بندہ نواز "صید زدام جستہ" اور "عیش تمنا نہ رکھ" سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ لالہ بھیروں پرشاد کا شعر ہے ان لغویتوں کے علاوہ "بزم قدح" بھی ایک انوکھا تصرف ہے بزم عیش کے سوا بزم قدح، بزم ساغر، بزم جام کی دید نہ شنید۔ عیش تمنا نہ رکھ یعنی عیش کی تمنا نہ رکھ۔ حضرت غالب ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جن کی زبان نہ اردو نہ فارسی نہ ترکی۔

غالب کی بد مذاقیاں اور تخیل کی بے اعتدالیاں دکھانے کے لئے ایک مستقل کتاب چاہئے اس رسالہ میں گنجائش نہیں مگر ناسخ اور غالب کی روش تخیل کی طرف بھی اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ناسخ نے جو کچھ کہا ہے اگرچہ بہ اعتبار تغزل پسندیدہ نہیں ہے مگر مطلب فوراً سمجھ میں آجاتا ہے اور صحت الفاظ و محاورات کے اعتبار سے ناسخ کے تمام اشعار مستند ہیں گویا دیوان ناسخ زبان اردو کی ایک ڈکشنری (لغت) ہے مگر غالب کے اس مختصر دیوان کا بیشتر حصہ نہ سمجھ میں آتا ہے نہ بہ اعتبار تغزل کوئی وقعت رکھتا ہے۔ بعید الفہم خیالات اور بے اعتدالی تخیل کا اچھا خاصہ نمونہ ہے اس قسم کی تخیل شعر کو (از روئے علم معانی و بیان) بالکل مہمل بنا دیتی ہے۔ دل میں تو ہزاروں قسم کے خیالات موجزن ہوتے ہیں مگر انسان کو اور خصوصاً شاعر کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ کون سی بات کہنے کی ہے اور کون سی بات ناگفتنی ہے یا جو کچھ کہا ہے اور جن لفظوں میں کہا ہے اسے سامع بھی سمجھ سکتا ہے یا نہیں۔ زبان کھولنے کا حاصل یہ ہے کہ سامع پر اپنا مطلب بخوبی تمام ہو جائے اور شاعر کے لئے فقط اپنا مطلب تمام کر دینا کافی نہیں بلکہ ذہن سامع کو محظوظ کرنا بھی ضروری ہے۔ غالب کے کلام میں یہ عیب جس کثرت سے پایا جاتا ہے وہ ہندوستان کے کسی شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ ذہن سامع کو محظوظ کرنا تو کجا مطلب بھی صاف ادا نہیں ہوتا بلکہ ذہن کو اور الجھن سی ہوتی ہے۔ جو مضمون لفظوں سے صاف صاف ادا نہیں ہو سکتا اس کو نہاں خانہ عدم میں رکھنا مناسب ہے۔ کسی بگڑی ہوئی صورت کو اہل نظر کے سامنے پیش کرنا کوئی کاریگری نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ آج کل ہندوستان میں غالب کے ان پیچیدہ انداز بیان کی تقلید کی جاتی ہے جو معنی و بیان کی

رو سے نہایت معیوب ہیں۔ ہاں غالب کے وہ چند اشعار جن میں منطق کی شوخیاں' پسندیدہ نزاکتیں اور قریب الفہم کنائے پائے جاتے ہیں ان کی تقلید کی جائے تو بیشک اردو کی شاعری کے لئے نہایت مفید ہے' مگر ایسا نہیں کیا جاتا اور یہ کام کچھ آسان بھی نہیں ہے۔ واضح ہو کہ غالب کے وہی چند اشعار پسند خاص و عام ہوئے جن میں مذکورہ خوبیوں کے جوہر پائے جاتے ہیں یا جو سادگی و نزاکت کے سیدھے راستے پر ہیں۔

مگر آج کل یہ ہوا چلی ہے کہ جوش عقیدت میں اکثر الجھے ہوئے اور مہمل اشعار میں بھی معنی پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو لوگ میدان سخن میں کوئی کار نمایاں کرنے کی قوت نہیں رکھتے جن کے ہاتھ میں کوئی ہنر نہیں وہ دیوان غالب کی شرح اور اس کا لائبریری ایڈیشن تیار کر کے نام و نمود حاصل کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ کاش انجمن ترقی اردو حضرت آتش کے دیوان کو (جو فلسفہ' اخلاق و حکمت کا معدن ہے) دیدۂ عارف سے دیکھتی اور "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل کر کے انتخاب کرتی اور اس حکمت آموز و عبرت خیز مجموعہ کلام کی شرح تیار کر کے شائع کرتی تو ملک کا مذاق بھی درست ہوتا اور علم ادب کو بھی فائدہ پہونچتا۔ حضرت استاذی جناب خان بہادر مولانا شاد مدظلہ' کا یہ ارشاد مجھے یاد ہے کہ "پہلے قرآن و حدیث کے فلسفۂ حکمت و اخلاق اور نہج البلاغہ اور بھاگوت گیتا کے مسائل عرفان و حقیقت پر نظر ڈالو اس کے بعد خواجہ کا دیوان دیکھو جب اس کے مرتبہ کو پہچانو گے۔"

خواجہ آتش کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ مسائل عرفان و حقیقت سے کافی آگاہی رکھتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو عملی طور پر کسب و ریاض میں دخل تھا اور ان کا خاندان بھی ریاضت پیشہ تھا۔ علم تصوف کی کتابیں چاٹ جانے سے ان مضامین اور ایسے مسائل پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا مجھے اس سے انکار نہیں کہ مثل اور اساتذہ کے خواجہ کے کلام میں غلطیاں بھی ہیں' ان کی علمی استعداد اوسط درجہ کی معلوم ہوتی ہے مگر شاعری کے لئے جس اوراک و احساس' جس انداز بیان' اور لطف زبان' جس درد مند دل' جس چشم معرفت کی ضرورت ہے وہ اساتذہ اردو میں آتش و میر سے بڑھ کر اور کسی کو نہیں عطا ہوئی۔ بلکہ اعلیٰ جذبات کو حرکت دینے والے مضامین اور عرفان و حقیقت کا رنگ جس قدر آتش مغفور کے یہاں ہے اتنا میر کے ہاں نہیں ہے مگر مجموعی حیثیت سے میر کا پایہ بلند ہے۔ آتش کے کلام میں جو بانکپن ہے وہ میر کے ہاں نہیں اور میر کے ہاں جو سکینت ہے وہ آتش کے ہاں نہیں ہے۔

اردو میں عرفان و حقیقت کے رنگ کو پردہ مجاز میں آتش نے جس خوبی سے دکھایا ہے میر درد کے ہاں بھی اس خوبی کے ساتھ نہیں دکھائی دیتا۔ میر درد اکثر پردہ مجاز کو بیچ سے اٹھا دیتے ہیں مگر آتش کے ہاں اک ہلکا سا پردہ ضرور پڑا رہتا ہے اور حضرت غالب کے تو تصوف کی ہوا تک نہیں لگی جو کچھ ہے نرا مجاز ہے۔

یہ مسائل تصوف' یہ ترا بیان غالب

فقط دعوے ہی دعوے ہیں۔ آتش کا کلام دل پر اثر کرتا ہے اور غالب کی تخیل سے (جہاں تخیل کا صحیح مصرف لیا گیا ہے) دماغ کو فرحت ہوتی ہے۔ دل پر ویسا اثر نہیں پڑتا لہٰذا جو کلام دل پر اثر کرے وہی قابل ترجیح

ہے۔ آتش و میر کے شعر دل سے نکلتے ہیں اور غالب دماغ کے زور پر اڑتے ہیں آتش کا کلام سعدی و حافظ و خسرو کی طرح روحانیت کی طرف مائل ہے اور غالب کا کلام فلسفہ کی طرف۔

بعض حضرات آتش کو نسبتہً "کم سواد کہتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے ان کی خاطر سے میں مانے لیتا ہوں مگر جناب رسالت مآب' اور جناب امیر علیہ السلام بھی کچھ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن کلام میں وہ اعجاز تھا کہ دلوں کو مسخر کر لیا۔ ہر بات فلسفے کے کانٹے میں تلی ہوئی تھی۔ اس طرح ہر بشر میں یہ جوہر منجانب اللہ ودیعت ہوتا ہے۔ آتش کی زبان میں بھی خداداد اثر تھا۔ افسوس یہ ہے کہ لکھنؤ کے رنگ تکلف نے ان پر بھی کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا مگر مجموعی حیثیت سے دیوان آتش پر نظر انصاف ڈالیے تو صاف معلوم ہوگا کہ اصلی رنگ طبیعت عرفان و حقیقت کی طرف زیادہ مائل ہے۔ خواجہ آتش کو عملی طور پر کسب و ریاض میں دخل تھا اور غالب اس سے بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں ممکن ہے کہ غالب نے علم تصوف کی کتابیں دیکھی ہوں' مگر اس سے کیفیت اور حال دل پر طاری نہیں ہوتا۔ اور بغیر کیف ہوئے ایسے مضامین پر حاوی ہونا محال ہے اسی وجہ سے دیوان غالب عرفان و حقیقت کے مضامین سے خالی ہے۔ اور جہاں اس کی کوشش کی ہے۔ وہاں ناکامیاب رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کوچہ سے آشنا نہیں ہیں۔ البتہ غالب کو یہ خصوصیت ضرور حاصل ہے کہ تمام شعراء کے مقابلے میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائی۔ مگر ہمیں کیا ضرور کہ اندھی تقلید کریں۔ پرائے شگون کے لیے اپنی ناک کٹوائیں

شاعر کو لازم ہے کہ قوت تخیل کو حد اعتدال میں رکھے طبیعت پر غالب نہ ہونے دے۔ جسم انسانی کے عناصر اربع میں سے کوئی عنصر حد اعتدال سے بڑھ جاتا ہے تو اس کا نتیجہ امراض شدید اور آخر کار موت کا سامنا ہوتا ہے۔ جسم انسانی پر کیا منحصر ہے' تمام دنیا مافیہا کا وجود اسی اعتدال پر قائم ہے۔ کائنات میں جتنے سیارے ہیں ان کے اعتدال میں فرق آ جائے اور قوت کشش حد سے تجاوز کر جائے تو سب آپس میں ٹکرا کر برباد ہو جائیں۔ لہٰذا شاعر کو لازم ہے کہ اس قوت تخیل کی باگیں لیے رہے کیوں کہ جب اس کا غلبہ طبیعت پر زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو قوت ممیزہ کے قابو سے اس کی روک تھام کرنے والی ہے باہر ہو جاتی ہے اور یہ حالت شاعر کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ قوت متخیلہ فطرتاً' اخلاق اور بلند پروازی کی طرف مائل رہتی ہے مگر قوت ممیزہ' اس کی پرواز کو حسب ضرورت روکتی ہے اور بھٹکنے نہیں دیتی۔ قوت متخیلہ کتنی ہی بلند پرواز ہو جب تک قوت ممیزہ کی محکوم ہے شاعری کو اس سے نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بلکہ جس قدر اس کی پرواز بلند ہوگی اس قدر اس کی شاعری اعلیٰ مرتبہ کو پہنچے گی۔ دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر گذرے ہیں ان میں قوت متخیلہ کی بلند پروازی اور قوت ممیزہ کی حکومت ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے ان کی تخیل نہ خیالات میں بے اعتدالی پیدا کرتی اور کجروی پیدا کرتی نہ الفاظ اور انداز بیان میں غرابت۔ مگر جب تخیل قوت ممیزہ پر غالب آ جائے ایسا ہی ہے جیسے کسی سوار کے لئے مطلق العنان گھوڑا۔ غالب کی شاعری کا یہی حال ہے۔ خیالات ان کے اتنے بلند ہیں۔ کہ الفاظ کے قابو میں نہیں آتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نفس مطلب بالکل فوت ہو جاتا ہے اور شاعر منزل مقصود سے کوسوں دور رہ جاتا ہے یا کسی اور طرف نکل جاتا ہے۔ غالب پر کیا موقوف۔ کتنے ہی ہونہار شاعر اس وقت متخیلہ کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت گمراہ ہو

گئے اور بعض جو گمراہ ہوئے وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنالیا۔ ہائے میر تقی میر کیا جوہری سخن تھا مرزا غالب کے شعر سن کر صاف کہہ دیا کہ "اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا اور سیدھے راستے پر لگا دیا۔ تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" وہی ہوا کہ غالب نے نہ کسی کو استاد بنایا اور نہ راہ راست پر آئے۔ چنانچہ غالب کے کسی بے تکلف دوست نے یہ مطلع پڑھ کر از راہ تمسخر ان کی بہت تعریفیں کیں۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
بعد اس کے جزو گل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے اور کہا "نہ معلوم کس مسخرے نے یہ مطلع میری طرف منسوب کر دیا ہے۔" اس پر ان کے مہربان نے فرمایا کہ بھئی برا کیوں مانتے ہو تمہارے شعر تو ایسے ہوتے ہیں۔"

خدا بھلا کرے نکتہ چینوں کا کہ ٹھوکے دے دے آخر کار غالب سے کچھ ایسے شعر بھی کہلوا لیے جن پر اردو کی شاعری جتنا بھی ناز کرے بجا ہے۔ یہ وہی اشعار ہیں جو زبان زد خاص و عام ہیں اور جن میں قوت عقلیہ اور قوت ممیزہ کی حکومت ساتھ ساتھ پائی جاتی ہے۔ باقی اشعار تو فقط سلامتی کے ہیں۔ انجمن ترقی اردو پھر سے دیوان غالب کا انتخاب کرے اور چیستاں نما اشعار کو کاٹ کر پھینک دے تو اچھا

کاش غالب شاعری کے پیچھے نہ پڑتے نثر ہی لکھا کرتے تو بہتر تھا۔ یہ عجب بات ہے کہ نثر تو ایسی دلچسپ اور سلجھی ہوئی اور نظم بالکل گورکھ دھندا

قوت تخیل کی بیہودہ جست و خیز اس وقت بڑھ جاتی ہے جب اس کو اپنی اصلی غذا (یعنی اصلیت و جوش' حقائق و واقعات کا ذخیرہ جس میں وہ تصرف کر سکے) نہیں ملتی۔ جس طرح انسان بھوک کی شدت میں جب معتاد غذا نہیں پاتا تو مجبوراً بناس پتی سے اپنا دوزخ بھر کر صحت کو خراب کر لیتا اور اکثر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب قوت عقلیہ کی اصلی غذا نہیں ملی تو غیر معتاد غذا پر ہاتھ ڈالتی ہے۔ خیالات و راز کار کو جن سے کوئی نتیجہ معقول مرتب نہیں ہوتا اور جن میں ذرا بھی اصلیت نہیں ہوتی تراش کر بہ تکلف شعر کا لباس پہناتی ہے اور قوت ممیزہ کو اپنے کام میں خلل انداز سمجھ کر اس کی اطاعت سے باہر ہو جاتی ہے اور آخر کار شاعر کی تمام فکر کو تحصیل لاحاصل بنا دیتی ہے۔

مولانا حالی و علامہ شبلی نے شعر کے حسن و قبح کے جانچنے کا جو معیار اپنی گراں بہا تصنیفوں میں قائم کیا ہے اس کا خلاصہ یہی ہے اور مذاق سلیم کو مذکورہ بالا معیار کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ راز میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولانا حالی اور غالب کے دیگر معتقدین کلام غالب کو اس معیار پر کیوں نہیں پرکھتے میرا دعویٰ ہے کہ جب تک مقدمہ حالی اور شعر العجم کا وجود باقی ہے اور جب تک یہ معیار شاعری اہل فن کے نزدیک مسلم ہے اس وقت تک کلام غالب کی خامیاں مٹائے نہیں مٹ سکتیں نہ خوبیوں پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے۔

مکتوب یگانہ

(بنام سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔ اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی)
اتوار ۲۵ دسمبر ۳۳ء

مکرمی جناب مسعود صاحب سلام علیکم

نوازش نامہ صادر ہوا۔ خیر آپ نے "ترانہ" کی رسید تو بھیجی ورنہ یہ تو "گویا" ایسی قابل نفرت چیز ہے کہ بہتیرے حضرات نے رسید تک بھیجنا خلاف اخلاق سمجھا میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ رسید بھیجنا تو کجا' بعض احباب اسے دیکھ کر جامے سے باہر ہو جائیں پھاڑ کر پھینک دیں تو کوئی عجب نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں' کہ آکر کی چند رباعیاں (وہی جن میں غالب پر تمسخر کیا گیا ہے) شائع نہ کی جائیں' تو اچھا تھا۔ انہیں شائع کر کے گویا میں نے اپنے ہی خوابوں کا (بھی خواہ بقول آپ کے) دل دکھایا ہے۔ خیریوں ہی سہی۔ غلط بینی یا غلط فہمی کے سبب کوئی آپ چڑ کا جائے تو اور بات ہے۔ ورنہ مجھے دل دکھانے کی ضرورت کیا تھی البتہ یہ آزمانا ہے کہ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے جانچنے اور قدر کرنے کی صلاحیت ملک میں کتنی ہے۔ آیا لوگ محض اپنے ہی ہم خیال و ہم مذہب کے ہنر کو دیکھ سکتے ہیں یا غیروں کے بھی۔ میرا مذہب غالب پرستی نہیں ہے بلکہ خود پرستی یا حق پرستی۔

خود پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے !
آہ کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

دوسری ضرورت ان ظریفانہ رباعیوں کی یہ ہے کہ غالب پرستوں کی دیوانہ وار عقیدت اور بھکی ہوئی ذہنیت پر کچھ تو چوٹ پڑے۔ ذرا اپنے حواسوں میں آئیں غالب کو ایک دیوتا یا آسمانی شخصیت کی طرح پیش کر کے دنیا کی مہذب قوموں کو' ہندوستانی دماغوں پر ہنسنے قلقلانے کا موقعہ دیا جا رہا ہے۔ اس پر ذرا غور تو کریں۔ غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال' وقت پسند شاعر' جو بسا اوقات اپنے تخیلات کی بھول بھلیاں میں گم ہو جایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سرا بھی ہے۔ پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے۔ مضمون چراتے کو چراتا ہے مگر ہضم نہیں کر سکتا۔ تصرف کی قدرت نہیں رکھتا۔ چوری کھل جاتی ہے۔ زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا ٹھونس ٹھانس کر تک بندی کر لیتا ہے غالب کے ان شاعرانہ نقائص کی طرف گذشتہ بیس سال کی مدت میں بارہا اشارے کر چکا ہوں جو سمجھنے والوں کے لئے کافی ہے مگر اب کچھ ایسی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اک مستقل رسالہ مرتب کر کے غالب کی چوریوں یا نقالیوں کو اچھی طرح بکھان ڈالوں۔ مجھے کیا ضرورت تھی کہ غالب کے ان عیوب و نقائص کی تشہیر کرتا۔ مگر غالب پرستوں کی کورانہ عقیدت نے تمام شعرائے ماضی و حال کے حقوق چھین کر سب غالب کو دیدئے ہیں۔ سب کے کارناموں کو فراموش کر کے غالب کو اردو کا واحد نمائندہ بنا کر پیش کیا ہے۔ شارحوں اور مضمون نگاروں نے غالب کی محض مبالغہ آمیز یک رخی تصویر پیش کر کے (یک رخی بھی ایسی نہیں کہ محض حسن کو دکھایا اور عیب کو چھپایا بلکہ غضب یہ ہے کہ

عیب پر بھی حسن کا رنگ چڑھا کر) ملک میں وہ بدمذاقی پھیلائی ہے کہ اہل نظر حیران ہیں یا الٰہی یہ کون سا طوفان ہے۔ آپ سمجھتے ہی ہوں گے کہ اس بدمذاقی کی ترویج کا کتنا برا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ قوم کی قوت فیصلہ مجروح ہوتی جا رہی ہے بلکہ ہو چکی ہے۔ تمیز نیک و بد معطل ہوئی جاتی ہے۔ غالب کی لنگڑی شاعری کو بھی بکی ہوئی ذہنیتیں حسن کمال پر محمول کرنے لگی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ

جب ایسی گمراہی پھیلی ہوئی ہے تو کیا غالب کی تصویر کا دوسرا رخ دکھا دینا یا اس کی طرف رباعیوں میں اشارہ کر دینا اک ادبی خدمت نہیں ہے۔ یہ دل سے اس خدمت کا اعتراف تو کیا کرتے۔ الٹا الزام رکھا جاتا ہے کہ یار دکھانے کو۔ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ میری ادبی خدمتوں کا اعتراف کیا جائے۔ (میں خدمت خدمت کی غرض سے کرتا ہوں حصول صلہ کے لئے نہیں کرتا۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ میری خدمت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوتا جاتا ہے اور ہو جائے گا۔ مگر میرے حق میں یہ خدمت' زحمت و رسوائی کا باعث ہوتی رہے گی۔ مجھے دشمن و دوست کی پروا ہوتی تو ایسا کیوں کرتا) مگر ملک خود اپنی قوت فیصلہ کو مجروح کئے لیتا ہے۔ یہ کون سی عقلمندی ہے۔ میں غالب کی طرح داد سخن کا بھوکا نہیں ہوں کہ لوگوں کو مطمئن کرنے کو جھک کر اپنے ڈھب پر لاؤں یا کہوں کہ

"نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی"

کمال تو وہ شے ہے کہ مارگھونسوں کے داد وصول کر لیتا ہے۔ پھر ضمیر فروشی کرنے یا تالیف قلوب کی منافقانہ پالیسی برتنے کی کیا ضرورت ہے۔ داد تو مجھے ایسی ملی کہ زمین و آسمان گواہ ہیں۔ سارا لکھنؤ عاجز آ کر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سامنے آنا۔ منہ دکھانا چھوڑ دیا۔ ذرا غور تو کیجئے اس سے بڑھ کر اور کیا داد ہو گی؟ بائیکاٹ کا فلسفہ یہی تو ہے کہ روندا ہوا دشمن جب ہر طرح عاجز آ جاتا ہے۔ کوئی کاٹ نہیں کر سکتا تو بائیکاٹ کے حربے پر اتر آتا ہے۔ خدا جانے وہ میرے کون سے قدر دان ہیں جو نفس کمال کو غالب پرستی کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں۔ یہ اچھی شرط ہے کہ میں غالب کی شان میں ایسی رباعیاں نہ کہتا' اس کے عیب کو ہنر سمجھتا یا کم از کم اس کے عیب کو چھپائے رکھتا تو میرا کمال کمال تھا ورنہ کمال تو نہیں۔

غرض کہنے کی یہ ہے کہ نفس کمال غالب پرستی یا شخصیت پرستی پر موقوف نہیں ہے۔ کیا اچھے دوست ہیں جو میرے عیب ضمیر پرستی پر تو نظر رکھتے ہیں اور ہنر سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ مجھے اس چشم پوشی یا متعصبانہ تنگ خیالی کی کوئی شکایت ہے ہرگز نہیں۔ نہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گمراہوں کا سارا گروہ میرا کلمہ پڑھنے لگے۔ ہر کس و ناکس کو اپنے ڈھب پر لانا۔ اپنا جھونا ہوا خواہ بنانا میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو ہر سخن کو جو پرکھ سکتا ہے وہ آپ سے آپ کھچ آئے گا۔ باوجود ان عیوب کے جو مجھ میں ہیں ملک میں ایک ایسا بے تعصب تعلیم یافتہ طبقہ بھی موجود ہے جو مجھے دوست رکھتا ہے۔ ہنر کو ہنر کی حیثیت سے دیکھتا ہے۔ غالب پرستی کے ساتھ مشروط نہیں سمجھتا۔ خدا جانے یہ مشروط قدر دانی کیا بلا ہے؟ "آل انڈیا شاعر کانفرنس کانپور" میں اگر کسی شخص نے میرے اس مصرع کو (وہ کون یگانہ؟ وہی غالب کے چچا) نقل کر کے حاضرین جلسہ کو بھڑکایا تو اس کی شکایت کیا۔ اس کی نگاہ بدبین کا تقاضا یہی ہونا چاہئے تھا۔ وہ "ترانہ" کے تمام صفحات میں آخر کی انہیں پانچ سات مزاحیہ رباعیوں کو کتاب کا ماحصل سمجھتا ہے۔ کتاب کا اصل موضوع اس کے نزدیک یہی چند رباعیاں ہیں۔ یا کم از کم لوگوں کو ایسا باور کرانا چاہتا ہے۔ تو اس سے میرا یا آپ کا کیا بگڑا ہاں ادبی دنیا کو اس نے دھوکہ دیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اس کے اس طرز عمل سے آپ کے ساتھ اور لوگوں کو بھی (جو بقول آپ کے میرے قدر شناس ہیں اور ایک ادبی مجمع میں اس سے بہتر ریمارک سننا چاہتے تھے) تکلیف ہوئی۔ کیوں تکلیف ہوئی؟ یہ اپنی غلط فہمی لوگ کیوں اس امر کے متوقع رہتے ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کا ہم خیال و ہم نوا ہو جائے۔ کیوں دوسروں سے میری نسبت بہتر ریمارک سننا چاہتے ہیں۔ کیا وہ خود کوئی رائے نہیں رکھتے۔ کیا اپنی رائے پر انہیں بھروسا نہیں؟ اگر اپنی رائے کو وہ حق بجانب سمجھتے ہیں تو کیا یہ احساس بجائے خود اک لذت نہیں ہے؟ اگر وہ دوسروں کو بھی اپنی لذت میں شریک دیکھنا چاہتے ہیں تو کچھ دنوں صبر کریں۔ انتظار کریں۔ زمانہ خود کج رفتاروں کو سیدھا کر دے گا۔ بھلے لوگ خاموشی کے ساتھ میری نسبت بہتر ریمارک سننے کے منتظر رہے "خود کوئی کلمہ خیر نہ کیا۔" ورنہ جوش بھی خواہی سے مجبور ہو کر پکار اٹھتے تو نہ جانے کیا ہوتا؟ قدردانی کو ڈالئے بھاڑ میں یہ کیا غضب ہے کہ مجھ پر دل دکھانے کا الزام رکھا جاتا ہے اور اس الزام کے ساتھ بھی خواہی کا احسان بھی جتایا جاتا ہے۔ کیا کہنا ہے اس "منت کرم واشتن" کا۔ کیوں حضرت میں نے دل کیوں کر دکھایا۔ چور کو چور بے سرے کو بے سرا کہنا اگر دل آزادی ہے تو چور کو شاہ بنا کر پیش کرنا۔ اک پیٹ کے بندے "خلعت کے بھوکے" کو "صوفی" کا مقدس خطاب دینا۔ سلطنت مغلیہ کے اک خود غرض نمک خوار۔ "انگریزوں کے پرستار و پنشن خوار کو" "وطن پرست" ٹھہرانا اور اسی طرح کا بیسیوں سفید جھوٹ اہل نظر کی دل آزاری اور پبلک کی گمراہی کا سبب نہیں ہے۔ کیا غالب کے لئے یہ شرف کافی نہیں ہے؟ کہ آخر عمر میں (میر تقی میر کی اقتدار کی بدولت) وہ اک کامیاب شاعر تھا اگرچہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ' ذہنی سرگشتگی و حیرانی میں گذرا کیا غالب کی صحیح اور جائز تعریفوں سے یاروں کا پیٹ نہیں بھرتا کہ اسے ناجائز و ناممکن معراج یا "اچھالا" دینے میں یہ مبالغہ کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا یہی انجام ہوتا ہے کہ غالب جائز حد تک جس عزت کا مستحق ہے' وہ بھی اس سے چھن جائے ان کی شاعرانہ بضاعت اور اس کے کیرکٹر کی سختی سے جانچ شروع ہو جائے۔ اور آخر کو ہوابندی کا یہ طلسم تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ جائے۔ غالب پرستوں کے دیوانہ وار عمل کا رد عمل شروع ہو چکا ہے۔ کچھ دنوں میں ثابت ہو کر رہے گا کہ غالب کو اردو زبان کا واحد نمائندہ ٹھہرنا اس کے کلام کو سراسر الہامی اور (Original) ٹھہرانا۔ فارسی لٹریچر سے (جو غالب کا واحد ماخذ ہے کیوں کہ وہ فارسی کے سوا اور کوئی زبان جانتے ہی نہ تھے) بے خبری کا نتیجہ ہے۔ جوش عقیدت کی فریب کاری ہے' اور کچھ بھی نہیں۔ مان لیا جائے کہ میں غالب کو سخن ورو۔ بے سرا وغیرہ کہنے میں حق بجانب نہ سہی' غالب تو کیا بلا ہے اگر خدانخواستہ حضرت کرشن کی عظمت۔ مولا علی کی شان جلالت' محمد رسول اللہ کی رسالت' اور خدا کی وحدانیت سے بھی انکار کروں تو کیا حسن کمال میں جو تسخیر قلب کی قوت ودیعت کی گئی ہے وہ فنا ہو جائے گی۔ حسن کمال کیا خدا پرستی یا غالب پرستی پر موقوف و مشروط ہے۔ لاحول ولا قوۃ کیا منکروں اور کافروں کو خدا نے اپنی نعمتوں سے مالا مال نہیں کیا؟ سوسائٹی اسے تسلیم کرے یا نہ کرے مگر مبدء فیاض کسی کا ذاتی جوہر چھین نہیں سکتا۔ محض اس وجہ سے کہ وہ غالب پرست نہیں ہے۔ فطرت مرزا غالب کی اتنی ہوا خواہ تو نہیں ہے کہ مرزا یگانہ کا ذاتی جوہر چند ظریفانہ رباعیوں کی وجہ سے مٹا دے گی۔ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی شاعری کی نسبت لوگوں سے "بہتر ریمارک" سننے اور ہر دلعزیز بنے کی ہوس میں تعلیم یافتہ گمراہوں کی طرح مہملات غالب کو بھی آسمانی صحیفہ مان لوں اور اس طرح غالب پرستوں کی نگاہ میں "جھوٹی اور ذلیل عزت" حاصل کروں کیا ایسی عزت جو اک قسم کی بھیک یا رشوت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ضمیر فروشی کر کے کوئی بھلا

دی قبول کر سکتا ہے۔ ٹھوکر پر مارتا ہوں ایسی عزت کو جو غالب پرستی کے صدقے میں حاصل ہو۔ عرف عام میں جسے عزت کہتے ہیں کیا آپ نے نہیں دیکھا۔ کہ میں نے اس عزت کو لکھنؤ میں کس طرح قربان کر ڈالا۔ کیا کیا گالیاں کھائیں۔ مغلظات۔ کیا کیا ہجویں سنیں۔ کیا کیا مادی نقصانات اٹھائے۔ لگی لگائی روزی اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑی۔ یہ غالب کا زمانہ نہیں ہے۔ کہ دلی کا تخت الٹ جانے کے بعد بھی بڑے بڑے دربار شاعروں کی قدر کرنے والے موجود تھے۔ فکر معاش کے لئے آج کل کی سی کشمکش نہ تھی۔ آج کل اپنے وطن میں ساٹھ روپے کی ملازمت ایک صاحب اہل و عیال کے لئے بڑی قیمتی چیز ہے۔ ایسی ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کر دینا اس زمانے میں (کہ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں) کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس زمانے میں شاعروں کا کام فقط شعر کہنا نہیں ہے۔ بلکہ بیروزگاری کا عذاب بھی جان کے ساتھ ہے اور اگر کوئی جگہ آسمان زمین کے قلابے ملانے کے بعد مل بھی گئی۔ تو اس کی ذمہ داریاں سختیاں اٹھانا بھی اک کٹھن مرحلہ ہے۔ آپ غور کریں کس قدر مشکل ہے۔ اس نفسا نفسی کے دور میں آرٹ کو مرتبہ کمال پر پہنچانا۔ بغض و عدوت کی قربان گاہ پر وجہ معاش کو بھینٹ چڑھا دینا۔ بال بچوں پر سختیاں اپنی آنکھوں سے دیکھنا اور صبر کرنا۔ عمر بھر کا سرمایہ ایک اچھا خاصہ کتب خانہ (اس کے تلف ہونے کے رنج و غم کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں) بے روزگاری کے ہاتھوں تنگ آکر کوڑیوں کے مول لٹا دینا وطن چھوڑ کر بال بچوں کو خدا کے حوالے کر کے فکر معاش میں دیس بدیس مارے مارے پھرنا اپنی ضمیر پرستی اور اصول پرستی کے ہاتھوں الٹا چور و الزام ہونا۔ یار و اغیار کے طعنے سننا اور شربت کے گھونٹ کی طرح پی جانا غالب جیسے خود غرض درباری شاعر پیٹ کے بندے خلعت کے بھوکے انگریزوں کے پرستار اور پنشن خوار کا کام نہیں ہے۔ یہ حوصلہ ہے ضمیر پرست ایذا پسندوں کا جو وجہ معاش کے ساتھ اپنی عزت عرفی کی قربانی بھی اپنے مشن کی خاطر گوارا کر لیتے ہیں اور آج کل کی ہولناک کشمکش زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ غدر میں فقط قید ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا۔ مجرد جیل چلے گئے تو کون سی ایسی کڑی جھیلی۔ بیوی بچوں کا کچا ساتھ تو تھا ہی نہیں' جن کی تباہی کا درد و غم سوہان روح ہو سکتا۔ البتہ شخصی راحت میں خلل پڑ گیا ہو گا اور یہی جسمانی راحت غالب کے لئے بڑی چیز تھی۔ افسوس ہے غالب نے چار دن بھی بہادر شاہ کے نمک کا پاس نہ کیا۔ تخت الٹتے ہی انگریزوں کے وفادار نمک خوار بن گئے۔ اک آج کل کے بندگان ادب ہیں کہ زندگی کی ہمت شکن کشمکش کے ساتھ یار و اغیار کے طعنے سنتے ہیں۔ اپنے ہنر پر عیب کا رنگ چڑھتے دیکھ رہے ہیں۔ اپنی تصنیفات کے ساتھ مخالفانہ سلوک دیکھ رہے ہیں اور دل ہی دل میں ہنستے ہیں کہ یہ مخالفت کتنے دنوں زندہ رہ سکے گی۔ حاسدان لکھنؤ کی جماعت کا وہ زور و شور' وہ پروپگنڈہ بھی دیکھا اور اخر پشیمان ہوتے بھی دیکھ لیا۔ اب غالب پرستوں کا زور دیکھنا ہے۔ خدا نے چاہا تو ان بہکی ہوئی ذہنیتوں کو بھی نادم ہوتے اور راہ پر آتے دیکھ لوں گا۔ میں نہ دیکھ سکا تو آپ دیکھ لیں گے اور اس وقت اپنی رائے بدل دینے پر مجبور ہوں گے۔ بغیر سمجھائے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ میں نے جو کچھ بھی غالب پر تمسخر یا تنقید کی ہے وہ کتنی حق بجانب کتنی صحیح اور کتنی ضروری تھی۔ دیکھ لیجئے گا یہ تمسخر بھی اک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے گا۔ کیوں کہ فی الحقیقت یہ تمسخر کسی عداوت پر تو مبنی ہے نہیں بلکہ ذہنیت عامہ کی اصلاح کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دل لگتی باتیں' دل لگی دل لگی میں کہہ دی جائیں۔ وہ زمانہ کیا آپ کو یاد نہیں جب میرے اس مصرع پر ۔ (آبروئے لکھنؤ خاک عظیم آباد ہوں) لکھنؤ میں قیامت برپا ہو گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سنگ سار کر دیا جاؤں گا۔ زندہ دفن کر دیا

جاؤں گا۔ مصرع چونکہ حقیقت حال کا ترجمان ہے اور نوک پلک سے اتنا درست ہے کہ دلوں میں سوراخ کئے دیتا ہے۔ اس لئے سارا لکھنؤ بلبلا اٹھا۔ ورنہ کوئی ہوائی بات ہوتی تو ہنسی میں اڑ جاتی۔ غالب کی نسبت بھی جو کچھ تمسخر کیا گیا ہے وہ نرا تمسخر تو ہے نہیں سچ کی باتیں ہیں۔ دکھتی رگ مسل دی گئی لوگ بلبلا اٹھے۔ پانی کہاں مرتا ہے نشیب میں۔ لکھنؤ کی شورش بے جا کا انجام جو ہونے والا تھا وہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا زمانے نے آخر شورش پسندان لکھنؤ کے ہونٹ سی دیئے۔ ملک پر روشن ہو گیا کون کتنے پانی میں ہے۔ الہ آباد بنارس شاہجہان پور' علی گڑھ کے مشاعروں میں ان لوگوں کی بائیکاٹ کی مذموم کوششوں نے (جو کہیں کامیاب ہوئیں کہیں ناکام) آخر یہ دن دکھایا۔ کہ لکھنؤ کا معیار تہذیب و اخلاق نگاہوں میں سبک ہو گیا۔ اس کے ساتھ لکھنؤ کے ادبی اقتدار پر بھی زوال آگیا اور اب یہ دیکھ کر مجھے صدمہ ہوتا ہے کہ میری دیکھا دیکھی' ہر کس و ناکس لکھنؤ کے منہ پر آنے لگا ہے۔ آپ سمجھتے ہیں ۔ ہر کس و ناکس کا حوصلہ اتنا کیوں بڑھ گیا ہے کب سے بڑھنے لگا اور بڑھتا گیا۔
جب سے میں نے لکھنؤ میں آزادی کی جدوجہد شروع کی اور "چراغ سخن" میں اہل زبان اور زبان دان کا فرق فلسفیانہ اصول کے تحت دکھا دیا۔ میرے مسلسل جہاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہتیرے نا اہل بھی آزادی کی ہوس میں مطلق العنان ہو گئے ورنہ اس سے پہلے دوسرے صوبوں کا ذکر کیا خود یو۔ پی والے گوش بر آواز لکھنؤ رہتے تھے مگر اب تو گونڈہ بھی آزاد ہو گیا۔

خیر لکھنؤ تو اپنے کئے کو پہنچ چکا۔ اب عالمگیر غالب پرستی کے طوفان کا مقابلہ ہے۔ اس طوفان کا انجام بھی معلوم ہے۔ "آیات وجدانی اور "ترانہ" عالم شہود میں آچکا ہے۔ غالب کے آسمانی صحیفہ کا بھرم کھلتا جاتا ہے۔ چچا جان کو اب بھتیجے کے پیچھے چلنا پڑے گا۔ برابر چلنے کا موقع نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب اپنے صحیح مرتبہ سے گھٹ جائیں گے۔ ہاں ناجائز طور پر جو آسمانی خلعت خواہ مخواہ یاروں نے پہنا دیا ہے وہ اتر جائے گا۔ شارحین نے غالب کے ناقص اشعار پر (جو کاٹ کر پھینک دینے کے قابل ہیں) فضول حاشیہ آرائیوں سے جس بدمذاقی کو رواج دیا ہے اور تعلیم یافتہ گمراہوں نے اردو کی دنیا میں قحط الرجال کی شرم محسوس کر کے خواہ مخواہ غالب کو سوانگ بنا کر یونان و جرمنی کے فلاسفروں سے بھڑا دینے کا جو مضحکہ انگیز شیوہ اختیار کیا ہے اس کی ٹھیک نکلنے ہی کو ہے۔ میں نے گذشتہ بیس سال کے دوران میں مختلف مضامین کے ذریعہ سے غالب کی شاعری کے مجروح پہلو پر روشنی ڈالنے کے سوا ان کے کیرکٹر سے زیادہ بحث نہیں کی جس پر خود ان کے مکتوبات اور قصائد وغیرہ سے روشنی پڑتی ہے اور قاطع برہان پر غالب کی بد زبانی اور بد کلامی کی روشن مثال ہے۔ اس کا کیا کہنا؟ غالب کی دیکھا دیکھی مجھے بھی کھری کھری سنا دینے کی عادت پڑ گئی۔ اس معاملہ خاص میں مجھ پر غالب ہی کا پرتو پڑا ہے۔ لوگوں کو میری اس عادت سے نفرت ہے اور ہونی چاہئے تو غالب سے اور زیادہ نفرت ہونی چاہئے کہ وہ اس فن (تلخ نوائی) کے امام ہیں۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ غالب کے کیرکٹر پر میں نے پہلے کوئی خاص تنقید نہیں کی مگر زمانے میں عمل کے بعد رد عمل کا قانون بھی اٹل ہے۔ پنڈولم اپنی حد کو پہنچ کر پلٹا ضرور لے گا۔ غالب شاعروں میں شاعر' رئیسوں میں رئیس' درباریوں میں درباری' فلاسفروں میں فلاسفر' صوفیوں میں صوفی سپاہیوں میں سپاہی وطن پرستوں میں وطن پرست۔ آخر یہ ہے کیا بکواس ان

بے سروپا ہذیانات کو دیکھ کر آخر ڈاکٹر عبداللطیف۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی نے غالب کے نظریہ زندگی اور ان کے کیرکٹر کو تنقید کی کسوٹی پر کس کے دکھایا کہ غالب کی حقیقت کیا ہے! ڈاکٹر موصوف کی معرکہ آرا تصنیف "غالب" پر بہت کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں مگر حقیقت آخر حقیقت ہے۔ زبان سے کوئی کتنا ہی انکار کرے مگر حقیقت کا وزن دلوں پر اتنا پڑتا ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔

لگے ہاتھوں یہ بھی بتاتا چلوں کہ غالب کی شاعری کے کمزور پہلو اور ان کے قابل الزام کیرکٹر پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کے جواب میں جو صفائی پیش کی جاتی ہے وہ کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ کتنا بھولا پن ٹپکتا ہے غالب پرستوں کے جواب سے۔ غالب کی چوریوں کا جب قطعی ثبوت پیش کر دیا جاتا ہے اور مال مسروقہ بھی سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔..... (یعنی فارسی لٹریچر کا وہ حصہ جس سے غالب کے بہتیرے اشعار ماخوذ ہیں یا چرا لئے گئے ہیں۔ یا بطور ترجمہ اردو کے قالب میں ڈھال لئے گئے ہیں ترجمہ کہیں بن پڑا ہے کہیں بگڑ گیا ہے۔ اور اتفاقاً" کہیں اصل سے زیادہ چست اور خوبصورت بھی ہو گیا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ غالب کے سارے کلام کے متعلق ڈنکے کی چوٹ Originality کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے کم از کم یہ دعویٰ تو مال مسروقہ کی موجودگی میں باطل اور لغو ٹھہرتا ہے کیونکہ سینکڑوں برس پہلے سے وہ مضامین فارسی لٹریچر میں موجود ہیں۔ کیا غالب فارسی لٹریچر سے بے خبر تھے کہ ان چرائے ہوئے مضمونوں کو توارد کی آڑ پکڑ کر غالب ہی کا نتیجہ تخیل کہا جا سکے۔ البتہ شکسپیر اور ملٹن کے کلام سے کسی اچھوتے مضمون میں توارد ہو جائے تو اسے توارد کہہ سکتے ہیں۔ یہ بحث جداگانہ موقع پر کی جائے گی کہ غالب کے کن کن اشعار پر فی الواقعی توارد کا حکم لگایا جا سکتا ہے اور کن کن اشعار سے کھلا ہوا بے ڈھنگا سرقہ ثابت ہے۔ اصل و نقل کو سامنے رکھ کر حقیقت کھل سکتی ہے۔

خیر جب اس طرح مال مسروقہ سامنے رکھ دیا جاتا ہے تو غالب کے وکیل اس الزام کو تو رد کر سکتے نہیں کیوں کہ مال مسروقہ برآمد ہی ہو گیا۔ بڑی غیرت داری بڑی معصومیت سے یہ جواب دیتے ہیں' جواب کیا دیتے ہیں سر کی بلا ٹالتے ہیں۔ خفت مٹاتے ہیں کہ ترجمہ وغیرہ کی مثالیں عموماً" تمام شعرا کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ غالب پر کیا دوش ہے۔ واہ واہ کہاں تو Originality کے وہ بلند آہنگ دعوے اور کہاں یہ الزامی جواب غالب پرستوں کی انتہائی عاجزی کی دلیل ہے۔ غالب کے سر سے الزام اتر نہ سکا تو دوسروں پر بھی الزام رکھ دیا۔ سبحان اللہ۔ ارے میاں دوسروں سے غلطی ہوتی ہے اور ہو گی کیوں کہ وہ انسان ہیں مگر غالب تو آسمانی دیوتا ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے کہ جب غالب کی شاعری زیر بحث ہوتی ہے تو اس وقت وہ گویا آسمان کے تارے توڑ لاتا ہے اوروں کا جو آسمان ہے وہ غالب کی زمین ہے (اللہ اللہ) اس کا کلام سراسر الہام ہے۔ آسمانی صحیفہ ہے (لاحول) عام شعرا کی سطح سے وہ اتنا بلند دکھایا جاتا ہے گویا وہ اس دنیا کا کوئی آدمی نہیں ہے بلکہ کوئی فوق البشر ہستی ہے۔ اس کا فلفسہ زیر بحث ہوتا ہے (خدا جانے غالب کا فلسفہ کیا بلا ہے سوا اس کے کہ میرزا بیدل وغیرہ کے ہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اڑا لیتا ہے اور بس) تو وہ ایک پلے میں رکھ دیا جاتا ہے اور یورپ کے تمام فلاسفر دوسرے پلے میں بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ خیر ہو گا۔ ہمیں اس سے کیا مطلب۔ مگر دل لگی تو یہ ہے کہ جب ایسی فوق البشر ہستی کی کھلی ہوئی بیڈھنگی' چوریاں یا ترجمے پیش کر دیئے جاتے ہیں تو وہی شخص گویا آسمان سے قلابازیاں کھاتا ہوا ہندوستان کے دیگر بے مایہ شاعروں کی طرح چوریوں کا بھی مرتکب ہوتا ہے (واہ واہ) اور ایک حمام میں سب ننگے کا مصداق ہو کر گویا چوری کے الزام سے بری ہو جاتا

ہے۔ اے ماشاء اللہ جس کے افکار سراسر الہامی اور Original کے جاتے ہیں وہی دوسروں کی طرح چوری بھی کرتا ہے یعنی وہی کلام ------ Original بھی ہے اور سرقہ بھی (سبحان اللہ) وہی آسمانی شخص عام شاعروں کی طرح ترچھے بھی کرتا ہے غلطیاں بھی کرتا ہے ٹھوکریں بھی کھاتا ہے اور بصورت خاص یعنی رفع الزام کی خاطر عام شعراء کے گروہ کا ایک آدمی ٹھہرایا جاتا ہے اور قابل معافی بتایا جاتا ہے۔ یعنی اس کا عیب تو شعراء کے معیار پر پرکھ کر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور اس کا ہنر خاص الخاص آسمانی چیز ہے۔ خدا جانے یہ کون سی منطق کون سا فلسفہ ہے۔ یہ ساری منطق ہم ایسے جاہلوں بے خبروں کو گمراہ کرنے کے لئے وضع ہوئی ہے۔ میں پوچھتا ہوں اگر کوئی پیغمبر، کوئی فلاسفر، عام مجرموں کی طرح گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو تو کیا اس کی سزا وہی ہوگی' اس کے ساتھ وہی رعایت کی جائے گی جو عام مجرموں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ زیادہ اور بہت زیادہ سزا کا مستحق ہے کیوں کہ اس کا اخلاق عام سطح سے بہت بالا ہونا چاہئے۔ لہٰذا غالب کی نسبت تمام بے سروپا اہتمام فضیلت کو پیش نظر رکھ کر ان کی چوریاں' درباری شاعروں کی طرح خلعت فاخرہ کی تمنائیں اور انگریزوں کو خوشامدیں حد سے زیادہ قابل نفرت ہیں۔ دوسرے شعراء چوری کرتے ہیں۔ جھک مارتے ہیں تو غالب دوسروں کی طرح کیوں جھک ماریں۔ ان کا اخلاق عام سطح سے بالا ہونا چاہئے تھا مگر ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔ میر تقی میر۔ میرانیس۔ خواجہ آتش کے سامنے وہ اخلاقی اعتبار سے میرزائیت کے اعتبار سے بہت پست نظر آتے ہیں۔ موخر الذکر بزرگواروں کی مردانہ و شریفانہ زندگی سے غالب کی خودغرضانہ زندگی کا مقابلہ کر دیکھئے' ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔

شاعرانہ چوری اور بھٹئی (قصیدہ گوئی) کے علاوہ غالب میں ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فطری جوہر۔ اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کا صحیح مصرف نہ لے سکے۔ تلون مزاجی کے ہاتھوں ان کی ذہنی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی اور سرگشتگی میں گزر گیا آج وہ جلال اسیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں کبھی نظیری کی۔ کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں کبھی کسی کا کبھی کسی کا۔ زمانہ دراز تک ان کی طبیعت نے کوئی خاص رنگ پکڑا ہی نہیں کسی مرکز پر انہیں قرار ہی نہیں۔ آئے دن رنگ بدلتے رہے۔ آج ایک کو اپنا لیڈر بنایا تو کل دوسرے' پرسوں تیسرے کو۔ چنانچہ خود ان کا کلام اس حقیقت کا شاہد ہے کہ اور شعر تو صاف صاف ان کے تلون کی چغلی کھاتا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

غالب

خدا بھلا کرے نکتہ چینوں کا جن کے تشدد سے تنگ آکر عمر میں میر تقی میر کو اپنا امام بنایا جب کہیں راہ راست پر آئے چنانچہ اپنے ایک مکتوب میں خود اس امر کا اقرار کیا ہے۔ وہی آخر عمر کا کلام جو میر تقی میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے۔ غالب کی شاعری کی جان اور اردو لٹریچر کا سرمایہ ناز ہے۔ اس سرمایہ پر اردو جتنا چاہے فخر کرے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔ یورپ کی ذہنی روشنی میں غالب کو دیکھنا کتنا غلط اصول ہے بھلا یورپ کی فضا سے غالب کے ذہن کو کیا تعلق۔ غالب کی نشوونما ہندوستان میں اور ایرانی لٹریچر کی فضا میں ہوئی۔ فارسی لٹریچر کی روشنی میں غالب کے کلام پر صحیح تنقید ہو سکتی ہے۔ یورپ کے فلاسفروں سے بھڑانا محض ایک طفلانہ بوالعجبی ہے' غالب پر حاشیہ آرائی کرنے والے فارسی لٹریچر کو

پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ فارسی لٹریچر کو سامنے رکھ کر تنقید کرتے تو کبھی دیوان غالب کو آسمانی صحیفہ یا سراسر الہامی یا اوریجنل۔ (Original) نہ کہتے۔ غالب زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال' وقت پسند' گمراہ شاعر ہے۔ جو آخر میں راہ پر آیا۔ مگر صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ صوفی اور وطن پرست' کا خلعت پہنانا تو نہایت مضحکہ خیز عقیدت مندی ہے غالب میں تو اوسط درجہ کی خودداری اور میرزائیت بھی نہ تھی جو اس زمانے کے عام شرفاء کا چلن تھا۔ دلی کا تخت الٹ گیا۔ بہادر شاہ قید ہو کر رنگوں سدھارے اور غالب کو اپنے حلوے مانڈے' اپنے خلعت و پنشن۔ جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید کی ہوس دامن گیر رہی۔ بڑھاپے میں لاٹ صاحب کے دربار میں شریک ہونے کی ہوس دل میں رہ گئی۔ خود فرماتے ہیں کہ میرے پاس زر ہوتا ہے تو میں باوجود اس پیرانہ سالی ضعف و نقاہت کے لاہور جاتا اور لاٹ صاحب کے دربار میں شریک ہوتا۔ مگر مجبور ہوں داغ حسرت لئے جاتا ہوں۔ غور کیجئے کیا صوفی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وطن پرستوں کی یہ شان ہے۔ اک آزاد حقیقی شاعر کا مطمح نظر اتنا پست ہو سکتا ہے۔ اک خواجہ آتش تھے کہ بادشاہ نے خلعت و نقدان کے گھر بھیجا اور شہزادے کی تقریب شادی میں شرکت کی دعوت بھیجی۔ مگر خواجہ صاحب نے الٹا واپس کر دیا۔ کہ میری طرف سے بہت بہت تسلیم عرض کرنا اور یہ کہنا کہ اگر میں شریک ہوتا تو کچھ نوید ضرور دیتا لہٰذا یہ میری طرف سے نوید تصور فرمائی جائے مگر میں حضوری سے مجبور ہوں۔ کجا یہ شان مردانگی کجا وہ درباداری۔

مائی ڈیر مسعود صاحب کیا کہوں سخت افسوس ہے کہ ملک کی قوت فیصلہ اور تمیز نیک و بد کو مختل و معطل دیکھ کر مجھے غالب کے کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالنا پڑی ورنہ مجھ سے غالب مغفور سے مخالفت و مخاصمت کا کوئی موقع ہی نہیں ہے۔ وہ انیسویں صدی کے۔ میں بیسویں صدی کا۔ میں کہتا ہوں اور کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تعلیم یافتہ گمراہوں کی بہ نسبت غالب کے کمالات شعری کی صحیح قدر شناسی کا جوہر فطرت نے مجھ میں زیادہ ودیعت کیا ہے۔ شاعر کو' بہ حیثیت شاعر' شاعر ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ مگر بصرورت خاص غالب کے متعلق اس قدر تلخ حقیقتوں کا انکشاف اس لئے جائز سمجھتا ہوں کہ غالب پرست ذرا حقیقت تلخ کا مزہ بھی چکھ لیں کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا کہ جو لوگ گئے گذرے ہو چکے ان کی خلقی کمزوریوں کو بکھانا سخت کم ظرفی و خباثت کی دلیل ہے۔ کیا مجھ میں وہ کمزوریاں نہیں ہیں جو انسان میں ہوتی ہیں مگر میں کیا کروں۔ میں اسے ادبی خدمت سمجھ کر ضروری سمجھ کر کرتا ہوں۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری یہ تلخ نوائی کسی مخاصمانہ جذبہ کے تحت ہے یا اس میں کوئی اصلاحی اسپرٹ پوشیدہ ہے۔ آپ غالباً" اتنا ضرور سمجھتے ہوں گے کہ میری ان تمام تقریروں کا مخاطب غالب نہیں ہو سکتا کیونکہ گفتگو مردوں سے نہیں ہوتی زندوں سے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس حقیقت پر نظر رکھنی چاہئے کہ میرزا غالب نے خود اپنے پیشتر (مولف قاطع برہان) پر نہایت سخت لب و لہجہ میں تنقید کی ہے۔ مجھ سے زیادہ غالب پر سخت کلامی یا بد اخلاقی کا الزام کھپ سکتا ہے۔ دوسری وجہ میرے اس بے باکانہ لب و لہجہ کی یہ بھی ہے کہ غالب پرستوں نے غالب کی مدح میں حد سے زیادہ غلو سے کام لیا ہے تمام اساتذۂ اردو کا حق تلف کر کے غالب کو دے دیا ہے مگر میں نے غالب کا حق تلف نہیں کیا۔ ہاں کھری کھری سنا دیں' جس کے مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست ہیں۔

یگانہ چنگیزی اور غالب

سید مصباح الدین عبدالرحمان

غالب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جھنجلا اٹھنے والوں میں مرزا واجد حسین یگانہ (المتوفی ۱۹۵۹ء) کا نام بہت نمایاں ہے' وہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے' ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے' ۱۹۰۳ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول گلزار باغ پٹنہ میں انٹرنس پاس ہوئے' ان کا خود بیان ہے کہ استاد المکرم فخرالمتاخرین جناب خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد کی آغوش میں تربیت پائی' شروع میں یاس تخلص کرتے تھے' اس لئے ایک عرصہ تک یاس عظیم آبادی کے نام سے چھپتے رہے' ان کی شادی لکھنؤ میں ہوئی تو یہیں منتقل ہو گئے' یہاں مرزا انیس کے پوتے حضرت رشید رضا صاحب سے مشورہ سخن کرنے لگے' اور اپنے کو یاس عظیم آبادی ثم لکھنوی کہنے لگے' یاس سے یگانہ ہو گئے' پھر یگانہ کے آگے علیہ السلام بڑھا دیا' پھر یگانہ چنگیزی ہو گئے' اپنی کتاب "غالب شکن" کو چنگیز خاں کے نام سے ان الفاظ میں معنون کیا:۔

> "بجناب ہیبت ماب' دیوتائے جلال و عتاب پیغمبر قہر و عذاب' دشمن تہذیب پر فن حق شناس' باطل شکن' مرد میدان' بگیر و بزن شہنشاہ بنی آدم' سرتاج سکندر و جم حضرت چنگیز خاں اعظم قہراللہ۔"

اپنی چنگیزیت میں خوش تھے' کہ "وہ مار گھونسوں کے داد وصول لیتے ہیں" (غالب شکن: ۴) لکھنؤ کے شعراء مثلاً صفی' عزیز' ثاقب اور محشر وغیرہ سے ان کی بڑی معرکہ آرائی ہوئی' انھوں نے ان کا بائیکاٹ کیا' تو اس کو وہ اپنی فتح و کامرانی سمجھتے رہے' جیسا کہ لکھتے ہیں:۔

> "تمام شعرائے لکھنؤ عاجز آکر میرا بائیکاٹ کرنے پر مجبور ہوئے' سامنے آنا منہ دکھانا چھوڑ دیا' ذرہ غور تو کیجئے' اس سے بڑھکر داد اور کیا ہوگی' بائیکاٹ کا فلسفہ تو یہی ہے کہ روندا ہوا دشمن جب ہر طرف سے عاجز آ جاتا ہے' کوئی کاٹ نہیں کر سکتا تو بائیکاٹ کے حربہ پر اتر آتا ہے' (ص: ۴)

اپنی اس خود پرستی میں خوش تھے کہ "انھوں نے غوغا بیان لکھنؤ کے منہ کیل دے بولتی ماردی۔" (ص: ۱۳) لیکن اس دعوی کے باوجود انکو لکھنؤ کے غوغائیوں سے پریشانیاں بھی اٹھانا پڑیں' وہ خود ہی لکھتے ہیں:۔

> "عزت کو میں نے لکھنؤ میں ..... قربان کر ڈالا' کیا کیا گالیاں کھائیں' مغلظات' کیا کیا ہجویں سنیں' کیا کیا مادی نقصان اٹھائے' لگی لگائی روزی' اودھ اخبار کی ملازمت چھوڑی..... آجکل اپنے وطن میں ساٹھ (۶۰) روپے کی ملازمت ایک صاحب اہل و عیال کے لئے بڑی قیمتی چیز ہے' ایسی ملازمت کو اپنی اصول پرستی کے سبب ترک کر دینا پڑا' اس زمانہ میں (کہ شاعروں کو کوئی پوچھتا تک نہیں' کیونکہ شاعری ایک سند سمجھی جاتی ہے' نکمے پن کی شاعری گویا عقل و خرد سے بالکل بے گانہ ہے' دنیا کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتا) کوئی آسان کام نہیں۔" (ص: ۱۱'۱۰)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان جھگڑوں میں جن کو وہ آرٹ کے مرتبہ کمال تک پہنچانے کی کوشش تصور کرتے رہے' ان کو

پورب، پچھم، اتر، دکھن کٹے کنکوے کی طرح تیاتے پھرنا پڑا، یہاں تک کہ لاتورو کن کے رجسٹرار ہو گئے،

لیکن معلوم نہیں کس اصول اور ضمیر پرستی کی بناء پر اپنے تخلص کے ساتھ علیہ السلام لکھنا شروع کیا، اور دوسروں سے اپنے کو (Aliving mind of the east) کہلوایا، ان کے کلام کے مجموعہ آیات وجدانی کے شروع میں مرزا مراد بیگ شیرازی نے "محاضرات" لکھا ہے، اس میں غالباً" یگانہ ہی نے ان سے یہ لکھوایا،

> "بیسویں صدی کے ربع اول تک ہندوستان نے تین افراد کامل پیش کئے، جن کے نام ایشیا کے سخنوران علی الاطلاق کی فہرست میں آب زر سے لکھے جائیں گے.... اول دو (۲) شخصوں سے مراد مولانا شاہد اکبر آبادی؟ اور حضرت مرزا یگانہ لکھنوی المعروف بہ مرزا یگانہ یاس عظیم آبادی سے ہے، اور تیسری شخصیت سر ربندر ناتھ ٹیگور کی ہے، جوذی کمال ہونے کے علاوہ مادی زندگی اور شہرت عامہ کے اعتبار سے خلاف معمول کامیاب ثابت ہوئے۔" (آیات وجدانی ص ۳۴)

یہ تحریر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی، لیکن مرزا یگانہ کا انجام ان کی وفات سے پہلے ہوا، وہ ناظرین بھولے نہ ہوں گے، وہ لاتورو کن سے پنشن پا کر لکھنؤ واپس آئے تو ان کی وریدۂ ذہنی اور دشنام طرازی اتنی بڑھ گئی، کہ وہ آخر میں شاتم رسول بھی ہو گئے، غالباً" ۱۹۵۴ء کا سال تھا کہ ایک روز وہاں کے کچھ منچلے نوجوانوں نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ باہر آئے تو کسی بہانے سے ان کو ایک گدھے پر بٹھا دیا، جوتوں کا ہار پہنایا، ان کے منہ پر سیاہی لگا دی، ان پر تھوکا، بازار میں گھمایا، اور "شاتم رسول پر لعنت ہو" کے نعرے لگائے، وہ ایک زمانہ میں خوش تھے کہ انھوں نے غوغائیان لکھنؤ کے منہ کیل دیئے، بولتی ماردی تھی لیکن ان ہی غوغائیان نے ان کی آخری زندگی میں "ان کی بولتی ماردی" اور شاید اسی غم میں وہ ۱۹۵۹ء میں اس دنیا سے چل بسے۔

انکو یہ رسوائی انکے خیال میں حق پرستی، فرض شناسی اور اصول پرستی کی خاطر اٹھانی پڑی، ان کا دعوی رہا کہ انکی تخریب میں تعمیر مضمر رہی، لیکن اس تخریب سے وہ خود پرست ضرور ہو گئے ہونگے، انھوں نے اپنے کو رابندر ناتھ ٹیگور کی صف میں تو لا کر ضرور کھڑا کر دیا تھا، مگر ان کو احساس رہا کہ انکی وہ قدر نہیں ہوئی، جو رابندر ناتھ ٹیگور کی ہوتی رہی، اس لئے وہ اس یاس میں باغی بن کر چنگیزیت پر اتر آئے، اور گویا لوگ ان کو سڑی، سودائی، پریشان روزگار، آوارۂ کوچہ و بازار سمجھتے رہے، لیکن وہ اپنے کو یکتائے زمانہ، شیر دل، بات کا دھنی، سخور بالا دست اور نشہ کمال میں مست تصور کرتے رہے،

اسی نشہ کمال کی مستی میں غالب شکنی کا بیڑا اٹھایا، گو ان کے مادح مرزا مراد بیگ شیرازی نے ان کی زندگی ہی میں لکھا تھا، کہ مرزا صاحب خواجہ آتش کے فدائیوں میں اور غالب کے بھی بڑے معتقد تھے، مگر جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے حریف جو غالب کے مرتبہ سے ناآشنا ہیں جھوٹ موٹ غالب کی تعریفیں کیا کرتے ہیں، اور خواہ مخواہ خواجہ آتش کے منہ آیا کرتے ہیں، تو پھر مقامی ضرورتوں نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ غالب کی حقیقت بھی واضح کر دی جائے یہیں سے غالب پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اور یہیں سے مرزا یاس کی خود پرستی کی بنیاد پڑی ہے، (آیات وجدانی ص ۱۳-۱۲)

وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس ادبی ریفارمر نے غالب پر نکتہ چینی لکھنؤ والوں کی فرعونیت کی سرکوبی کی خاطر کی (ص ۲۱) مگر لکھنؤ والوں کی "حماقت اور فرعونیت" کے لئے غالب کو تختہ مشق بنانا کہاں تک درست تھا؟ پھر اس سلسلہ میں انھوں نے بیس (۲۰) سال تک (غالب شکن ص ۱۵) جو لب و لہجہ اختیار کیا، وہ کسی استاد فرزانہ، یکتائے زمانہ اور باکمال سخور کے شایان شان نہیں ہو سکتا، غالب کے خلاف ان کا پہلا مضمون غالباً" ۱۹۱۵ء میں ہاپوڑ کے ایک رسالہ خیال میں شائع ہوا، جس میں انھوں نے آتش اور

غالب کی ایک غزل کا موازنہ کرکے آتش کی برتری ثابت کی ہے' یہ مضمون میری نظر سے نہیں گذار' ۶۰-۱۹۵۹ء اور ۶۱-۱۹۶۰ء کے علی گڑھ میگزین میں یگانہ کی خود نوشتہ سوانح عمری کا کچھ حصہ شائع ہوا تھا' یہ خود نوشت سوا نہجری ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی' جو غالباً" نامکمل رہی اس پر انھوں نے غالب کے ایک شعر پر بہت ہی فاضلانہ تنقید کرکے آخر میں آتش کو اونچا دکھایا ہے' اس تنقید کے کچھ حصے یہاں درج کرنے کے لائق ہیں' اگر اس طوالت پیدا ہو جائے تو ناظرین اس کو دلچسپ اور پر مغز سمجھ کر معاف کریں' غالب کا ایک شعر ہے:-

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

یگانہ جو اس خود نوشتہ سوانح عمری کے وقت یاس تھے' لکھتے ہیں جناب حسرت موہانی اس شعر کی شرح بس اس قدر کرتے ہیں کہ یہ شعر ویسا ہی ہے جیسے غالب کا ایک دوسرا شعر ہے'

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے' جتنا کہ اڑتا جائے ہے

جناب حسرت کے اس اختصار کی داد نہیں دی جاسکتی' غالباً" جناب موصوف اس شعر کے اصل معنی سمجھ نہ سکے اور نہ کوئی دوسرے معنی پہنانے کی کوشش کی' ایک دوسرا شعر نقل کرکے ٹال دیا ہے' مگر حیرت تو یہ ہے کہ تشریح و توضیح کے لئے جو شعر نقل کیا گیا ہے' اس کی نوعیت مضمون بالکل جداگانہ ہے' کیونکہ:-

ہو کے عاشق وہ پری رو اور نازک بن گیا

یہاں پری رو یعنی معشوق کا خود عاشق ہونا دکھایا گیا ہے' اور گلہائے تازہ والے شعر میں معشوق کا عاشق ہونا نہیں بلکہ عاشق کے رنگ شکستہ کو دیکھ کر معشوق کا محو ناز ہونا ثابت ہوتا ہے' جناب حسرت موہانی نے جو شعر اس کی شرح میں نقل کیا ہے وہ مقتضائے مقام کے خلاف ہے'

حسرت پر یہ تنقید کرکے یاس یگانہ اس شعر کی جو شرح مولانا سید حیدر علی طباطبائی نے کی ہے اس کو نقل کرتے ہیں' اس کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں'

طباطبائی: نظارہ اس کا یعنی معشوق کا موسم بہار ہے' اور اس کے نظارے سے میرا (عاشق کا) رنگ اڑ جاتا ہے' طلوع صبح بہار ہے' پھولوں کے کھلنے کا وقت ہے' غرض یہ ہے کہ ہر وقت نظارہ منہ پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر وہ (معشوق) سرگرم ناز ہوگا' یعنی میرا رنگ اڑنا وہ صبح ہے جس میں گلہائے ناز شگفتہ ہوں گے'

یاس: اگر اس شعر کے یہی معنی لئے جائیں تو بھی اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شعر کی بندش بے ڈھنگی ہے' بات وہ کہنی چاہیے کہ جو کہنے کے قابل ہو' اور اس طرح کرنا چاہیے جو سن سکیں' ورنہ خاموشی بہتر ہے' اس شعر کا اور اس کی شرح کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ نظارۂ جمال سے عاشق کا رنگ اڑتے دیکھ کر معشوق کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے' اس بات کو صاف اور سلجھے ہوئے الفاظ میں بیان کرنا مشکل نہ تھا' مگر غالب نے انداز بیان میں وہ سنجیدگی اختیار کی' یعنی رنگ اڑنے کو صبح سے استعارہ کرنا اور صبح کون سی صبح بہار' اور بہار کیسی بہار نظارہ اور پھر اس صبح بہار نظارہ کے لئے پھولوں کا کھلنا' پھول کون سے گلہائے ناز اور گلہائے ناز کے لئے شگفتن کی سی نامانوس لفظ (نامانوس باعتبار زبان اردو) جس سے سخن فہموں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ آیا یہ شعر کسی واہی شاعر کا ہے یا

اکتسابی شاعر کا' کیونکہ اس قسم کی بندشیں وہبی شاعر کی شان سے بعید ہیں اور غالب کا دیوان ان ہی پیچیدہ بندشوں سے بھرا پڑا ہے' کہ ذہن کو بجائے انبساط الٹے تکلیف سی محسوس ہوتی ہے سیدھی طرف سے ناک نہ چھوتی الٹی چال چلے ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ شاعر اکثر سیدھی راہ سے قطع نظر کرکے دوسری راہ اختیار کرتا ہے' اور اس کی یہ رفتار بیحد دل پسند بھی ہوتی ہے' مگر اس رفتار خاص کے محل اور موقع ہوتے ہیں' ہر جگہ یہ روش پسندیدہ نہیں ہوتی..... شاعر دو دیکھنا چاہیے کہ جو نئی راہ اختیار کی گئی ہے وہ پسندیدہ اور مناسب مقام بھی ہے یا نہیں' غالب نے اس شعر میں اپنے مفہوم ذہنی کے ادا کرنے کے لئے جو استعارے پیدا کئے ہیں (یعنی رنگ اڑنے کے لئے صبح بہار نظارہ ارناز کے لئے گل اور گل کے لئے شگفتن وغیرہ) وہ اس مقام خاص پر مذاق سلیم کے نزدیک بالکل مضحک ہیں' شاعر کو حسن کلام پر نظر رکھ کر سادگی و تکلف کی مختلف صورتوں میں امتیاز کرنا چاہیے' رنگ شکستہ اور بہار نظارہ وغیرہ یہ سب ترکیبیں اپنی اپنی جگہ فصیح اور خوش آئین ہیں' مگر اس شعر میں ان کی ترکیب باہمی سے جو مصرعے پیدا ہوتے ہیں وہ ذہن کو الجھن میں ڈال دیتے ہیں..... غالب کے اس شعر میں یہی عیب ہے' کہ یہ سب الفاظ اپنی اپنی جگہ فصیح ہیں' مگر ترکیب باہمی سے مصرعے غیر فصیح ہوگئے ہیں' مولانا طباطبائی نے جو اس شعر کی شرح کی ہی بالکل الگ ہے' یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے' کہ شعر مہمل ہے' ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق ایک معنی گڑھ لیتا ہے ورنہ اختلاف کیوں ہوتا' شعر وہی ہے جس کا ایک رخ کم از کم سب کی نظروں میں یکساں دکھائی دے' ہاں' اس ایک معنی کے علاوہ اور بھی نزاکتیں پائی جائیں تو سبحان اللہ! اور اگر ایک رخ بھی صاف نظر نہیں آتا تو شعر مہمل ہے' خواہ مخواہ بھی استقرار معنی میں اختلاف واقع ہوگا' یہی الفاظ (رنگ شکستہ' صبح بہار بہار نظارہ) اور لوگوں کے یہاں بھی ملیں گے' مگر یہاں جس طرح سے صرف ہوئے ہیں۔ اہل نظر کے نزدیک مضحک ہیں' مذاق سلیم کے دربار میں یہ الفاظ بزبان حال فریاد کر رہے ہیں' کہ ہماری ذات میں صانع نے وہ قوت بخشی تھی' کہ اگر صحیح مصرف لیا جاتا تو ہم دلوں کو مسخر کر لیتے' مگر کیا کریں مجبور ہیں' شاعر نے ہمارا صحیح مصرف نہ لیا' ہم کو ایسی ذلیل اور پست جگہ پر بٹھا دیا ہے' جہاں سے ہمارا حسن عیب نظر آتا ہے' زبان اردو الگ فریاد کرتی ہے کہ رنگ شکستہ کے بعد فارسی کا دوسرا ٹکڑا صبح بہار نظارہ اور پھر اسی کے بعد شگفتن کی اضافت گلہائے ناز پر وغیرہ نے مل کر میری مٹی خراب کر دی ہے' اس شعر کی شرحیں لوگوں نے اپنی سمجھ کے مطابق کی ہیں'

اس کے بعد یاس نے شوکت میرٹھی' واجد دکنی' فراغ دیوبندی' وغیرہ کی شرحیں نقل اور ان کو رد کرکے آخر میں غالب کے شعر کے مقابلہ میں خواجہ آتش کا یہ شعر پیش کیا ہے:۔

کیونکہ وہ نازنیں نہ کرے بے نیازیاں
انداز سے بھی حوصلہ عالی ہے ناز کا

اس پر یاس نے اپنی رائے لکھی ہے کہ زبان اردو کی نفاست کے ساتھ شعر میں اعلیٰ درجہ کی معرفت بھر دی ہے' حق یہ ہے کہ خواجہ صاحب کا یہ شعر باعتبار معنی و لفظ عرش معلی کو پہنچا ہوا ہے' اور ایسا ہے کہ اہل حال کو صحبتوں میں پڑھا جائے تو لوگ وجد کرنے لگیں' غالب کے شعر میں معنوی خوبی اگر تسلیم بھی کرلی جائے تو الفاظ کا جامہ اتنا مضحک ٹھہرتا ہے کہ اردو زبان کے لئے باعث ننگ ہے' خواجہ صاحب چونکہ شاعر ہیں' اہل دل ہیں' اہل زبان ہیں' شاعری کا پورا پورا حق ادا کر دیا' خواجہ آتش کا شعر سو (۱۰۰) میں سو (۱۰۰) نمبر پانے کا مستحق ہے' اور غالب کا یہ شعر سو (۱۰۰) میں دس (۱۰) نمبر بھی مشکل سے پا سکتا ہے

یگانہ کی مذکورہ بالا رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن وہ غالب شکنی میں یہی طرز اختیار کرتے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے مقصد میں بہت تو نہیں' مگر تھوڑا بہت کامیاب ہو سکتے تھے لیکن وہ اپنے مقتضائے طبیعت سے مجبور ہو گئے' اور سنجیدہ تحریر لکھنے کے بجائے غالب

پر مضحک رباعیاں لکھنے لگے' جو انھوں نے اپنے مجموعہ 'کلام ترانہ (۱۹۲۷ء) اور پھر بعد میں غالب میں "غالب شکن" میں شائع کیں' ان میں سے کچھ رباعیاں یہ ہیں:-

دیوانوں کے یہ زور نہ دیکھے نہ سنے
نادانوں کے یہ شور نہ دیکھے نہ سنے
جھنڈے پہ چڑھانے کو چڑھاتے ہیں مگر
غالب سے چچا چور نہ دیکھے نہ سنے

غالب کو میر سے بڑھانے والے
چوروں کو بانس پر چڑھانے والے
اندھوں کو اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے
دنیا کو غلط سبق پڑھانے والے

چنگیزی لہو ہے اپنی رگ رگ میں رچا
مجھ سے جوتیتے تو منہ کی کھاؤ گے چچا
غالب کو چچا بنا کے چھوڑا میں نے
غالب میرے 'چچا' میں غالب کا چچا

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے
مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
و اللہ گریباں میں منہ ڈال کے دیکھ
غالب کو وطن پرست کہنے والے

غالب بھی ہے و اللہ انوکھا صوفی
انگریز کے دربار کا بھوکا صوفی
پنشن جو ہوئی بند تو بھوک اور کھلی
ہے ایسا کوئی پیٹ کا بندہ صوفی

اللہ رہی ہوا و ہوس خلعت و زر
مرزا کا سر ہے اور انگریز کا در

ہاں کیوں نہ ہوں مورکھوں کے دیوتا غالب
ہے باؤلے گاؤں اونٹ بھی پربشر

بعض رباعیاں تو ایسی ہیں کہ سنجیدہ تحریروں کے ساتھ نقل نہیں کی جاسکتی ہیں' انھوں نے اپنی نثری تحریروں میں بھی غالب کو برا بھلا کہنے میں غیر سنجیدہ انداز اختیار کیا ہے' پروفیسر مسعود حسن رضوی کو ایک خط لکھا تو اس کو اپنی کتاب غالب شکن میں بھی منسلک کردیا ہے' اس میں وہ کہتے ہیں :۔

"غالب کیا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہندوستان کا ایک بلند خیال' وقت پسند شاعر جو بسا اوقات اپنے اونٹ پٹانگ تخیلات کی بھول بھلیوں میں گم ہو جایا کرتا ہے' اور اس کے ساتھ ہی وہ پرلے سرے کا بے سرا بھی ہے' پرانا چور اور چور کے ساتھ گونگا بھی ہے' مضمون چرانے کو چراتا ہے' مگر ہضم نہیں کر سکتا' تصرف کی قدرت نہیں رکھتا' چوری کھلی جاتی ہے' زبان ایسی گونگی کہ نفس مطلب کو شاعرانہ زبان میں ادا نہیں کر سکتا' ٹھونس کے تک بندی کرلیتا ہے۔" (ص ۳)

"غالب کی لنگڑی شاعری کو بہکی ہوئی ذہنیتیں حسن کمال پر محمول کرنے لگی ہیں (ص ۳)

"غالب کو اردو زبان کا واحد نمائندہ ٹھہرانا اس کے کلام کو سراسر الہامی اور تخیل کہنا' حاشیہ نویسی و شرح نگاری کا دھندا اختیار کرنا' مصنوعی پروپیگنڈا ادبی تجارت ہے۔" (ص ۹)

!"غالب شاعروں میں شاعر رئیسوں میں رئیس' درباریوں میں درباری' صوفیوں میں صوفی' رندوں میں رند' فلاسفروں میں فلاسفر سپاہیوں میں سپاہی' وطن پرستوں میں وطن پرست' آخر یہ ہے کیا بکواس۔" (ص ۱۶)

"غالب کا فلسفہ کیا ہے' سوا اس کے کہ مرزا بیدل' مرزا صائب وغیرہ کے یہاں سے چند فلسفیانہ نکتے اڑا لیتا ہے اور بس۔" (ص ۱۹)

ان جملوں کے ساتھ ان کے قلم سے غالب کے کلام کے لئے کچھ تعریفی کلمات بھی نکل گئے ہیں' جن کی خبر شاید ان کو نہ ہوئی ہو' وہ پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ "غالب کی شاعرانہ چوری اور بھٹی کے علاوہ ایک بڑا نقص یہ بھی تھا کہ وہ اپنے فطری جوہر اور اپنی اعلیٰ دماغی استعداد کا صحیح مصرف نہ لے سکے" ان جملوں میں کم از کم غالب کے فطری جوہر اور اعلیٰ دماغی استعداد کا اعتراف تو کیا گیا' غالب کی شاعری کا جادو کسی نہ کسی طرح سر پر چڑھ کر بول ہی دیتا ہے' اسی کے بعد وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ تلون مزاجی اور شاعرانہ بوالہوسی کے ہاتھوں غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ حیرانی و سرگشتگی میں گذر گیا' آج وہ مرزا جلال امیر کے مقلد ہیں تو کل شوکت بخارائی کے' کبھی عرفی کی نقالی کرتے ہیں۔ کبھی نظیری کی' کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے ہیں۔ کبھی صائب کا کبھی کسی کا یہ شعر ان کے تلون کی چغلی کھاتا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس کے بعد ان کے تعریفی کلمات یہ ہیں کہ "خدا بھلا کرے نکتہ چینوں کا جن کے تشدد سے تنگ آکر اخیر عمر میں میر تقی میر کو اپنا امام بنایا' جب کہیں راہ راست پر آئے' چنانچہ اپنے مکتوب میں خود اس کا اقرار کیا ہے کہ میں تو میر کے رنگ میں در آیا اور مومن خاں اپنی راہ چل پڑے' وہی آخر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کیا گیا ہے' غالب کی شاعری کی جان

اور اردو لٹریچر کا سرمایہ ناز ہے۔" (ص ۲۱)

یگانہ نے اوپر جو کچھ کہا ہے' اس کا لب و لہجہ شائستہ اور مہذب ہوتا تو ممکن ہے ان کی باتیں توجہ سے سنی جاتیں' ان کی رباعیاں اور اس قسم کی نثری تحریریں شائع ہوئیں' تو کچھ لوگ کہتے ان کے دماغ کا توازن درست نہیں' وہ ان کو جواب دیتے کہ دماغ تو اتنا صحیح ہے کہ دور سے بیٹھے بیٹھے ایک ذرہ سی چونچ بتا دی ہزاروں غلیچوں کو سڑی بنا کر جامے سے باہر کر دیا (ص ۲۹) اور اگر کوئی یہ کہتا کہ وہ یہ سب شہرت طلبی کے لیے لکھتے ہیں تو ان کو وہ یہ جواب دیتے کہ کہ مرزا یگانہ تو وہ شخص ہیں کہ حصول شہرت و شوق ہر دلعزیزی تو کجا اپنے مرزا عرفی گذشتہ بیں پچیس سال سے مسلسل نقصان پہنچا رہے ہیں دونوں ہاتھوں سے اپنے اعزاز و وقار کو لٹاتے رہتے ہیں' دوستوں کو بھی دشمن بنا لینا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے (ص ۲۷) وہ غالب شکنی کو ادبی خدمت سمجھتے رہے' جیسا کہ لکھتے ہیں "غالب کی شان میں میری مزاحیہ رباعیاں اور غالب شکن گل افشانیاں بظاہر ادبی معصیت سہی' مگر وہ دن دور نہیں جب یہی معصیت ایک ادبی خدمت ثابت ہو کر رہے گی یہ دعوی انہوں نے ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء کے ایک مکتوب میں کیا تھا' جس کو لکھے ہوئے ۴۰ سال ہو گئے اس درمیان میں غالب شکنی کیا ہوتی کہ غالب پرستی کا سیلاب اتنا بڑھا کہ مرزا یگانہ کا رسالہ غالب شکن اس سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتا نظر آتا ہے۔

غالب پر سرقہ کا الزام: انہوں نے اپنے اس رسالہ میں غالب پر چوریوں اور نقالیوں کے بھی الزامات رکھے ہیں' جس تلخ لب و لہجہ میں ان کو پیش کیا ہے' اس کے متعلق لکھتے ہیں' "کہ کیا واقعی وہ غالب کی شان میں گستاخی مقصود ہے' لیکن میں ایسا سڑی نہیں کہ مردوں پر طعن ماروں وہ اس دنیا میں موجود نہیں' میری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی' تو یہ طعنہ زنی کوئی مردانگی نہیں' محض دیوانگی ہو گی' ہاں غالب کے دل چے جو غالب کو ایک آسمانی دیوتا بنا کر پیش کیا کرتے ہیں' ان کی بہکی ہوئی ذہنیتوں کو قلم کے زور سے کچل ڈالنا ایک ادبی فرض ہے۔" (ص ۲۹) اس تحریر سے بظاہر تو یہی مراد ہے کہ وہ غالب کے مخالف نہ تھے' بلکہ غالب کے دل چے کو قلم کے زور سے کچلنا چاہتے تھے' جب قلم کا زور ہی دکھانا مقصود ہے تو اعتراضات کا جواب دینا بھی بیکار ہو گا' لیکن اس رسالہ کی اشاعت سے پہلے تو کچھ ادبی ہلچل پیدا ہوئی' پھر دب گئی لیکن پھر بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اس لیے ان کا ازالہ ہو جائے تو اچھا ہے۔

یگانہ نے غالب کے کل اٹھاون اشعار کو تختہ مشق بنانے کی کوشش کی ہے' نسخہ حمیدیہ میں ایک ہزار چار سو اٹھاسی اشعار ہیں' ان میں صرف اٹھاون اشعار کو چوری اور نقالی ثابت کر کے پورے دیوان پر پانی پھیرنا بوالعجبی ہے' پھر بھی اٹھاون اشعار میں چودہ اشعار پر زور قلم دکھانے میں یگانہ جو تعریف کر گئے ہیں' اس کا خلاصہ ان کی تلخ اور ناروا باتوں کو حذف کر کے اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

(۱) غالب:

پڑھتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز لیکن یہی کہ۔ رفت گیا اور بود تھا

عرفی:

عشق می گویم و می گریم زار طفل نادانم و اول سبق است

یگانہ: شعر اگر مسروقہ نہیں تو اوریجنل بھی نہیں ہے۔

(۲) غالب:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

صائب:

دریچ پردہ نیست بنا شد نوائے تو ۔۔۔ عالم پراست از تو و خالی ست جائے تو

یگانہ: مطلع نہایت پاکیزہ و روشن' معانی کے لحاظ سے بہت بلند' انداز بیان کے اعتبار سے بھی بے عیب ہے' مگر اسے اوریجنل کہنا نادانی ہوگی' پرانا فلسفہ ہے جسے غالب نے نہایت صفائی سے اردو میں بیان کر دیا ہے۔

(۳) غالب:

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ۔۔۔ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

نامعلوم:

لذت ز درد بسکہ زار من گرفت ۔۔۔ ناخن زدم بہ داغ اگر بہ شدن گرفت

یگانہ: صاف ظاہر ہے کہ غالب نے اس کی نقل اتاری ہے' مگر کامیابی کے ساتھ' ناخن بڑھ آنے کا استعارہ نہایت بلیغ ہے۔

(۴) غالب:

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے ۔۔۔ تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

حزیں:

چہ لذت بود از قاتل حزیں نیم بسمل را ۔۔۔ کہ در خوں می تپید و آفریں می گفت بر دستش

یگانہ: بڑا بانکا شعر ہے' مگر خیال حزیں کے ایک شعر سے پیدا ہوا ہے' جسے ترقی دے کر غالب نے نقل کو اصل سے بڑھا دیا ہے:

(۵) غالب:

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۔۔۔ ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

حزیں:

گراں جان تر ز شبنم نیست جان ناتوان من ۔۔۔ اگر می بود با من روے گرمی آفتابش را

یگانہ: دوسرا مصرع کتنا پیارا ہے' مگر پرتو خورشید کی جگہ پرتو خور اردو میں کتنا برا معلوم ہوتا ہے' شبنم و خورشید کا مضمون نہایت پامال ہے۔

(۶) غالب:

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو ۔۔۔ یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

قتی:

ہر کس کہ زخم کاری ما را نظارا کرد ۔۔۔ تا حشر دست و بازو اور دعا کند

یگانہ: شعر اگرچہ اوریجنل نہیں ہے' مگر اصل سے بڑھ گیا ہے۔

(۷) غالب:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خسرو:

اے گل چو آدمی ز زمیں گوچگو نہ اند　　آں روے ہا کہ در تہ گرد فنا شدند

یگانہ: خوب شعر ہے مگر اوریجنل نہیں ہے' امیر خسرو کے شعر میں بڑی قابلیت سے تصرف کیا ہیں۔

(۸) غالب:

ان کے دیکھے جو آ جاتی ہیں منہ پر رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

فسونی:

باوچوں می رسم آسودہ می شوم ازدار　　ندید حال مرا وقت بے قراری حیف

یگانہ: غالب کا یہ شعر نہایت مکمل ہے' فسونی نے جن مشاہدہ کو قلم بند کیا ہے' غالب نے اسی کو کمال شعریت کے مرتبہ پر پہنچا دیا۔

(۹) غالب:

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

ظہوری:

تو نظر بازئی ورنہ تغافل نگہ است　　تو زبان فہم نئی ورنہ خموشی سخن است

یگانہ: نہایت لطیف شعر ہے' مگر تغافل میں نگاہ کا پایا جانا' پرانا مضمون ہے'

(۱۰) غالب:

خوش ہوتے ہیں پر وصل پہ یوں مر نہیں جاتے　　آئی شب ہجراں کی تمنا مرے آگے

یگانہ:

نہایت تازہ شعر معلوم ہوتا ہے شب ہجر میں موت کی دعا مانگا کرتے تھے' قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ وہی دعا آگے آئی' شب وصل میں شادی مرگ ہوئی ہے' غالب کے بیشتر مایہ ناز اشعار میں سرقہ ثابت ہو چکا ہیں اس وجہ سے بدگمانی ہوئی ہے کہ یہ بھی کہیں پرایا مال نہ ہو'

(۱۱) غالب:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

عاقل خاں رازی:

نہ مرا کہ ورقیت از سر کوئے تو جدا　　اول میں حادثہ بہ آدم و حوا بگذشت

یگانہ: شعر اپنی حدوں میں پورا ہے زبان زد خاص و عام ہے مگر پرایا مال ہے۔

(۱۲) غالب:

غالب! زباں پر بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

نامعلوم! زیں نام چو تر کنم زباں را　　جاں بوسہ دہد سر زباں را!

یگانہ: خوب شعر ہے' مگر اوریجنل نہیں ہے کہنے والا پہلے کہہ گیا ہے۔

(۱۳) غالب:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　　ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو

جمال الدین اصفہانی:

آں را کہ توئی بارچہ بے یار کس است　　　واں را کہ توئی دوست چہ دشمن کام است

یگانہ: واللہ مرزا غالب کا یہ شعر اتنا قیامت خیز ہے کہ جس کا جواب نہیں۔

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

نفس مطلب صرف روح شعر ہے، وہ دونوں جگہ واحد ہے، غالب نے بھی وہی کہا ہے، مگر پہلے مصرع میں دوست کی فتنہ انگیزی کی طرف اشارہ کر کے شعر کو بہت ترقی دی ہیں۔

(۱۴) غالب:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا　　　جام تم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

یگانہ: شعر بجائے خود مکمل ہے، جام جم پر جام سفالین کی ترجیح نہایت لطیف ہے، خدا کرے یہ شعر غالب ہی کا ہو، کسی کی نقل نہ ہو۔

اوپر غالب اور فارسی شعرا کے اشعار غور سے پڑھے جائیں تو ان میں بعض تو بہت زیادہ متحد المعانی نہیں ہیں، جن سے سرقہ کا الزام عائد ہو اس کے باوجود وہ اگر پاکیزہ اور روشن ہیں، معانی کے لحاظ سے بہت بلند ہیں، انداز بیان کے اعتبار سے بے عیب ہیں، نہایت بلیغ ہیں، بانکے ہیں، پیارے ہیں، اصل سے بڑھے ہوئے ہیں، خوب ہیں، نہایت مکمل ہیں، نہایت لطیف ہیں، تازہ ہیں، قیامت خیز ہیں، تو یہ کسی سارق شاعر کا کارنامہ نہیں ہو سکتا ہے، یہ داد تو ایک قادر الکلام شاعر اپنی مہارت ہی کی بدولت حاصل کر سکتا ہے، جامی نے اپنی مشہور تصنیف بہارستان میں سلمان ساوجی کے ذکر میں لکھا ہے:

"سلمان ساوجی رحمتہ اللہ علیہ ایک فصیح شاعر اور بلیغ سخن گو ہیں عبارات کی سلاست اور استعارات کی دقت میں بے نظیر ہیں، ان کے قصائد استادوں کے جواب میں ہیں، ان میں سے بعض اصل سے خوب تر اور بعض برابر ہیں، ان کے یہاں مخصوص معانی بہت ہیں اور اپنے اشعار میں بہت سے معانی استادوں خصوصاً کمال اصفہانی سے ایراد کئے ہیں، لیکن وہ بظاہر خوب تر ہیں اور اسلوب میں مرغوب تر ہو گئے ہیں، اس لیے وہ طعن و ملامت کے قابل نہیں۔" (بہارستان ص ۸۲)

اسی کے بعد وہ متین اشعار لکھتے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

ہنر ہست این کہ کہن خرقہ پشمیں ز برش　　　بدر آرند ورد واطلس را کسوں پوشند

اسی شعر کے معنی کے لحاظ سے اگر غالب نے کسی خیال کو لے کر اس کو اپنے خوب تر اسلوب اور مرغوب تر طرز ادا سے ریشم واطلس کا خلعت پہنا دیا ہے، تو وہ طنز کے بجائے داد کے مستحق ہیں، غلام علی آزاد بلگرامی نے بھی (ماثر الکلام جلد دوم ص ۷۷) جامی کی بہارستان سے مذکورہ بالا عبارت نقل کی ہے، اور جامی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے حسب ذیل شعر لکھا ہے:

شاہد معنی کہ باشد جامہ اش کہن　　　نکتہ دانے گر حریر تازہ پوشاند خوش است

اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر کسی شاہد معنی کو اس پرانے جامہ کے بجائے کوئی نکتہ داں نیا حریر کا لباس پہنا دے تو یہ خوبی ہے،

آزاد بلگرامی نے یہ بھی لکھا ہے کہ علماء کا قول ہے کہ اگر کسی شاعر کا شعر پہلے کسی شاعر کے مضمون سے بلاغت میں بڑھا ہوا ہے "تو یہ محمود ہے اور اگر گھٹیا ہے تو یہ مذموم ہے اور اگر برابر ہے تو پہلے کی فضیلت اپنی جگہ پر درست ہونے کے باوجود دوسرے کا شعر مذمت کا مستحق نہیں' بشرطیکہ کہ اسرقہ نہ ہو' (ماثر الکرام ص ۷۷)

اب ۱۵۷ اشعار میں سے مذکورہ بالا اشعار نکال دیجئے جائیں تو پھر ان میں سے دس اشعار یگانہ نے جن کی مذمت جن الفاظ میں کی ہے' ان کو تو پھر مسروقہ کہنا غلط ہو گا' یہ اشعار ان کی رائے کے خلاصے کے ساتھ یہ ہیں:

(۱) غالب:

نثار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

صائب:

ذکر سبحہ شماران خدا مگذارد کہ صد سراست بہ یک حلقہ و کمند اسجا

یگانہ: غالب کا شعر نہایت ذلیل ہے' ٹھونس ٹھانس کے سوا کچھ نہیں' اردو میں بہ یک کف بردن صد دل خاص دیوزاد کی زبان ہے' جو شعر کا نتھا ہے وہ اتنا بھدا اور ایسا عجیب الخلقت ہے کہ توبہ ہی توبہ۔

(۲) غالب:

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

یبای:

ہم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من از ذوق وعدۂ تو فردا نمی رسم

یگانہ: غالب کا شعر لفرائی رسم کی شان بلاغت کو نہیں پہنچ سکتا' اس کے علاوہ یبای کے شعر میں ہم از وفادار کے فقرہ سے جو معنوی خوبیوں میں اضافہ ہو گیا ہو وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے آمادہ کیا ہے' اس مفہوم کو غالب کے شعر میں ہوا تک نہیں۔

(۳) غالب:

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہا کہ دل ہے غم عشق اگر نہ ہوتا غم روز گار ہوتا

عرفی:

غم نخستہ است خورونی امداز خوان عشق اے اہل روز گار غم روزگار چیست

یگانہ: عرفی کے شعر کی بلندی کو غالب نہ پہنچ سکے۔

(۴) غالب:

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

حزیں:

چہ شد از توبہ زدے کردہ ام اے سرو سہی پیش ابر کرم پیر مغاں ایں ہمہ نیست

یگانہ: غالب کا شعر کوئی شعر نہیں ہے' کلام موزوں ہے۔

(۵) غالب:

بدگمانی نے نہ چاہا اے سرگرم خرام رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

بیدل:

حیارہ اہم نقاب معنی نازش نمی خواہم کہ می ترسم عرق برجبہ بندو چشم غمازے

یگانہ: غالب کا شعر نہایت ناقص ہے، کاٹ کے پھینک دینے کے قابل۔

(۶) غالب:

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

نامعلوم:

یاد ایام جنوں بر سر من بار و سنگ کو دکاں را چو ز مکتب کسے آزاد کند

یگانہ: غالب کا شعر جتنا مشہور ہے، اتنا ہی مہمل ہے مہملیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے دوسرا کچھ کہتا ہے، کوئی ایک مرکز خیال قائم ہی نہیں رہتا۔

(۷) غالب:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

خیام:

گر میل تو باہے خرد نااہل است من نیز چناں اہل خرد مندنیم

یگانہ: چونکہ یہ مضمون عامتہ الورود ہے، اس لیے غالب کے اس شعر پر توارد کا حکم لگانا زیادہ صحیح ہے۔

(۸) غالب:

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

شیدا:

گفتن دعا برلف تو تحصیل حاصل است باخضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

یگانہ: غالب کا شعر تو گٹھا ہے، لیکن گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔

(۹) غالب:

جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

عرفی:

ز فروغ آفتابم نہ بود خبر کہ بے تو چو دو زلف تست یکساں شب در ورم از سیاہی

یگانہ: غالب کا یہ شعر بے معنی اور مہمل ہے۔

(۱۰) غالب:

بساط عجز میں تھا ایک دل ایک قطرۂ خوں وہ بھی سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

نعمت خاں عالی:

دریا کہ ماندہ است زدل قطرہ خونے ؛

آں قطرہ ہم از دست تو لبریز یکیدن

یگانہ: غالب کے شعر کی بندش ایسی پھسپھسی ہے کہ فرفر پڑھنا چاہو تو زبان الجھتی ہے' یہ شعر ناقص الفلقت' کاٹ کے پھینکنے کے قابل تھا۔

اوپر یہ دعویٰ ہے کہ غالب نے صائب' بیدل' عرفی' حزیں' خیام اور شیدا وغیرہ کے اشعار سے چوری کی ہے' جب غالب کے اشعار ان کے پرستاروں کے نزدیک تو نہیں' لیکن یگانہ کے خیال میں ذلیل بھدے' عجیب الفلقت' مہمل' گورکھ دھندا' پس پھینکے اور کاٹ کے پھینکنے کے قابل ہیں' تو ان کو نقالی کیسے کہی جا سکتی ہے' چوری تو جب ہوتی کہ مذکورہ بالا اساتذہ کے مقابلہ کے اشعار ہو جاتے۔

کیا سرقہ کا الزام صحیح ہے؟: غالب کے ان تمام اشعار پر سرقہ کا الزام رکھنا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ اگر ان کے معانی و مطالب پر غور کیا جائے تو ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور نظر آئے گا اس کے علاوہ یہ ڈھکی چھپی بات نہیں کہ غالب نے اپنی عمارت فن کے ارتقائی مدارج طے کرنے میں بیدل' حزیں' عرفی' نظیری' ظہوری اور میر کا رنگ اختیار کیا' گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختیار کی تھی شروع میں غالب نے چلنا اختیار کیا' لیکن پھر اس رنگ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

اس لیے بیدل کے رنگ میں غالب کے حواشا نکل گئے ہیں' ان کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان کے ابتدائی دور کی شاعری میں بیدل کے رنگ کے اشعار بھی ہیں حزیں کی تقلید میں ان کے فارسی اور اردو دونوں دواوین میں اشعار ملتے ہیں' مومن خاں کا تو خیال یہ تھا کہ ہم کسی طرح غالب کو علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے' پہلے ذکر آ چکا ہے کہ غالب نے اپنی فارسی شاعری کا تجزیہ کر کے یہ بتایا ہے کہ "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی' طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا' اس کو فنا کر دیا' ظہوری نے کلام کی گیرائی سے مرے بازو پر تعویز اور میری کمر پر زاد راہ باندھا اور نظیری نے اس خاص روش پر چلانا سکھایا۔

یہی باتیں وہ اپنے فارسی اشعار میں مختلف طریقوں سے کہتے رہے۔

وہ عرفی کا بار بار حوالہ دیتے ہیں:

چوں ناز سخن از مرحمت دہر بخویش کہ برو عرفی و غالب بعوض باز دہد
قافیہ غالب چونیست پرس زعرفی گر من فرہنگ بودے چہ نفتے

کہتے ہیں عرفی کی کیفیت غالب ہی کے یہاں ملے گی' دوسروں کے یہاں یہ بادۂ شیراز نہ ملے گا۔

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب جام دگراں بادۂ شیراز نہ دارد

ایک جگہ تو شاعرانہ تعلی میں عرفی کو اپنے برابر نہیں سمجھتا ہے۔

او جستہ جستہ غالب و مومن دستہ دستہ ام عرفی کسے است لیک نہ چوں من وریں چہ بحث

ظہوری کا ذکر بھی بہت کیا ہے' ایک جگہ تو کہتے ہیں کہ ظہوری ان کی رگ جاں بن کر رہے ہیں۔

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

اس کی جادو بیانی کے فیض کا بھی اظہار کیا ہے۔

بیاید ہم زمن انچہ ظہوری یا تم غالب

اگر جادو بیانیاں راز من وا پنچے باشد

اور یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ظہوری کا شیوہ نطق اور نفس ان ہی کی وجہ سے زندہ ہے۔

غالب از من شیوہ نطق ظہوری زندہ گشت از نوا جاں در تن ساز بیانش کردہ ام

غالب از اوراق ما نقش ظہوری دمید سرمہ حیرت کشیم دیدہ بدیدن دہیم

اور جن لوگوں نے ان پر طنز کیا تھا کہ وہ ظہوری کے زلہ ربا ہیں' ان کو یہ کہہ کر جواب دیا:

زلہ بردار ظہوری باش غالب بحث چیست در سخن درویشی بایدنہ دکاں داری

ان کو اس کا بھی دکھ رہا کہ ان کا کلام نظیری کے رنگ کا نہ ہو سکا۔

غالب ز تو آں بادہ کہ خود گفت نظیری در کاسہ ما بادۂ سرجوش نکردند

غالب نظیری کے رنگ کے لیے تڑپتے ہیں تو کہتے ہیں:

اے ساختہ غالب از نظیری باقطرہ ہاے گوہر آور'

اور جب نظیری کے رنگ میں کوئی غزل کہہ دیتے تو اس پر یہ کہہ کر ناز کرتے۔

بلہ تازہ گشتہ غالب روش نظیری از تو سزد ایں چنیں غزل را بہ سفینہ ناز کردی

اگر غالب کے فارسی دیوان کی چھان بین کی جائے تو اس میں ان اساتذہ کے قوافی اور ردیف میں غالب کی بہت سی متوازی نظمیں اور قصائد ملیں گے'

غالب کے بیانات اور اعترافات کے بعد ان پر یہ کہاں الزام آتا ہے کہ وہ اساتذۂ فن کے اشعار کے چور تھے' وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ ان سے استفادہ کر کے ان کے رنگ میں اشعار کہتے رہے' اور شاعرانہ بے راہ روی' آوارگی اور مطلق العنانی کے بجائے ان ہی کی بدولت گیرائی اور خاص روشن پیدا کی' لیکن مرزا یگانہ غالب کے اس اعتراف کو یہ رنگ دیتے ہیں کہ وہ اپنی تلون مزاجی' شاعرانہ بوالہوسی اور سرگشتگی میں کبھی مرزا جلال' کے مقلد رہے' کبھی شوکت بخارائی کے کبھی عرفی کے نقالی کرتے رہے' کبھی نظیری کی اور کبھی بیدل کا پلہ چاٹتے اور کبھی صائب کا' جس کو یگانہ غالب کی تلون مزاجی' شاعرانہ بوالہوسی' حیرانی اور سرگشتگی پر محمول کرتے ہیں' وہ دراصل ایک بے قرار ذہن' ایک مضطرب شاعرانہ عبقریت کی حیرانی اور سرگشتگی تھی' جن کی بدولت انہوں نے یگانہ سے نہ سہی' لیکن اوروں سے یہ داد حاصل کر لی کہ انہوں نے اپنی طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ اور رنگینی معنی سے صفحہ کو گلرنگ بنا دیا' انہوں نے اپنے ابتدائی دور میں نہ صرف بیدل' حزیں' نظیری' ظہوری بلکہ طالب آملی' صائب' شوکت بخارائی' اسیر' غنی' ناصر علی' اور ناسخ کے اثرات قبول کیے' بلکہ میر' سودا اور درد کی زمینوں پر بھی غزلیں کہیں' یہ ان کی نقالی یا چوری سمجھی جائے' لیکن اساتذہ کے رنگ میں رنگنے کے بعد انہوں نے اپنا جو انفرادی رنگ پیدا کیا' وہ اردو شاعری کے لیے بیش قیمت سرمایہ بن گیا' خود یگانہ کو اعتراف ہے کہ غالب کے آخر عمر کا کلام جو میر کی تقلید اور اپنے واردات قلبی کے تحت کہا گیا ہے' وہ نہ صرف ان کی شاعری کی جان ہے' بلکہ اردو لٹریچر کا سرمایہ ناز ہے (ص ۲۱) لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ان کے آخر عمر کا کلام سراسر میر کے رنگ کا ہے' میر کے رنگ میں انہوں نے کچھ دنوں تک کچھ اشعار ضرور کہے لیکن اس کے بعد ان کا جو امتیازی رنگ قائم ہوا' اس کے ترنگ میں انہوں نے ایسے اشعار کہے جن میں سے بعض اشعار کو یگانہ بھی پاکیزہ' روشن' بلند' بے عیب' بلیغ' بانکے پیارے' لطیف تازہ مکمل اور قیامت خیز کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

غالب کے فارسی شعراء کے اتباع اور تقلید کا دور ختم ہوا تو پھر ان کا جو استادانہ رنگ پیدا ہوا' اس کے متعلق وہ کہتے ہیں:

نظم و نثر شورش انگیزی کہ ی باید بخواہ — اے کہ می پرسی کہ غالب در سخن یکتاست ہست

اور یہی وہ اپنی اردو شاعری کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زندگی میں بھی ان پر سرقہ کا الزام رکھا گیا' ایک قطعہ میں پہلے تو اپنے حاسدوں کو مخاطب کر کے یہ کہتے ہیں:

منکران شعر من ہاں تانگوئی حاسدند — کایں قیاس از بہرشاں سامان نارے بودہ است
رشک از کالا شناسی خیز دوآں مایہ ایست — کاش باشد رشک کاں راہم جواز ے بودہ است

اور پھر یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری ہزار معنوں پر مشتمل ہے' جو اہل ذوق کے نزدیک شہد سے بھی بہتر ہے' اگر کہیں توارد ہو گیا ہے تو اس سے ان کی غزل کی آرائش ختم نہیں ہو سکتی ہے' دوسروں کے لیے تو کسی اور شاعر کے خیال کی بندی تک پہنچنا فخر کی بات ہو گی' لیکن ان کے لیے یہ ننگ ہے اور پھر چہ کر یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اگر ان کے شعر میں توارد پیدا ہو گیا ہو تو اس کو چوری نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے نہانخانہ ازل میں جو چیز پوشیدہ تھی' اس کو دوسروں نے خود چرا لیا ہے۔

ہراز معنی سرجوش خاص نطق من است — کز اہل ذوق دل و کوئی از عسل بردامت
زرفتگان بیکے گر توار دوم رو داد — مداں کہ خوبی آرائش غزل بروست
مرا ست ننگ و لے فخر اوست کاں بہ سخن — بسعی فکر رسا جا بداں محل بروست
مبرگماں توارد یقیں شناس کہ دزد — متاع من ز نہانخانہ ازل بردست

ان کے ایک اور قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں سرقہ کرنا عام تھا بلکہ خود ان کے اشعار کے خیالات کی چوری ہوتی' کہتے ہیں کہ آج کل شاعر کی زبان پر گذشتہ اور موجودہ دور کے شاعروں کے خیالات ہوتے ہیں اور ان پر اس طرح ناز کرتے ہیں کہ جیسے یہ تمام ان کے اصلی خیالات ہیں اور چونکہ وہ ان خیالات کو خوبی سے ادا کر نہیں پاتے' اس لیے وہ اندرونی طور پر خوف زدہ رہتے ہیں اور میں ان کی چوری سے واقف ہو جاتا ہوں' گو دوسرے ان کی مدح خوانی کرتے ہیں' غالب پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ شاعری کوئی چک یا تمسک تو نہیں جس پر کسی خاص آدمی کا دستخط یا مہر یا نام ہو' یہ ایک نوٹ ہے کہ جس کے ہاتھ میں آ جائے اسی کی ملکیت ہے۔

غالب دریں زمانہ بہر کس کہ وارسی — مضمون غیر و لفظ خویش بہ زبان اوست
زیں مایہ از کجا بہ نالد بخویشتن — برگنج شایگاں کہ بود رائگاں اوست
کس راز دست برو خیالش نجات نیست — گر پیش از گذشتہ و گرور زمان اوست
مضمون ہرکرا خوش اوای کند بناز — گوئی بہ بزم اہل سخن ترجمان اوست
اما بہ کند حسن ادا نا رسیدہ است — ی لرزد واز نہب دلم راز دان اوست
جز من کسے بدزد سخن دانمی رسد — گو خوش بخواں کہ انجمنے طرح خوان اوست
آرے نہ چک بود نہ تمسک زہر کہ ہست — نے دستخط و نہ مہر نا نام و نشان اوست
مضمون شعر نوٹ بووتی زمانہ — یعنی بدست ہر کہ ہستا و آن اوست

اس قطعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار کی بھی چوری جاری تھی'

اب ذرا ان اشعار کے تجزیہ کی بھی ضرورت ہے، جن پر سرقہ کا الزام رکھا گیا ہے، تمام اشعار کا تجزیہ تو نہ ہو سکے گا، لیکن کچھ اشعار کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ سرقہ کے الزام کی نوعیت کیا ہے۔

غالب:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

عرفی:

نیخان ناز بیں کہ بجگر گوشہ خلیل آید بزیر تیغ و شہیدش نمی کنند

عرفی کے شعر کا مطلب یگانہ نے یہ بتایا ہے کہ اللہ رے غرور ناز کہ فدیہ عشق تلوار کے نیچے آکر بھی شہادت سے محروم ہو جاتا ہے، طباطبائی نے غالب کے شعر کا مطلب یہ لکھا ہے کہ "اپنی رسوائی اور مورد تعزیر ہونے کا اظہار ہے کہ لوگ اسے تماشا سمجھے ہوئے ہیں" اگر یہ مطلب تسلیم کر لیا جائے تو پھر دونوں شعروں کے معنی میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے، اور اگر غالب کے شعر سے معشوق کا استغنا مراد ہے، تو پھر اس کے یہ معنی بھی لئے جاسکتے ہیں کہ معشوق نے مار مار کر غالب کے پرزے نہیں اڑائے اس لیے اس کے مارے جانے کا تماشا نہ ہوا" آسی نے غالب کے اس شعر کی شرح میں مذکورۂ بالا فارسی شعر کا حوالہ ضرور دیا ہے، لیکن وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کہنہ مشق شاعر غالب نے ایک معمولی پامال مضمون کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ نہایت بلند خیال معلوم ہوتا ہے" اگر شعر میں یہ مضمون اس صورت میں لایا جاتا کہ غالب تیرے قتل کا وعدہ کیا گیا تھا اور تو دہاں گیا، مگر قاتل نے قتل نہیں کیا تو شعر جیسا کچھ ہوتا بظاہر ہے، غرض کہ ایک رکیک خیال کو چست بندش الوکھا خیال بنا کر دکھا دیتی ہے" ایک فارسی شعر اسی خیال سے لبریز ہے، مگر فرق یہ ہے کہ جس صورت سے معشوق کی بے اعتنائی کو ایک پیش پا افتادہ مضمون سے شاعر یعنی غالب نے حسن بندش کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ایک تصویر ہے جس کے دیکھنے سے آنکھیں سیر نہیں ہوتی" (ص ۵۵)

غالب:

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اس کو اسد جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

شاگرد معنی:

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

یگانہ لکھتے ہیں کہ غالب نے شیخ معنی کے ایک شاگرد کے مشہور و معروف شعر کی نقل کی ہے، طباطبائی نے غالب کے شعر کی شرح میں صرف اتنا لکھا تھا۔

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں کوئی معشوق ہو اس پردۂ زنگاری میں

یگانہ پر بھی تو سرقہ کا الزام آتا ہے کہ طباطبائی کی شرح کو اپنی تحقیق میں داخل کر لیا،

پھر کیا یہ سرقہ اس لیے ہے کہ شعر میں فلک اور معشوق کی ستم گاری کا اشتراک دکھایا گیا ہے، یہ تو ہر شاعر کے یہاں پایا جائے گا، آسی نے غالب کے مذکورۂ بالا شعر کی شرح کرتے وقت یہ بھی لکھا ہے کہ غالب نے اسی مضمون کو اس طرح بھی ادا کیا ہے۔

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

یہ تو غالب کی قادر الکلامی کی دلیل ہے کہ غزل کے ایک مضمون کو وہ نوع بنوع ادا کر سکتے ہیں۔

غالب:

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

نامعلوم:

یاد ایام جنوں بر سرِ من بارد سنگ کودکاں را چو ز مکتب کسے آزاد کند

یگانہ فارسی شعر کے یہ معنی بتاتے ہیں کہ لڑکے جب مکتب سے چھٹی پاتے ہیں، تو انہیں دیکھ کر اپنے ایام جنوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس یاد سے گویا اس شخص کے سر پر پتھر برسنے لگتے ہیں" یگانہ اس شعر کی تو تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ "کہنے والا کس خوبی سے کہہ گیا" مگر غالب کے شعر کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شعر جتنا مشہور ہے اتنا ہی مہمل ہے، مہلیت کا ایک ثبوت تو یہ ہے کہ ایک شارح کچھ کہتا ہے اور دوسرا کچھ کہتا ہے، کوئی ایک مرکز خیال قائم ہی نہیں ہوتا "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" اگر غالب کا شعر سرقہ ہوتا تو نقل اصل کے برابر ہوتی مہمل نہ ہو جاتی اور پھر دونوں شعر کا جو مطلب ہے، وہ سرقہ نہیں کہا جا سکتا، جنون اور سنگ تو عامتہ الورود ہے اس کو سرقہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

غالب:

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

عبداللہ پیامی:

بیم از وفا مدار بدہ وعدہ کہ من از ذوق وعدۂ تو فردا نمی رسم

یگانہ نے فارسی شعر کے معنی یہ بتائے ہیں کہ شاعر کہتا ہے کہ تو مجھ سے وعدہ کر لے اور اس امر کا اندیشہ نہ کر کہ وفا بھی کرنا پڑے گی، کیونکہ وعدہ کی خوشی مجھے آج سے کل تک پہنچنے ہی نہ دے گی، آج ہی خوشی کے مارے مر جاؤں گا" اس شعر کو دیکھ کر غالب کی چوری یا نقالی کی حقیقت کھلتی ہے، غالب پرست ہزار سر پٹکیں ایسی چوری کی لیپا پوتی نہیں ہو سکتی، غالب کا شعر بفردا نمی رسم کی شان بلاغت کو نہیں پہنچ سکتا، اس کے علاوہ پیامی کے شعر میں بیم از وفا مدار کے فقرہ سے جو معنوی خوبیوں میں اضافہ ہو گیا ہے، وعدہ لینے کے شوق میں معشوق کو جس طرح ابھارا ہے، آمادہ کیا ہے، اس کے مفہوم کا غالب کے شعر میں پتہ تک نہیں، یگانہ کے اس اعتراض کا جواب نظامی بدایونی نے غالب کے شعر کی شرح کرتے ہوئے یہ لکھ کر دیا ہے کہ فارسی شاعر نے اپنے شعر میں صرف یہ بیان کیا ہے کہ وعدۂ وصل کرنے میں اس خیال سے پس و پیش نہ کر کہ اس کا ایفا کرنا پڑے گا، کیونکہ میں تیرے وعدہ کی خوشی میں کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا اور نہ میں ہوؤں گا نہ تجھے وعدہ ایفا کرنے کی نوبت آئے گی، ایک غیر انصاف پسند نکتہ چیں نے غالب کے اس شعر کے فارسی شعر کا ترجمہ لکھا ہے، لیکن اس نے غور نہیں کیا کہ غالب کے شعر میں جو چو چلا پن پایا جاتا ہے اور اس کے سننے سے سامع کے دل میں جو اثر ہوتا ہے، فارسی شعر میں اس کا پتہ نہیں، وعدے کو جھوٹ جان کر اس پر زندہ رہنا ایک نئی بات ہے۔

غالب:

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

ظہیر فاریابی:

صد مہاے عشق را کے بوالہوس دارد قبول کے شناسد طفل قدر سیلی استاد را

یگانہ کہتے ہیں کہ پامال مضمون ہے، بہتیروں نے کہا ہے، اس میں ظہیر فاریابی بھی ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ ظہیر فاریابی نے بھی کہیں سے سرقہ کیا ہے، آسی لکھنؤی نے بھی غالب کے مذکورۂ بالا شعر کی شرح میں ظہیر فاریابی کا شعر نقل کیا ہے، معلوم نہیں

آسی اور یگانہ دونوں میں کس نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے' مولانا نے ان دونوں اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالب مصائب روزگار یا حوادث ارضی و سماوی کی تمثیل اہل عقل کے لیے سیلی استاد (استاد کا طمانچہ) سے کرتا ہے اور اس طرح استقلال اور بلند ہمتی کی روح پھونکتا ہے اور ظہیر فاریابی عشق و ہوس کی امتیازی خصوصیت کو سیلی استاد سے مثال دیتے ہیں بیخود موہانی نے بھی ان دونوں اشعار کا موازنہ اس طرح کیا ہے' میرے نزدیک غالب کا مضمون نہایت وسیع ہے' علاوہ اس کے اس نے طوفان حوادث کو مکتب قرار دیا ہے' مکتب کا ہنگامہ خواہ لڑکوں کے پڑھنے سے پیدا ہو یا سیلی استاد کا نتیجہ ہو' اس سے طوفان کے جوش و خروش کا عالم نظروں میں پھرنے لگتا ہے' دوسری لطافت یہ ہے کہ (لطمہ) موج کے تھپیڑے اور استاد کے طمانچے میں کیسی زبردست مشابہت ہے' یہ لفظ اپنے معنوں کی تصویر ہے' پھر شعر کا ایک ہی تلازمہ بحر میں ختم ہو جانا بھی اثر شعر کا کفیل ہے' غالب کہتا ہے کہ اہل بینش کے لیے کوئی حادثہ ہو سبق آموز ہے..... ظہیر نے بوالہوس (ہوس پرست) کو باعتبار نادانی طفل کہا ہے اور صدمہ عشق کو سیلی استاد سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صدمہ کی لفظ قریب قریب اسی شان کی رکھدی' جیسی غالب کے شعر میں لطمہ موج ہے' صدمہ کے معنی نعمت میں ٹکرانے کے ہیں' یہ لفظ بھی بیان واقعہ کو واقعہ بنا رہا ہے' جب یوں ہے' تو کوئی شعر ندرت سے خالی نہیں (گنجینہ تحقیق از بیخود موہانی ص ۱۷۳۔۱۷۲)

غالب:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں   شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

زخضر عمر فزون است عشق بازاں را   اگر ز عمر شمارند روز ہجراں را

عمر من، گیرم کہ باشد عمر تار وز حساب   زیستن بے تو بناشد در حساب زندگی

یگانہ نے فارسی شعر نقل تو کر دیا' لیکن شاعر کا نام بتا نہیں سکے ہیں' شاید کہیں سے لے لیا ہو' بیخود موہانی نے پہلے فارسی شعر کو سپہری کا بتایا ہے' آسی نے خسرو کا ایک ہم معنی شعر اور لکھا ہے۔

زہے، عمر دراز عاشقاں گر   شب ہجراں حساب می گیرند

غالب نے خسرو کے اس شعر سے استفادہ کیا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں' کیونکہ وہ ہندوستان نژاد فارسی شعرا میں خسرو ہی کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے'.

غالب:

مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے   لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

جامی:

آسمان جام نگوں واں کز مے عشرت تہی است   جستن مے از تہی ساغر نشان ابلہی است

یگانہ لکھتے ہیں کہ وہی آسمان' وہی جام واژگوں' وہی مے عشرت کی ہوس جو یہاں ہے' سو وہاں' چوری نہیں تو کیا ہے' آسی نے بھی غالب کے اس شعر کی شرح میں جامی کا شعر نقل کیا ہے' بیخود موہانی کا بیان ہے کہ دونوں شعر کا مبحث تو ایک ضرور ہے' لیکن مضمون ایک نہیں جامی کا رنگ واعظانہ ہے' غالب کا رنگ شاعرانہ ہے' دونوں میں واقعہ اور بیان کا فرق ہے' ایک پیکر بے جان ہے اور ایک پیکر ذی روح' جو برجستگی غالب کے شعر میں ہے جامی کے یہاں نہیں'

(گنجینہ تحقیق ص ۱۸۰۔۱۸۹)

غالب:

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق   لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

صائب:

سر مینائے مے و ہمت اور انا زم   کہ گرفتہ است گناہ و ہمہ برگردن نہیں

دونوں شعروں میں خلق خدا کا خون گردن مینا پر ضرور رکھا گیا ہے' لیکن غالب دوسرے مصرع سے شعر میں جو سالکیں بلکہ تیغ تغزل پیدا ہو گیا ہے' وہی اصل جان ہے جو صائب کے یہاں نہیں۔

غالب:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں   بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یگانہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر اپنی حدوں میں پورا ہے' زبان زد خاص و عام ہے مگر پرایا مال ہے' عاقل خاں رازی کہتا ہے:

نہ مرا کرد رقیب از سر کوئے تو جدا   اول ایں حادثہ بر آدم و حوا بگذشت

لیکن نظامی بدایونی غالب کے شعر کی شرح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ عاقل خاں رازی نے بھی فارسی میں اس مضمون کو نبا ہا ہے' لیکن غالب کے یہاں بہت بے آبرو ہو کر کے ٹکڑے نے جو لطف پیدا کر دیا ہے' وہ فارسی شعر میں کہاں؟ اس مصرع کو بہت کے لفظ پر پورا زور دے کر پڑھنے سے شعر کے معنی حاصل ہوتے ہیں۔

غالب:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

یگانہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر مبتدیوں کا سا ہے' مضمون بھی نیا نہیں دیکھئے خواجہ حافظ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

آخر ہو دل نرم تو کہ از بہر ثواب   کشتہ غمزۂ خود رالبہ بہ نماز آمدہ

لیکن ان دونوں اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب اردو غزل (ص ۳۸۹) میں رقم طراز ہیں کہ غالب نے حافظ کے شعر میں تھوڑا سا تصرف ضرور کیا ہے' لیکن بلاشبہ غالب کا شعر حافظ کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ زود پیشیماں کی ترکیب میں ایک جہان معنی پوشیدہ ہے' اور اس لفظ میں طنز کس غضب کا ہے کہ جسے بیان نہیں کیا جا سکتا' صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

غالب:

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز   دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

شیدا:

گفتن دعا بزلف تو تحصیل حاصل است   یاخضر کس نگفت کہ عمرت دراز باد

یگانہ لکھتے ہیں کہ ملا شیدا کے شعر سے مضمون اڑا کر کچھ کہنا چاہا تھا' مگر شعر تو گتھا نہیں' گورکھ دھندا بن کر رہ گیا' لیکن غالب کے اس شعر کے متعلق حالی کہتے ہیں' کہ ایک نئی شوخی ہے' جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی' کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا' لاچار یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو' یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو' آسی نے فارسی کا مذکورۂ بالا شعر نعمت خاں عالی کا بتایا ہے' یگانہ اس کو شیدا کا بتاتے ہیں' میرے پیش نظر اس وقت نعمت

خاں عالی اور شیدا دونوں میں سے کسی کا دیوان نہیں جو یہ بتاتا کہ یہ کس کا شعر ہے' لیکن اگر شیدا کا شعر ہے تو شیدا پر خود ہی سرقہ کا الزام رکھا گیا تھا' جس کو اس راقم نے اپنی تصنیف بزم تیموریہ میں جو ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی تفصیل سے لکھا ہے' ناظرین کی دلچسپی کے لیے اس کو ہم یہاں بھی دہراتے ہیں ۱۶۲۴ھ میں جہانگیر اجمیر گیا' تو اس کے شاہی جلو میں شعراء بھی تھے' ایک روز شیخ فیروز کی قیام گاہ پر تمام اصحاب سخن مثلاً" طالب آملی' ملا عطائی جونپوری' انور لاہوی وغیرہ جمع ہوئے' شیخ فیروز کو مقبولیت اس لیے حاصل تھی کہ اس کو اساتذہ کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے' یہ مجلس جاری تھی کہ شیدا بھی آ پہنچا' تمام شعراء نے گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا اور نمایاں جگہ پر بٹھا کر اس سے تازہ کلام سنانے کی فرمائش کی شیدا نے یہ شعر پڑھا۔

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے حسن را پروردہ گاری عشق را پیغمبرے

شیخ فیروز نے کہا یہ تو رودکی کے شعر سے سرقہ ہے۔

عشق را پیمبر و لیکن حسن را آفرید گار توئی

شیدا کچھ برہم ہوا' لیکن اس نے ایک دوسرا شعر سنایا'

ز بسکہ کرد غمت تند بر جگر ناخن چو پشت ماهم از پاپے تا بسر ناخن

شیخ فیروز نے اعتراض کیا کہ یہ غیاثائی حلوانی کا چربہ ہے۔

از بسکہ سینہ کندم و ناخن درو نشست چو پشت ماہی است سراپاے سینہ ام

شیدا اور بھی زیادہ چیں بجبیں ہوا' مگر ایک اور شعر پڑھ کر داد چاہی۔

گر بصحرا موفشانی دشت پر سنبل شود دربدر یارد بجوی خار ماہی گل شود

مگر شیخ فیروز بولے کہ یہ تو ملا کاتبی کے شعر سے توارد ہے۔

گر بدیا انداز عکس جمال او فروغ خار ماہی آور دور قعر دریا بار گل

شیدا نے چڑھ کر کہا اگر یہی ستم ظریفی ہے تو اس کے مقابلہ کا شعر سناؤ۔

ذات تو بود صحیفہ کون کہ کرد ازروے ادب مہر خدا بر پشت نشست

شیخ فیروز نے فوراً" ہاتفی کا شعر پیش کیا:

نبت را توی آں نامہ درمشت کہ از تعظیمش آید مہر بہ پشت

حاضرین نے قہقہہ لگایا شیدا نے زچ ہو کر بدکلامی شروع کر دی' بعض اصحاب مجلس پھر مصر ہوئے' تو اس نے یہ شعر پڑھا۔

زلف اور ارشتہ جاں گفتم و گشتم خجل
زانکہ ایں معنی چوز نقش پیش پا افتادہ است

شیخ فیروز نے کہا کہ مہمان کی دل آزاری مراد نہیں لیکن اس مضمون کا شعر پہلے بھی کہا جا چکا ہیں۔

کس نیاید معرعہ پیچیدۂ زلف بجت گرچہ اس مضمون ترا درپیش پا افتادہ است

اس طرح شیدا نے کچھ اور شعر سنائے تو شیخ فیروز اس کے ہر شعر کا ماخذ بتاتا گیا' بالاخر اس پر مہر سکوت لگ گئی' اور باوجود اصرار کے اس نے کوئی اور شعر پڑھنے کی ہمت نہ کی اور پھر کبھی ایسی مجلس میں شریک نہ ہوا جس میں شیخ فیروز بھی ہوتا' (یہ تفصیل مخزن الغرائب قلمی نسخہ دارالمصنفین ورق ۲۱۶-۲۱۵ سے لی گئی تھی)

اس واقعہ سے یہ ظاہر ہو گا کہ ایک اونچے درجہ کا غزل گو قصداً" سرقہ نہیں کرتا' لیکن بعض اوقات اس کے اشعار میں غیر شعوری طور پر یا تو کچھ خاص خاص الفاظ یا تراکیب یا مضامین ایسے آ جاتے ہیں جن سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرقہ ہے' شیدا کو خود خبر نہ تھی کہ اس کے اشعار کے متحد المعنی اشعار پہلے سے موجود تھے اور وہ اپنی استادی کے زعم میں اپنے اشعار سناتا لیکن متوازی اشعار سنا کر اس کو زچ کر دیا جاتا' ماثر الکرام کے مصنف نے صاحب تاریخ صبح صادق کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شیدا نے ایک لاکھ اشعار کہے تھے' ظاہر ہے کہ ایک لاکھ اشعار کہنے والا سارق نہیں ہو سکتا' اسی طرح کسی غزل گو کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو اس پر ویسے ہی سرقہ کا الزام آ سکتا ہے' جیسا کہ یگانہ نے غالب پر رکھا ہے حالانکہ غالب کو خود اعتراف رہا کہ وہ اساتذہ فن سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

یگانہ لکھتے ہیں کہ کوئی چوری کرتا ہے تو حرف بحرف نہیں کرتا' کچھ نہ کچھ الٹ پھیر کر کے پرائے مال کو اپنا بنا لینا چاہتا ہے (غالب شکن ص ۳۷) لیکن غزل گوئی کے الفاظ اور موضوعات کچھ ایسے محدود ہیں کہ ان ہی کے الٹ پھیر میں غزل گو اپنے کمالات دکھاتا رہتا ہے' غزل گوئی کے خاص خاص الفاظ اور موضوعات حسن و عشق' ہجر و وصل' ناز و ادا' مہر و وفا' کرم و ستم' چشم و نرگس' گل و بلبل شمع و پروانہ' لیلیٰ و مجنوں' شیریں و فرہاد' وامق و عذرا' پیکان و تیر' خنجر و شمشیر' قتل و خون' شیشہ و ساغر مینا و سبو' پیمانہ و میخانہ' بت و خدا' زاہد و واعظ' محتسب و ناصح جنون و گریبان' بہار و خزاں' خس و خار' آفتاب و ذرہ' دریا و قطرہ' دل و جگر' حسرت و ناکامی' نزع و مرگ' قبر و حشر' قفس و چمن' نظارۂ جمال' مژدۂ وصال' وغیرہ ہیں ان ہی الفاظ کے سہارے غزلیں کہی جاتی ہیں اور پھر اس سلسلہ میں عاشقوں کی شیفتگی' فریفتگی' بیخودی' مدہوشی' شوق و حسرت اور رنج و غم کی منفعلہ کیفیتیں اتنی بار دہرائی جا چکی ہیں کہ غزل گویوں کے یہاں وہی ساری باتیں کسی نہ کسی شکل میں پائی جائیں گی۔ پھر غزل گوئی کی خوبی بھی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں وہی تمام جذبات و احساسات پیش کئے جائیں جو عامتہ الورود ہوں' یعنی و محبت کی راہ میں عاشق کو جو پیش آتے ہوں اور جب یہ خوبی تسلیم کر لی جائے' تو شعرا کے یہاں جذبات و احساسات کی یکسانیت کا پایا جانا تعجب خیز ہے' اور نہ سرقہ ہے اور اگر یہ سرقہ ہے تو بظاہر متحد المضامین اور قریب المعانی اشعار کا انبار لگا کر بہت سے اساتذہ کو سارق کہا جا سکتا ہے۔

لیکن غزل کا یہ اعجاز ہے کہ اس کی چوری اور فرسودگی میں بھی ہر زمانہ میں تازگی اور بوقلمونی باقی رہتی ہے' اسی لیے غزل پڑھتے یا سنتے وقت یہ کم دیکھا جاتا ہے کہ غزل گو کیا کہہ رہا ہے' بلکہ زیادہ تر اس پر نظر رہتی ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' کس طرح کہہ رہا ہے' اور اسی کیس طرح کہتے ہیں' اس کی تعریف باقی رہتی ہے' اسی لیے دو شاعروں میں الفاظ یا کیفیات کے اشتراک کا ہو جانا کوئی سرقہ نہیں۔

اس کے علاوہ اردو غزل گوئی شروع ہوئی تو تمام غزل گو شعراء نے ایرانی شعراء کے طرز میں غزلیں کہہ کر اردو غزل گوئی میں نکھار' بانکپن' رسیلا پن اور البیلا پن پیدا کرنے کی کوشش کی اور میر سے لیکر غالب تک شاید ہی کوئی غزل گو شاعر گزرا ہے' جس کے یہاں فارسی شعراء کے کچھ نہ کچھ مضامین نہ آئے ہوں' دار المصنفین سے مولانا عبدالسلام ندوی کی جو شعر الہند شائع ہوئی ہے' اس کی جلد اول میں ایسے بہت سے اشعار جمع کر دیے گئے ہیں (ص ۴۶-۴۲)

لیکن اردو کے ان اساتذہ پر سرقہ کا الزام نہیں آتا ہے' وہ تو اردو غزل کو فارسی قالب میں ڈھالنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں' اسی لیے ان کے یہاں فارسی غزلوں کے خیالات' تراکیب اور محاورات کی بہتات ملے گی۔

مرزا یگانہ کو بھی اعتراف ہے کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا۔ کیونکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے'

متاخرین ہمیشہ متقدمین سے استفادہ کرتے ہیں' (غالب شکن ص ۳۵) لیکن مرزا یگانہ غالب کو اس حق سے محروم اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا کلام الہامی اور اوریجنل بتایا جاتا ہے' ان کا سارا غصہ اگر کلام غالب کو الہامی کہنے والوں پر اترتا تو صحیح تھا' لیکن غالب کو چور' "گونگا' ٹھونس ٹھانس کرنے والا' بے سرا جھوٹا' دہقانی' بے ڈھنگا وغیرہ کہنا کہاں تک ادبی فرض اور خدمت انجام دینے کے مترادف ہے اور پھر حسب ذیل عبارت لکھنا کہاں تک ادبی تہذیب میں داخل ہے۔

"اک الو کا پٹھا مولوی ٹھینگا موہانی غالب کے اس دہقانی شعر پر بھی جو نہایت شرمناک چوری ہے' سردھنتا تھا'

آدمیاں گم شدند"

اور پھر سرقہ کا جو معیار یگانہ نے قائم کیا ہے اس لحاظ سے ان کا یہ کہنا کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا' خود سرقہ ہے' انہوں نے غلام علی آزاد بلگرامی اس فقرہ کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔

"اگر بنظر تفتیش ملاحظہ کند کم شاعرے راازتوارد و مضامین میں خالی یابد"

(ماثر الکرام جلد دوم ص ۲۹)

شاید مرزا یگانہ کی نظر اساتذہ کے متحد المضامین اشعار پر نہیں پڑی' ورنہ وہ غالب شکن کی طرح حافظ شکن' صائب شکن' کلیم شکن اور بیدل شکن وغیرہ بھی لکھ ڈالتے ہیں اور ان میں ہر ایک کو الو' بدھو' مٹھو' چچا چور' ڈ ھیڈس' "گونگا شاعر' ٹھونس ٹھانس کرنے والا" اور بے سرا ثابت کر کے مزید ادبی خدمت انجام دے دیتے۔

یگانہ کے "غالب شکن" پر اظہار خیال کرنے میں میری یہ تحریر ضرورت سے زیادہ طویل ہو گئی ہے' جس کے لیے ناظرین سے معذرت خواہ ہوں' خیال تھا کہ یگانہ کے ہفوات ہفوات ہی سمجھے جائیں گے' لیکن ان کے خیال کی تائید اس مضمون میں بھی کی گئی' جو ارگس کے فرضی نام سے ۱۹۲۸ء کے رسالہ نگار میں کئی قسطوں میں شائع ہوا' پھر اس قسم کی آواز بازگشت ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر عندلیب شادانی کے ایک مضمون میں بھی سنائی دی جس کو انہوں نے اپنی کتاب "تحقیقات کی روشنی" میں بھی منسلک کیا' پھر نیاز فتح پوری نے ۱۹۲۲ء میں نگار کا جو غالب نمبر شائع کیا' اس میں بھی یہ آواز دھیمے انداز میں سننے میں آئی' اسی طرح دہلی کے رسالہ تحریک کے غالب نمبر (مارچ ۱۹۶۹ء) کے ایک مضمون "غالب مجتہد یا مقلد" میں یگانہ کی تصنیف غالب شکن کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی لیے یہ خیال ہوا کہ غالب شکنی کے ان حملوں کا دفاع اچھی طرح کیا جائے' اسی لیے اس عنوان کے تحت میری تحریر طویل ہو گئی۔

(ماخوز = غالب مدح و قدح کی روشنی میں)

قطعات

تنویر پھول

اس کے دم سے تھی قائم بہار غزل!
میر کا جانشین' غالب خوشنوا!
شاعر لغز گو' شہر یار سخن!
جو غزل گو ہیں ان کا تھا وہ پیشوا!

غزل گوئی میں یکتائے زماں تھے!
سخنور کوئی تھا ان کا نہ ثانی!
ہوئی معلوم جنت کی حقیقت!
ملی غالب کو جب خلد آشیانی

○

غالب۔ امام غزل

نور احمد غازی

ہے نرالا حضرت غالب کا انداز بیاں
ساری دنیا معترف ہے اس کے فن کی بے گماں

سادگی برجستگی شائستگی کا امتزاج
حضرت غالب کی غزلوں کا ہے اپنا ہی مزاج

اس کے لہجے کی روانی اس کا اسلوب بیاں
گنگناتی جس طرح کہ ایک ہو جوئے رواں

مانتے ہیں شاعری کے فن کا سب اس کو امام
سب سے اونچا ہے غزل گوئی میں غالب کا مقام

بے بدل شاعر ہے غالب ہر زمانے کے لیے
ساری دنیا میں ہیں چرچے اس کی تخلیقات کے

اس کی ہر تحریر پابند شعور و آگہی
جھانکتی ہے اس کے ہر اک شعر میں سے زندگی

تاابد ہے زندہ و پائندہ غالب کا کلام
اس کے فن کی عظمت دائم کو دنیا کا سلام

نذر غالب

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی
گوجرانوالہ

ہر اہل شوق کے دل میں مقام ہے اس کا
سخن وری میں بلندی یہ نام ہے اس کا
غم حیات، غم کائنات کا شاعر
یہی سبب ہے کہ زندہ کلام ہے اس کا
وہ اپنے عہد میں رسم کہن سے نالاں تھا
نئے افق جو دکھائے، یہ کام ہے اس کا
منافقت سے کبھی واسطہ نہیں رکھا
جہان شعر و سخن، سب مدام ہے اس کا
اگرچہ لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے
سخن شناس دلوں میں مقام ہے اس کا
کرے برائی اگر کوئی روک دو اس کو
بروں سے پیار کرو یہ پیام ہے اس کا
ہر ایک عہد میں غالب رہے گا غالب ہی
ہر ایک دل میں سعید احترام ہے اس کا

نذر غالب

جان کاشمیری
گوجرانوالہ

غم کی تصویر کسی طور بنائے نہ بنے
زخم کھائے نہ بنے زخم لگائے نہ بنے
وحشت عشق عجب موڑ پہ آپہنچی ہے
آنکھ اٹھائے نہ بنے آنکھ جھکائے نہ بنے
چاہ کے پیڑ کو یوں آگ سی نفرت کی لگی
شکل دیکھے نہ بنے شکل دکھائے نہ بنے
یہ محبت ہے کہ خوابوں کے جہاں میں رہنا
آس ٹوٹے نہ بنے آس لگائے نہ بنے
عمر گزری بھی تو گزری ہے بگولے کی طرح
راز کھولے نہ بنے راز چھپائے نہ بنے
عشق کی رت کو بغاوت کی نشانی سمجھو
خوف کھائے نہ بنے خوف دلائے نہ بنے
دونوں آپس میں لکیروں کی طرح الجھے ہیں
ہاتھ دیکھے نہ بنے ہاتھ دکھائے نہ بنے
دل میں وہ خبط سمایا ہے محبت کی جگہ
سر کو پھوڑے نہ بنے سر کو بچائے نہ بنے
جان جذبات کی دنیا پہ قیامت ٹوٹی
اشک روکے نہ بنے اشک بہائے نہ بنے

غزل

نذرِ غالب

محمد ظریف ایف۔ ایف۔ سی گوٹھ ماچھی

آج تک نہ بن پایا کوئی آشیاں اپنا
یہ زمیں نہیں اپنی اور نہ آسماں اپنا
برق کو دعا دے کر ہوگئے رواں آگے
دور ہی سے دیکھا تھا سوختہ مکاں اپنا
سوز و درد کا عالم کیا کروں بیاں تم سے
غم کی آگ میں جل کر دل ہوا دھواں اپنا
ان پرانے شہروں میں اک گھٹن سی لگتی ہے
خود ہی ہم بسائیں گے اب نیا جہاں اپنا
گو غم جہاں بھی ہے' دور ابتلا بھی ہے
فکر ہے نئی پھر بھی' ہے قلم رواں اپنا
رائیگاں ہی جاتی ہے ہر دعا ظریف اپنی
آج کیوں ہے لاحاصل' نالہ و فغاں اپنا

نذرِ غالب

تنویر پھول کراچی

آج تاروں کو فلک پر ہے درخشاں ہونا!
کھل کے غنچوں کو ہے اب زیب گلستاں ہونا
روئے تاباں کو اگر ان کے چکوری دیکھے!
بھول جائے گی وہ مہتاب پہ قرباں ہونا!!
منزل عشق میں مسکا کے فنا ہوتے ہیں!
تو نے دیکھا نہیں غنچوں کا وہ خنداں ہونا
چاند روپوش ہو ساون کی گھٹا میں جیسے!
روئے تاباں پہ وہ زلفوں کا پریشاں ہونا!
عکس آئینہ گر آئینے میں آتا ہے نظر!
شان آئینہ گر آئینے کا حیراں ہونا!
آگ نمرود کی گلزار بنے گی یکسر!!
شرط ہے دل میں براہیمؑ سا ایماں ہونا
کھیل سمجھے ہیں محمدؐ کی غلامی کو سبھی
کیا ہی آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!
بخت کا ایسے سخنور کے بھلا کیا کہئے!!
جس کی قسمت میں ہو احمدؐ کا ثنا خواں ہونا
پھول ہے نغمہ سرا دیکھو یہ صحبت کا اثر
گل نے سیکھا ہے عنادل سے غزل خواں ہونا

قطعات

راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خاں

بندہ ابن ابی طالب

ساری دنیا پر عیاں ہے یہ سخن
کل بھی اقلیم سخن کا شاہ تھا بندۂ ابن ابی طالب ہے تو
ہر طرح سے آج بھی غالب ہے تو

غالب نہیں ہوں

ملا ہے آپ کے در سے جو اتنا
ثنا میں آپؐ کی کیا کر سکوں گا کسی در کا بھی اب طالب نہیں ہوں
کہ میں تہذیب ہوں غالب نہیں ہوں

غالب زندہ ہے

اس شعر و سخن کی دنیا میں
زندہ ہے ترا فن بھی غالب گر ایک بھی طالب زندہ ہے
اور تو بھی غالب زندہ ہے

پاکستان ٹیلی ویژن لاہور سنٹر

کوئی نہ اوا سنج ملا

تحریر = اشفاق احمد

کردار

○ مرزا غالب　امراء بیگم　○ مرزا یوسف　○ باقر علی خاں　حسین علی خاں　○ بی وماوار بیگم
○ عنایت　○ کلاوار نہ　○ کلیان کہار　○ مداری　○ دربان ابراہیم　○ گورا سارجنٹ
○ کرنل ہرن　○ ہرکارہ　○ ہرن صاحب　○ عزیز لکھوی　○ مصاحب عزیز لکھنوی　○

پیشکش

طارق جمیل

۲۱ دسمبر ۱۹۹۷ء

سین نمبر۱: ان ڈور ون۔

مرزا غالب کا بالا خانہ۔ پرانی وضع کا کمرہ۔ باہر کی جانب۔ کٹہرے دار کھڑکی۔ دیواروں پر طغرے آویزاں (دو تین سے زیادہ نہیں) آل نبی کا ایک طغرہ خاص طور پر کمرے میں مرزا کا چھپر کھٹ گاؤ تکیہ۔ ساتھ ایک گول دکٹوریں تپائی۔ گاؤ تکیہ کے ساتھ ایک آبنوسی صندوقچی۔ تپائی پر قلمدان۔ کاغذ کے کٹے ہوئے تختے۔ (درسی کتاب سے بڑے اور کاپی سائز سے چھوٹے) پیتل کا خط کش۔ دو تین چربی کتابیں۔ ایک بیاض اوپر ڈوری بندھی ہوئی۔ پلنگ کے ساتھ چڑا مندھے ہوئے دو موڑھے ٹیک لگانے والے زمین پر پرانی وضع کا ایرانی قالین۔ چھپر کھٹ کے کونے پر گلٹ کا آفتابہ۔ نیچے ایک سلفچی پیچواں حقہ۔

مرزا مالیدے کا کی دار فرغل پہنے اور قراقلی اونچی ٹوپی اوڑھے تکئے کے سہارے دائیں جانب جھکے ہوئے ایک خط لکھ رہے ہیں۔ پاس موڑھے پر بیٹھے ہوئے باقر علیخان چکلی گھما رہے ہیں۔

باقر: داوا جان۔ بس اب چلئے ناں۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔

غالب: (خط کو تہ کرتے ہوئے) کلیان! ارے بھائی کلیان!
(صندوقچہ کھول کر لفافہ نکال کر خط ڈالتے ہوئے) باقر علی خان آج خرامیدن کے ساتھ کچھ جھگڑا ہو گیا جو ہم نے اس کی گردان نہیں سنی۔

باقر: خرامیدن لازم حاصل مصدر۔ خرام ماضی مطلق۔ خرامید مضارع۔ خرامد مستقبل خواہد خرامد۔ امر بخرام۔ نہی مخرام۔ اسم فاعل قیاسی خرامندہ۔

اس دوران کلیان کہار آتا ہے۔ مرزا اسے لفافہ دیتے ہیں۔ وہ جاتا ہے۔

غالب: اور اسم فاعل سماعی؟

باقر: خوش خرام

غالب: اور اسم مفعول قیاسی؟

باقر: خرامیدہ۔ اب چلئے نا داوا جان۔

غالب: ارے تیری دادی نے آج کیا پکایا ہے جو تو مجھے بار بار اندر چلنے کو کہتا ہے۔

باقر: کچھ بھی ہو۔ آپ چلئے نا۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔

غالب: کلیان خط ڈالنے گیا ہے۔ واپس آ جائے تو چلتے ہیں۔

باقر: وہ آتا رہے گا داوا جان۔ آپ تو چلئے۔

غالب: شاید کسی دوست محبوب کا خط لے آئے؟

باقر: کسی اور کا خط آ گیا تو آپ پھر جواب لکھنے بیٹھ جائیں گے۔

غالب: دیکھو باقر علی! لیکن تمہارا داوا نہیں وندادہ ہوں۔ جو وعدہ تم سے کر لیا اس پر عمل ہو گا۔ اور جو حکم تمہارا ہوا اس کی تعمیل ہو گی۔

بی وفادار: (داخل ہو کر) بی بی کہتی ہیں آ کے کھانا کھا لیجئے۔

غالب: یک نہ شد دو شد۔ بی وفادار تمہاری بی بی نے زنانہ خانے میں جو فتح پوری کی مسجد اٹھا رکھی ہے اس میں سجدہ ریزی سے فارغ ہو چکیں جو اس قدر جلد کھانا تیار ہو گیا۔

وفادار: حضور آپ تو انہیں خوامخواہ نام دھرتے ہیں۔ ایک وہ صبح کے وقت آپ کے شیا بادام (شیرہ بادام) سے غافل ہوئیں کس دن انہوں نے آپ کے لیے قومہ (قورمہ) شوربا نہیں بنایا وہی الگ' شامی الگ' سیخ کباب جدا۔ ادوہ لووہ۔

(جونہی وہ "وہی" الگ کہتی ہے مرزا یوسف بھائی! بھائی! کہتے داخل ہوتا ہے اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر گھورتا ہے)۔

غالب: اے جان برادر تیری بات کا کیا جواب دوں اور کس سے کہوں کہ اسد اللہ مردود و مقہور کا ایک ہی بھائی وہ بھی دیوانہ۔ نہ میں محکوم و مجبور کچھ کر سکوں نہ تو فاترِ شوریدہ سر کچھ کہہ سکے۔ اندر چل تیری خواہر شفیق کھانے کو بلاتی ہے۔

یوسف: بھائی! بھائی!!

باقر: (یوسف سے) آیئے دادا جان! (ہاتھ پکڑتا ہے)

یوسف پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے۔

غالب: (اٹھ کر) چلو میرزا یوسف اندر چلیں۔

یوسف انکار میں سر ہلاتا ہے اور مونڈھے پر بیٹھ جاتا ہے باقر تپائی پر رکھی کتابیں دیکھتا ہے اور کہتا ہے۔

یوسف: بھائی وہ..... بھائی وہ.....

غالب: میرا دیوان دیکھے گا؟

یوسف خوش ہو کر اثبات کے انداز میں غالب کی طرف دیکھتا ہے غالب تکیے تلے سے اپنا دیوان نکال کر اسے دیتا ہے وہ اسے کھول کر محبت اور شوق سے دیکھنے لگتا ہے۔ غالب' وفادار اور باقر اندر کو چلتے ہیں تو غالب پلنگ کے سرہانے اپنی صندوقچی کھولتا ہے اس میں سے کچھ سکے نکال کر مرزا یوسف کی جیب میں ڈالتا ہے۔ پھر تینوں اندر جاتے ہیں۔ یوسف دیوانہ دیوان دیکھے جاتا ہے۔ کسی صفحے پر نہیں ٹھہرتا داروغہ کلو اندر داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا آبخورہ ہے وہ اس پر سرخ صافی لپیٹتا آتا ہے۔

کلو: (مرزا یوسف کو دیکھ کر) آداب عرض مرزا صاحب!

یوسف کوئی جواب نہیں دیتا۔ کلو آب خورے کو چھپر کھٹ کے ساتھ لٹکاتا ہے۔ اور مرزا غالب بستر کی شکن دور کرتا ہے۔

یوسف: (دیوان آگے بڑھا کر) یوسف! یوسف!

کلو: جی ہاں ہے۔ آپ کا نام ہے اس دیوان میں۔

یوسف آگے بڑھاتا ہے کہ مجھے دکھاؤ۔ کلو اس کے ہاتھ سے دیوان لے کر ورق گردانی کرتا ہے اور ایک جگہ رک کر پڑھتا ہے!

دی میرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی
مرزا یوسف ہے غالبؔ' یوسف ثانی مجھے

(دیوان اس کے ہاتھ سے لے کر) یوسف۔ یوسف بھائی۔ بھائی۔
مداری اندر داخل ہوتا ہے اور انگوچھے کے ساتھ پلنگ صاف کرکے آفتابہ چکانے لگتا ہے۔
بڑھئی چلا گیا؟
چلا گیا۔ کتنا تھا پورے ایک آنے کا کام ہے۔ تم لوگوں نے اوڑھنے پر ٹرخا دیا۔
میں نے اس کے ساتھ خود طے کیا تھا۔ بڑے صندوق میں کیلیں ٹھونکنا تھیں۔ چھوٹے پر جستی لگاکر قبضے کسنا تھے۔ اوڑھنا نہ دیتے تو اس کے باپ کے نام لوہارو کی جاگیر لکھ دیتے۔
اس گھر کی اب ایسی ہی ساکھ ہے بازار میں داروغہ جی۔
شرم تو نہیں آتی نمک حرام!
بس ایک ہی رہ گئے ہیں آپ مرزا نوشہ کے غلام۔
عنائت اور کلیان داخل ہوتے ہیں۔
یہ تو رہا ایک پارسل اور یہ ہے تین کمٹ حجور کے
(یوسف مرزا سے) سلام حجور۔
مرزا صاحب کیا اندر تشریف لے گئے؟
عنائت! یوسف مرزا تشریف فرمائیں۔
نیچے ڈیوڑھی میں چلے تھے۔ میں سلام عرض کرچکا ہوں۔ حضور کیا اندر زنانے میں تشریف لے گئے؟
اور کیا باہر جائیں گے قرض خواہوں سے ملاقات کرنے؟
مداری!
رجب آیا تو کہنے لگے شعبان میں ملے گی تنخواہ۔ شعبان آیا تو فرمایا رمضان میں لے لینا۔ رمضان گزرا تو کہنے لگے میاں مداری ہم نے روزے کھائے تم غم کھاؤ۔ ہم سے نہیں ہوتی ایسی نوکری۔
ارے سرم کر کچھ۔ وا دن یاد نہیں جب مکھیاں اڑیں تھیں منہ پر۔ جامع مسجد میں پالکی میں ساتھ بٹھا کے لائے تھے۔
خالی باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا کلیان کمار۔ کچھ گانٹھ میں ہو تب ترتا ہے۔ دیکھ لیے نواب اور ان کی نوابی۔
خیادہ بکواس کی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔
ہم بھی اوئی اللہ۔ نوچ کہنے والے نہیں۔
آپھر ہو جائیں دو دو ہاتھ۔
(تڑپ کر) بھائی بھائی۔

اپنی جیب نے مرزا کے دیئے ہوئے مٹھی بھر روپے نکال کر مداری کے دے مارتا

مداری جھک کر وہ نقدی اٹھانے لگتا ہے۔ مرزا یوسف غصے کی آوازیں نکالتا ہوا چلا جاتا ہے۔

مداری: یہ رہا مرزا کا گھر اور یہ رہی ان کی نوکری۔ جان سلامت ہے تو نوکریاں بہت۔ لاکھوں نواب اور شہزادے پڑے ہیں۔ کسی کی ملازمت کر لیں گے۔

کلو: جا جا دفع ہو۔

عنائت: خبردار جو کبھی ادھر کا رخ کیا۔

کلیان: کاہے کو آوے گا اپنا کالا منہ لے کر۔

مداری: (جاتے ہوئے) ہونہہ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب!

کلو: چل۔۔۔ بکواس بند کر شہزادوں کے ملازم۔

یک زبان ہو کر

عنائت: زیادہ بولا تو خون پی لوں گی۔

کلیان: ہڈی ٹوٹت رہے میرے ہاتھ تیری۔

شور کی آواز سن کر وفادار اندر آتی ہے۔ مداری جاتا ہے۔

وفادار: مرزا صاحب نے پچھوایا ہے یہ شو (شور) کیسا ہے؟

کلو: کچھ نہیں بی وفادار۔ تھا ایک زبان دراز نمک حرام!

وفادار: موئے مدائی (مداری) کی بات ہے کیا؟

عنائت: وہی بدبخت! کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا!

کلیان: میں نے کہا چھوڑ دو ارو گاجی۔ اب رپٹ گیا تو سارا ولدر ٹوٹ گیو۔ بھوکوں مرے گا تو نانی یاد آوے گی۔

وفادار: میں نے بی بی سے کئی متبہ (مرتبہ) کہا مدائی کو نکالو بی بی مدائی کو نکالو۔ گوشت روٹی کھاتا ہے تگنا دورحا (دوہرا) نہیں کرتا حضور کو بدنام کرتا ہے۔

کلو: شرم نہ آئی بدفطرت کو! مرزا یوسف تشریف رکھتے تھے۔ ان کے سامنے بکنے گیا۔

عنائت: دیوانے ہیں تو کیا ہوا۔ سب سمجھتے ہیں۔

کلیان: یو تو دکھ سہ سہ کر دوانے ہوئے۔ بس ایک ہی چپ لگ گئی۔ بولیں نہیں تو کیا ہوا سمجھیں تو سب ہیں۔ جو کچھ جیب میں تھا یو فور ماری مداری کے آگے۔

وفادار: حضور مرزا صاحب ان سے اور یہ ان سے بہت دکھتے ہیں یہ دن میں ایک دو (بار) ادھ (ادھر) نہ آئیں تو مزا جی خود جاتے ہیں ان کو دیکھنے یا پھر مجھ سے فتاتے (فرماتے) ہیں وفادار بیگ، وفادار بیگ! جلنا ذرا ہمارے بھائی یوسف مرزا کو دیکھ کا آنا کس حال میں ہیں۔ کیا کائے ہیں۔ (کیا کر رہے ہیں) وفادار بیگ! وفادار بیگ!...

وفادار بیگ یہ مکالمہ ادا کر رہی ہوتی ہے کہ مرزا صاحب داخل ہوتے ہیں اور دور سے بولنا شروع کر دیتے ہیں۔

غالب: آہا! سبحان اللہ! یہ ہماری بیگم کی چہیتی ملازمہ ہوں گی کیا کہنے وفادار بیگ آپؐ کے!

کلو : حضور مرزا صاحب...

غالب : اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو عجب دماغ دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ راستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب یہ نہر سے نکلتی ہیں تو ممکن نہیں کہ اطراف نہر کی سیر نہ کریں۔(وفادار کئی کاٹ کر وہاں سے کھسک جاتی ہے)
ممکن نہیں کہ دروازے پر سپاہیوں سے باتیں نہ کریں ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھلائیں اور نہ کہیں کہ یہ پھول تمائے چچا کے بیٹے کی کیائی (کیاری) کے ہیں۔
(چونک کر) چلی گئیں؟

کلو : جی حضور! وہ مداری بھی نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔

غالب : تم لوگوں نے کچھ ست سخت کہا ہو گا۔

کلیان : ہمرے بولن نہ بولن سے کیا ہووے ہے حجور۔ وہ تو کھد بھرا ساہنڈ بنا پھرے تھا۔

غالب : اچھا آپ لوگ چلیں۔ کھانا کھائیں اور آرام فرمائیں۔
خط اٹھاتے ہوئے (جب تک ہم یہ ڈاک دیکھتے ہیں)
سب ملازم جاتے ہیں۔ مرزا صاحب پلنگ پر بیٹھ کر ڈاک دیکھتے ہیں۔ ایک خط پڑھ کر مسکراتے ہیں اور گویا ہوتے ہیں۔
واہ منشی ہرگوپال تفتہ واہ! تم مجھے کونسا دو چار سو روپے کا نوکر یا پنشندار سمجھتے ہو جو دس بیس روپے مہینہ قسط خزانہ عامرہ میں جمع کرانے کی آرزو رکھتے ہو۔ انکم ٹیکس دوں گا اور ضرور دوں گا۔ پانچ روپے مہینہ پنشن انگریزی سے قسط مقرر ہو گیا ہے۔ خون سے یہ قسط جاری ہو جائے گی۔ واہ مرزا تفتہ واہ! قربان جاؤں تمہاری فراست کے..... امراؤ بیگم داخل ہو کر مونڈھے کے پاس کھڑی ہو جاتی ہیں مرزا انہیں دیکھ کر جلدی سے ڈاک مونڈھے سے اٹھاتے ہیں تاکہ وہ بیٹھ جائیں۔ وہ بیٹھ جاتی ہیں تو کہتے ہیں۔
منشی ہرگوپال تفتہ کا خط ہے۔ بچارا اس غم میں گھلا جاتا ہے کہ استاد کا انکم ٹیکس کیسے ادا ہو گا۔ ارے بھئی تو سکندر آباد کا رئیس، مرزا غالب کا شاگرد۔ تو گدھی کمہار کی تجھے رام سے کام۔ خوش رہ اور غم نہ کھا کہ غالب کی گزر بسر تو یونہی ہو گی۔

امراؤ : غالب کی گزر بسر تو یونہی ہو گی۔ پر ان الغاروں جانوں کی بسر کیونکر ہو گی جو اس کی ذات سے بندھے ہوئے ہیں۔

غالب : ان کا اللہ مالک ہے بیگم!

امراؤ : وہ تو مالک ہے ہی۔ پر کوئی وسیلہ تو ہو مرزا صاحب! دو بچے، ایک بیوی، پانچ نوکر، یوسف مرزا کی دیکھ ریکھ ایک آپ کی اپنی جان، کچھ قرابت دار اور کچھ.....

غالب : ان میں سے ایک اپنا بوجھ اپنے کندھوں پر لے اڑا۔ مداری بھاگ گیا۔

امراؤ : اچھا ہوا بدبخت۔ منہ پھٹ نمک حرام!!

وہ بھی کیا کرتا ہے چارہ۔ محض روٹی کپڑے پر کب تک پڑا رہتا۔ تنخواہ نہ ملی۔ گریز نہ کرتا تو کیا کرتا۔
میں تو اب بھی عرض کروں گی کہ زمانے کی رفتار دیکھئے اور لوگوں کی نبض پہچانئے۔ وہ جو کچھ چاہتے ہیں دیسا کہئے۔ جو انہیں پسند ہے دیسا لکھئے۔
اب اس سے زیادہ اور کیا کروں بیگم! غالب تخلص کر کے مغلوب ہوا۔ وہ دو ٹکے کے لوگوں کی شان میں قصیدے لکھے۔ طبیعت پر جبر کیا۔ طرز بے دل میں ریختہ لکھنا چھوڑا۔ باریک مضامین باندھنے سے احتراز کیا۔ شاعری کی انا کو مارا۔ اب اس مردود متردد کے لیے جہنم کا کونہ رہ گیا۔ سو مجھے یقین ہے کہ میری رہائی تک وہ بھی ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ گرم کپڑا تن پر نہ ہو گا۔ سردی سے کانپوں گا۔ کتشپ کے لیے ترسوں گا۔
جب دلی مدرسہ میں ٹامسن صاحب نے آپ کو ملازمت کے لیے بلایا تو آپ نے کیا گل کھلایا!
سرکاری ملازمت کا ارادہ اس لیے کیا تھا کہ خاندانی اعزاز میں اضافہ ہو نہ کہ بزرگوں کے پرانے اعزاز کو بھی کھو بیٹھتا۔ ٹامسن صاحب ہمارے استقبال کو نہیں آئے ہم نے ملازمت پانے سے پہلے رخصت چاہی اور لوٹ آئے امراؤ بیگم!

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور اب جو بیٹھے ایک ایک پیسے کو ترستے ہیں اور کہیں سے سود اور کہیں سے بلاسود قرض اٹھائے جا رہے ہیں تو یہ رونا کم ہے کیا۔
ہائے ہائے امراء بیگم! کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڑا رونا رزق کا ہے۔ جب معاش مقرر ہو گیا غم! نہ صاحب نہ! یہ باتیں جانوروں کی سی ہیں کہ کچھ کھا لیا' پانی پی لیا اور چین سے سو رہے۔ آدمی عموما اور صاحبان ننگ و ناموس خصوصا باوجود فراغ معاش ایسی جاں گداز بلاؤں میں مبتلا رہتے کہ کوئی کیا کہے۔ یہ حال یا تو صاحب ذائقہ جانے یا خدا جانے۔
اپنے جنوں کا بوجھ۔ پنشن مسدود! وظیفہ باسٹھ روپے ماہوار۔ اوپر سے نوابی ٹھاٹھ! میں پوچھتی ہوں آخر یہ کب تک نبھے گا۔
جب تک نبھے گا تب تک نبھائیں گے۔ اس کے بعد جو حال ہو گا اس کے گلے سے لگ رہیں گے۔
استاد ذوق کو خدا نے وہ مرتبہ دیا ہے کہ آٹھ کہاروں کی پالکی میں نکلتے ہیں۔ نقیب اور چوبدار سواری کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔
ہوس ناؤ نوش اور حرص و آز میں مرزا نوشہ بھی کسی فانی انسان سے کم نہیں لیکن چیز دور بالیش اور چادرخش و نقیب کے چاؤ میں گٹا گھاس والے شعر نہیں لکھ سکتے۔
قلعہ کے اندر خواص اور قلعہ سے باہر جمہور سبھی ان کے شعروں پر سر دھنتے ہیں۔
پر ہم جس باغ کے بلبل ہیں وہ ابھی پیدا نہیں ہوا۔ یہی ہماری زندگی کا دکھ اور ہماری حیات کا اندوہ ہے۔
(آتے ہوئے) دادی جان! دادی جان! ہمیں پتنگ اور ڈور منگوا دیجئے۔ ہم کنکوا اڑائیں گے۔

امراؤ : تمہارے دادا کے پاس کھانے کو کچھ نہیں اور تم ڈور پتنگ مانگ رہے ہو۔ جاؤ اور جاکر گلستان یاد کرو۔ (اٹھ کر) اب یہ عمر پیچ لڑانے کی ہے؟ آؤ میرے ساتھ۔ (جاتے ہوئے) زیادہ دیر یہاں رکو گے تو حسین علی خان بھی پیچھے بھاگا آئے گا۔

امراؤ جاتی ہے باقر بھی سر نیچے کئے پیچھے جاتا ہے۔

غالب : (روکتے ہوئے) باقر علی خان!

باقر : جی!

غالب : ہوا کس رخ کی ہے؟

باقر : قلعہ کے رخ کی۔

غالب : (جھک کر صندوقچہ کھولتے ہوئے) تیز ہے یا نرم؟

باقر : تیز ہے دادا جان!

غالب : (اسے روپیہ دیتے ہوئے) نکل منگوانا اور کلیان سے کہنا کہ کبوتر بازوں کی کٹری سے ڈور لائے۔

باقر : (خوش ہو کر) جی بہت اچھا دادا جان۔

غالب : جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو آگرہ آباد میں ایک کٹرہ کشمیرن وادی کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کھوٹے پر ہم پتنگ اڑایا کرتے تھے اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔ (مٹھی کھول کر) لو یہ کھاؤ۔

باقر دادا کی ہتھیلی پر بینے ہوئے نمکین بادام دیکھ کر اٹھانے لگتا ہے تو غالب مٹھی بند کر لیتا ہے۔

اوں ہوں۔ میری مرغی کے بچے! یوں نہیں چگا کرتے۔

باقر جھک کر ان کی ہتھیلی پر منہ لاتا ہے اور ہاتھ لگائے بغیر بادام کھاتا ہے۔ غالب اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ہتھیلی اور چہرے کے کلوز اپ۔

-----Dissolve-----

سین نمبر ۲: ان ڈور۔ رات۔

وہی کمرہ۔ تپائی پر شمع دان روشن ہے۔ اور غالب اپنے پلنگ پر اسی طرح نیم دراز فکر سخن میں مشغول ہیں۔ آب خورہ صافی والا پاس دھرا ہے۔ اسے اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ خالی ہے۔ اوندھا کر کے دیکھتے ہیں۔ ایک قطرہ بھی اس میں نہیں۔ پھر لکھنے لگتے ہیں پس منظر میں گولیاں چلنے اور سرنگیں لگنے کی خوفناک آوازیں آتی ہیں بیچ بیچ میں کتے بھی بھونکتے ہیں۔ یہ غدر کا زمانہ ہے۔

غالب : غالب (شعر سوچتے ہوئے)

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

یہ شعر مکمل ہو جانے پر کمربند میں ایک گرہ لگاتا ہے اور اس شعر کو روانی سے پڑھتا ہے۔ دوسرے مصرعہ کے درمیان میں بوڑھا دربان لالٹین کو اٹھائے اندر داخل ہو گیا ہے۔

ن : حضور مرزا نوشہ حضور۔ میرا دیوانہ مر گیا۔ میرا گھر لٹ گیا۔ میں برباد ہو گیا۔

غالب : کیا بات ہے ابراہیم؟

دربان : میرا دیوانہ مرگیا حضور۔ مرزا یوسف اس جہان سے گزر گیا۔ اپنے برسوں کے غم کا ر خوار کو دھوکا دے گیا۔

غالب : (اپنے آپ سے) میرا بھائی مرگیا۔ لیکن غالب نیم جان نے کبھی ایسی تنہائی کی آرزو تو نہ کی تھی۔ مرزا یوسف مرگیا۔

دربان : کل پانچ روز بخار رہا حضور۔ وہ ادھر تڑپتے رہے میں چارپائی سے لگا زمین پر لوٹتا رہا۔ نہ دوا نہ دارو۔ نہ وید نہ حکیم۔ پاؤ گھڑی پہلے میرے دیوانے نے دم دے دیا۔

غالب : کسی صورت مجھے تو اطلاع بھجوادی ہوتی دربان۔

دربان : ہمارے محلے میں گورے گشت کر رہے ہیں۔ میں سر باہر نکالتا تو گورا سارجن مجھے گولی مار دیتا۔ جان کے خوف سے اندر ہی چھپا رہا۔

کلو اور عنایت آتے ہیں۔

کلو : کیا بات ہے۔ کیا ہوا بابا ابراہیم؟

دربان : یوسف مرزا مرگیا۔ میرا دیوانہ مجھے چھوڑ گیا۔

عنایت : اناللہ وانا الیہ راجعون۔

دربان : پانچ روز بخار میں پھنکا کئے اور پانی پیتے رہے۔ نہ غذا نہ دوا... نہ حکیم نہ بید۔ بس ایک ہی رٹ لگی رہی۔ (کلیان بھی آ جاتا ہے) بھائی بھائی.... بھائی بھائی۔ میں نے لاکھ کہا۔ بہتیرا سمجھایا کہ بھائی نہیں آ سکتے.... تو بھی دروازے سے باہر جھانکتا ہے۔ گورا گولی مار دیتا ہے۔ زور زور سے رونے لگے۔ میں نے یوسف مرزا کو غیض و غضب میں تو دیکھا تھا حضور۔ پر دیوانے کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ بھائی بھائی کہتے.. دید کی حسرت ساتھ ہی لے گئے۔

کلیان : اب ارے کس طرح پہنچے؟

دربان : کوٹھے پر چڑھا۔ چڑی ماروں کے احاطے میں اترا۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ انھوں نے چارپائی کھڑی کر دی۔ میں دیوار پر چڑھ کر ہیرالال زرگر کے کوٹھے سے ہوتا ہوا چھتوں ہی چھتوں یہاں پہنچا ہوں۔

غالب : عنایت۔ وفادار۔ بیگ کو جگا کر اندر اطلاع کر دو کہ مرزا یوسف مرگیا۔ دو چادریں دھلی ہوئیں۔ کچھ عرق گلاب صندل اور کافور گھر پر ہو تو دے دیں۔ نہیں تو رہنے دیں۔

عنایت اندر جاتا ہے۔

کلو : لیکن حضور دفن کا انتظام کہاں کریں گے؟

غالب : ساتھ والی مسجد کا بیرونی صحن باقی ہے کہ وہ بھی ملبہ سے بھر گیا؟

کلیان : جی ہاں وہاں پہلے بھی ایک قبر ہوئے۔

غالب : چلو ابراہیم۔ جس راستے سے تم آئے تھے۔ ہمیں اسی روش سے لے چلو۔

دربان : سرد کے اور دم سادھ کے چڑھنا اترنا پڑے گا حضور۔ گورا کا خدا سے کھٹکے پر گولی داغ دیتا ہے۔

غالب : اب اس سے زیادہ اور کیا گولی چلے گی۔ اور مرزا اسد اللہ خان غالب! تم بھی رہوار ہوا پر اڑے پھرتے تھے

بازو کتوا کر بھی نبرد آزمائی کرد گے۔

اس خود کلامی میں حسین علی اور قربان علی خان روتے ہوئے آتے ہیں۔ ان کے ساتھ وفادار اور عنایت بھی ہیں۔ عنایت کے ہاتھ میں دھلی ہوئی دو چادریں اور ایک گلاب پاش ہے۔ سامنے دروازے کی اوٹ پر امراؤ بیگم ملازموں کو دیکھ کر رک جاتی ہیں۔

حسین علی: دادا جان۔ دادا جان۔ چھوٹے دادا کو فرنگی نے گولی مار دی۔

وفادار بیگ مسلسل ہچکیوں سے روئے جاتے ہیں

دربان: بیمار تھے۔ پانچ دن سے تپ آتی تھی۔

باقر: تو جھوٹ کہتا ہے۔ میرے چھوٹے دادا کو سارجن نے مارا ہے۔ فوجیوں نے پہلے ان کا گھر لوٹا۔ پھر انہیں گولی مار دی۔

دربان: کل بے رحم فوجیوں نے دروازہ اکھاڑ پھینکا۔ سارے گھر پر جھاڑو پھیر دی۔ میں یوسف مرزا کے سرہانے بیٹھا خاموش سب دیکھتا گیا۔

باقر: پھر انہوں نے جاتے ہوئے دادا جان کو گولی مار دی۔

دربان: مارنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے ان کے پاؤں پکڑ لئے کہ کیوں ناحق اپنی گولی ضائع کرتے ہو۔ یہ تو گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے۔ آج نہیں مرا تو کل مرجائے گا۔

باقر: تم جھوٹ کہتے ہو۔

حسین: بکواس کرتے ہو۔

باقر: انہوں نے دادا جان کو گولی ماری ہے۔ ہم ان کا بدلہ لیں گے۔ حضور شاہ سلامت اس کا بدلہ لیں گے۔

کلو اور کلیان اور عنایت انہیں چپ کرانے اور سمجھانے کی کوشش کرتے۔

میاں حسین علی خان۔ مرزا باقر علی خان۔ ہماری بات تو سنو...... ذرا سنبھلو تو۔ کے فقرے گڈمڈ ہو جاتے ہیں۔ ایک شور سا بچ جاتا ہے اور اس شور پر دروازہ دھڑ دھڑایا جاتا ہے۔ پھر بھاری بوٹ پہنے ایک گورا سارجنٹ دو کالے سپاہی اندر آتے ہیں۔ وفادار بھاگ کر زنانے میں لپک جاتی ہے۔

سارجنٹ: تم کون لوگ ہو اور کون سا سکیم کے تحت شور مچا رہا ہے۔

غالب: میرا نام اسد اللہ خان غالب ہے۔

سارجنٹ: ہم کسی اسد اللہ خان غالب کو نہیں جانتا۔ تم معزول بادشاہ کا بھائی ہے۔ ادھر سازش کرتا مانگ رہا تھا۔

کلیان: یہ تو ہمارے مرجا صاحب۔

سارجنٹ: شٹ اپ۔ ہمارے ساتھ ابھی کرنل صاحب کی کچہری چلو۔ (غالب سے) تم مسلمان ہے؟

غالب: آدھا مسلمان ہوں۔

سارجنٹ: ویل۔ آدھا مسلمان کیسے ہوا؟

غالب: صاحب شراب پیتا ہوں ہم سو ک نہیں کھاتا۔

سارجنٹ : نہیں تم پورا مسلمان لگتا ہے۔ ماڈورام۔ گنگا دین ان کو ساتھ لے چلو۔ سب لوگ... سارا قافلہ سپاہیوں اور سارجنٹ کے آگے دروازے سے نکلتا ہے۔

------ڈزالو------

سین نمبر ۳: ان ڈور۔ رات

کرنل برن کا دفتر۔ اوپر کو چڑھی ہوئی سنہری مونچھوں والا خوب صورت کرنل وردی میں ملبوس میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ پیچھے دیوار پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر آویزاں ہے۔ میز پر چھوٹا سا یونین جیک ہے۔ غالب اور اس کے ساتھی بمعہ حسین علی اور باقر علی اندر داخل ہوتے ہیں۔ عنایت کے ہاتھ میں دو چادریں گلاب پاش ہے۔ سب بیٹے پر ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سارجنٹ : (سلوٹ کر کے) سر! اے گروپ آف ڈیٹرز انفار مرزا اینڈ سیونٹز۔

کرنل : آپ کا نام۔

غالب : اس مردود و مقہور کو غالب کہتے ہیں۔

کرنل : یہ تو آپ کا تخلص ہو گا۔ پورا نام فرمائیے۔

غالب : مرزا اسد اللہ خان غالب۔

کرنل : آپ شعر بناتا ہے۔

کلو : حضور نے ملکہ معظمہ کی شان میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے۔ اور حضور ملکہ عالیہ کی طرف سے انہیں شکریے کا خط بھی مل چکا ہے۔

کرنل : وہ قصیدہ ہم کو بھی دکھاؤ صاحب۔

غالب : اب مجھے کمر ذلیل کر دو گر کرنل صاحب کہ جہاں جاؤں قصیدہ بھی ساتھ ساتھ اٹھائے پھروں۔ لکھ تو دیا تھا۔

کرنل : پھر آپ کو کوئی خطاب۔ کوئی خلعت وغیرہ ملا۔

غالب : جواب عرض اور پانچ دعویٰ تو ولایت سے موصول ہو چکا ہے۔ لیکن خطاب نہیں۔ ہم نے ملکہ معظمہ کو پھر لکھا ہے۔

کرنل : کیا ہم ہر میجسٹی سے آپ کی خط و کتابت دیکھ سکتے ہیں۔

غالب : وقت ہو تو ابھی تشریف لے چلئے۔

کرنل : اگر آپ ایسا ہی ملکہ معظمہ کا خیر خواہ ہے تو دہلی کی لڑائی کے وقت Ridge پر کیوں نہیں آئے۔

غالب : (سوالیہ نظروں سے Ridge کے معنی نہیں سمجھتے)

کرنل : پہاڑی پر کیوں نہیں آئے۔ جہاں انگریزی فوجیں اور ان کی طرف دار جمع ہو رہے تھے۔ ہمارا مطلب ہے فلیگ سٹاف پر کیوں موجود نہیں تھے؟

غالب : (زہر خند کے ساتھ) تلنگے دروازے سے باہر آدمی کو نکلنے نہیں دیتے تھے۔ میں کیوں کر آتا۔ اگر کچھ قرینہ کر

کے کوئی بات کر کے نکل جاتا۔ جب پہاڑی کے نزدیک گولی کی زد میں پہنچا تو پہرے دار گورا مجھے گولی مار دیتا۔ (سارجنٹ کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ بھی مانا کہ تلنگے باہر جانے دیتے۔ گورے گولی نہ مارتے' میری صورت کو دیکھتے اور میرا حال معلوم کیجئے۔ بوڑھا ہوں۔ پاؤں سے اپاہج اور کانوں سے بہرا۔ نہ لڑائی کے لائق نہ مشورت کے قابل۔ دعا کرتا ہوں۔ سو یہاں بھی دعا کرتا رہا۔

کرنل : (ہنس کر) ویل ویل (سارجنٹ سے) اوہ میٹ ہم فری۔ ہی از جسٹ اے۔ پوئیٹ۔۔۔لیو ہم۔

سارجنٹ : شاعر صاحب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ لیکن ابھی گھروں کے اندر رہئے۔ باہر نکلے یا شور کیا تو صاحب۔ بہادر گولی مار دے گا۔

سارا قافلہ اسی طرح نکل جاتا ہے۔ صرف کلیان اور عنایت سلام کرتے جاتے ہیں۔ کلیان زیادہ خوف زدہ ہے۔

ڈزالو

سین نمبر ۴: ان ڈور۔ دن

مرزا کا وہی کمرہ۔ لیکن حالات بدل چکے ہیں۔ اس کمرے کے رکھ رکھاؤ اور تزئین و آرائش میں تبدیلی آ چکی ہے۔ وہ پہلے کی سی بات نہیں۔ غریبی کا رنگ نمایاں ہے۔ مرزا صاحب کے سامنے پرانی وضع کے رسالے اور کتابیں کھلی ہوئی ہیں۔ جو ان کی کتاب قاطع برہان کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ وہ انہیں پریشانی کے عالم میں پڑھ رہے ہیں۔ آنکھوں پر عینک ہے۔ ڈاک کا ہرکارہ دروازے کے باہر گھنگھرو بجاتا ہے۔

غالب : کون ہے؟

ہرکارہ : (آف کیمرہ) ہرکارہ حضور۔

غالب : کیا ہے؟

ہرکارہ : (داخل ہو کر) آپ کی ڈاک ہے مرزا صاحب اور یہ ایک پارسل ہے۔

غالب : کس کی جانب سے ہے۔

ہرکارہ : پارسل تو میر مہدی مجروح کی طرف سے ہے۔ لیکن ان تینوں لفافوں پر بھیجنے والے کا نام نہیں لکھا۔

غالب : ہم جانتے ہیں یہ نامے کدھر سے آئے ہیں۔ اور ان میں کیا لکھا ہے۔ یہ گم نام خط۔ گالیوں' کوسنوں' دشناموں اور بہتان طرازیوں کے ہیں۔ جو میرے "قاطع برہان" لکھنے کی وجہ سے مجھے ملک کے گوشے گوشے سے آ رہے ہیں۔

ہرکارہ : انہیں واپس کر دوں سرکار۔

غالب : نہیں بھائی۔ جب بھیجنے والے نے نام پتہ ہی نہیں لکھا تو واپس کیسے کرے گا یہاں میرے سرہانے ڈال دے۔ جس بالیں پر اتنی بلاؤں کا ہجوم ہے وہاں یہ بھی سہی۔

ڈاکیہ خط رکھ دیتا ہے۔ اور آداب عرض کر کے چلا جاتا ہے۔ غالب ڈرتے ڈرتے ایک خط کھول کر پڑھتا ہے۔ آواز پر سوز ہو گی

آواز نمبر ۱ : اولین لعنتی کمینے۔ بڈھے جھردس پر افشاں خروس تیری یہ مجال کہ برہان قاطع کا جواب لکھے۔ اور اس کو چھپوائے تیری ہزار پشت پر لعنت ہو۔ خمیدہ پشت فاسق و فاجر بدمست ازلی چھپی ہوئی فرہنگ میں کہ جس سے ہمارے باپ دادا استفادہ کرتے رہے ہیں تو کیڑے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ کرم خوردہ و بدتراز مردہ تو اور تیرا باپ اور تیرا دادا۔ اور تیری ماں تیری دادی۔

مرزا صاحب خط فوراً بند کر دیتے ہیں۔ آواز بند ہو جاتی ہے۔

دوسرا خط کھولتے ہیں۔

آواز نمبر ۲ : جھوٹے ترکمان۔ بناوٹی ہرمز کیلئے پیر چیلے خود کو ترکی اور مغل جتاتا ہے اور لوگوں سے اپنی اصل چھپاتا ہے سن بدبخت دھنئے۔ موچی نقال۔ باتندے۔ کمہار۔ جلاہے۔ کنجڑے۔ گیدی۔ چمار۔ یہ ہیں تیری اصل ذاتیں۔ جو تو لوگوں سے چھپاتا ہے۔ اور محض اعتبار کے خوف سے اپنے جرائم کو غرق سے ناب کرتا ہے بدبخت اگر تجھ کو علم و عروض اور انشاء و ادب اور صرف و نحو سے دور کا بھی علاقہ ہوتا تو برہان قاطع کا جواب لکھنے سے پہلے اپنے ہاتھ قطع کروا دیتا۔ لیکن تیری والدہ ماجدہ کی شان میں میر جعفر زٹلی نے پہلے سے کیا خوب کیا ہے کہ۔ چچ آہا۔

مرزا فوراً" خط کو بند کر دیتے ہیں۔ ذرا نگاہیں اوپر اٹھاتے ہیں۔ ذرا سے مسکراتے ہیں۔ پھر غالب تیسرا خط اٹھاتے ہیں۔ کھولتے ہیں۔

آواز نمبر ۳ : حضور مرزا صاحب! استاد شاہ و شاعر بے بدل۔ آپ کی کتاب قاطع برہان دیکھی۔ دل باغ باغ ہو گیا۔
جب آپ سے کم ظرف۔ ناخلف اور بے مرشد پیر فرتوت اس کرہ ارض پر موجود ہیں۔ گورے کو گولی چلانے اور مسلمان کے لہو میں ہاتھ رنگنے کی ضرورت نہیں۔ خداوند کریم نے آپ کو چہرہ ضرور عطا کیا ہے لیکن وہ آنکھ عطا نہیں فرمائی۔ جو رخ خوک منت پر برستی لعنت دیکھ سکے برہان قاطع برس ہا برس سے شائع ہو رہی ہے۔ ہر کہہ و مہ خاص و عام اپنے اپنے وقت میں اسے حرز جاں بنا چکے ہیں۔ اور آپ چھپی ہوئی چیز میں غلطی ہائے مضامین ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس قدر عقل سے ناپاک سے لبریز ذہن میں نہ آئی کہ اگر برہان قاطع میں غلطیاں ہوتیں تو وہ چھپتی ہی کیوں؟ جو شخص اسلاف کہن اور قدیم اصناف سخن اور کتاب کہن میں، غلطی پکڑنے کی یا ان کی لغزش کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اندھا۔ بہرا۔ لولا لنگڑا ہو کر مرتا ہے۔ انشاء اللہ یہی انجام آپ کا ہو گا۔ سنتے ہیں تیرا بھائی دیوانہ تھا اور سودا آپ کے خاندان میں پشتوں سے چلا آ رہا ہے۔ تو بھی دیوانہ ہے' لڑکے تیرے بھائی یوسف مرزا کو دلی میں پتھر مارتے ہوں گے ہم تجھے پٹنہ سے رام پور سے۔ بٹالے سے پتھر ماریں گے۔ اور اس وقت تک دم نہ لیں گے جب تک تیرا ناپاک خون ناک کے راستے نہ نکل جائے۔

(جونہی یہ فقرہ "اور اس وقت تک دم نہ لیں گے" پڑھا جا رہا ہے تو اس پر یوسف مرزا کی آواز ابھرتی ہے۔ بھائی۔ بھائی۔ بھائی جیسے اس کی روح کو تکلیف ہو رہی ہو کہ کوئی اس کے بھائی کو پتھر مار رہا ہے غالب یہ خط بھی سرہانے ڈال دیتے ہیں اور ان پر خوف۔ نامرادی بے چینی اور دکھ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس اثناء میں مداری۔ حضور صاحب قبلہ' مرزا صاحب۔ آقا مرزا صاحب کہتا آتا ہے۔ اور آ کر غالب کے قدموں سے چمٹ جاتا ہے۔

غالب : ارے مداری کہاں رہا اتنے برس۔ ظالم۔ سنگ دل ہم کو اکیلے چھوڑ کے۔

مداری: مجھ سے بڑی بھول ہو گئی خداوند نعمت۔ مجھے معاف کر دیجئے۔

غالب: لے اور سن۔ ہم کون ہوتے ہیں تجھے معاف کرنے والے۔ تو نے ہمارا کیا بگاڑا تھا۔ جو ہم سے معافی مانگ رہا ہے۔

مداری: ہمارا زمانہ دیکھ لیا حضور۔ سارے لوگ جان لیے۔ پہچان لیے۔ مجھے تو اپنے قدموں میں جگہ دے دیجئے۔

غالب: بھئی یہ تیرا گھر ہے۔ تیری چوکھٹ ہے۔ ہم تو اس میں مہمان کی حیثیت سے گزر اوقات کرتے ہیں۔ جہاں اور پڑے ہیں تو بھی پڑا رہ۔ دو وقت کی روٹی اور عید بقرعید پر کپڑا لے۔ کہیں سے کچھ آ گیا تو اس کا حصہ بخرہ الگ مانگ۔

مداری: (کھڑا ہو کر پگڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگتا ہے)

غالب: واہ میاں مداری واہ۔ اچھا تماشا کرتے ہو۔ اس رونے سے ہمارا دل بہلے گا کیا۔ جا جا کر میدہ فروش سے کہہ کہ کل ہنڈی بھنوائیں گے تو اس کا حساب صاف کر دیں گے۔

مداری اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ غالب ان خطوں کو سمیٹتے ہیں۔ لفافے میں بند کرتے ہیں اور احتیاط سے اپنی صندوقچی میں رکھ لیتے ہیں۔ امراؤ بیگم آتی ہیں۔ ان کی حالت بھی پتلی ہے لباس سے ظاہر ہے وہ آ کر پھر اسی مونڈھے پر بیٹھ جاتی ہیں۔

امراؤ: ایسے خطوط سے اور ان دشنام طرازیوں سے جو آپ کے جی پر گزرتی ہے۔ میں اس سے خوب واقف ہوں۔

غالب: (مسکرا کر) پھر۔

امراؤ: قاطع برہان لکھ کر آپ نے کیا پایا۔ ذلت سہی۔ رسوائی کا منہ دیکھا۔ مقدمہ ہارا۔ جب برہان قاطع اگلے زمانے کے لوگوں نے لکھی تو کیا غلط ہو گئی۔ آپ نے خواہ مخواہ ہنڈی کی چندی کی۔

غالب: بیگم یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں وہ سب حق ہے کیا آگے احمق نہیں پیدا ہوتے تھے۔

امراؤ: نعوذ باللہ! دور پار کوئی اگلے وقتوں کے بزرگوں کو بھی احمق کہتا ہے۔ آپ نے ایسی باتیں کر کے بڑے بڑوں کا دل دکھایا ہے۔

غالب: اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں امراؤ بیگم کہ جتنی فرہنگیں اب موجود ہیں' سب کے جامع ہندی ہیں۔ کوئی اہل' اہل زبان نہیں۔ اساتذہ ایران کو ماخذ ٹھہرا کر جو لغات ان کی نظم میں دیکھے' مقام کی مناسبت سے اس کے معنی لکھ دیے۔ استعارا معنی کا مدار قیاس پر۔

امراؤ: آپ کے بھانویں یہاں کوئی فارسی جانتا ہی نہیں۔

غالب: اہل ہند میں سوائے خسرو دہلوی کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔

امراؤ: میری مانئے کہ سیدھی سیدھی شاعری کیجئے۔ جمہور کی سمجھ میں آئے۔ ہر کس و ناکس واہ واہ کرے۔ رسم دنیا بھی پوری ہو اور بعد مرنے کے چار لوگوں کو آپ کا نام بھی یاد رہ جائے۔

غالب: اگرچہ اس وجہ سے کہ میں ہر کام خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا' جو کچھ گزرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اس پر راضی ہوں' لیکن آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں۔

میری آرزو ہے کہ اب زندہ نہ رہوں اور اگر رہوں تو کم از کم ہندوستان میں نہ ہوں۔

امراؤ: کیسی منحوس باتیں منہ سے نکالتے ہیں آپ!

غالب: جی چاہتا ہے کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کالوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا۔ کبھی مصر میں جا ٹھہرا۔ کبھی نجف جا پہنچا ہندوستان کی ہوا اور فکر بلند کے سامنے اندھے کی لاٹھی ہے۔

امراؤ: آپ کے چند عقیدت مندوں کو چھوڑ کر ملک کے سارے سیانے پرانے وہرانے عالم یہی کہتے ہیں مرزا کے اشعار بے معنی اور مضمون پیچیدہ ہیں' البتہ مکتوب اچھے لکھ لیتے ہیں۔

غالب: (مایوسی کے ساتھ) ہم تو نہ ہوں گے لیکن شاید ایک زمانہ ایسا بھی آئے کہ ایک گروہ ان لوگوں کا پیدا ہو جو مرزا نوشہ کو بھی سمجھیں اور ان کے شعروں پر بھی سر دھنیں۔

امراؤ: آپ کے خیال میں ایسی شاعری کر کے آپ لافانی ہو جائیں گے؟ آئندہ نسلیں آپ کا نام یاد رکھیں گی؟ شہرت عام اور بقائے دوام کے محل میں کرسی ملے گی؟

غالب: کبھی کبھی ایک موہوم سی امید' ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے کہ اسی' سو برس گزرے ہیں۔ لوگوں کے جاے اور ہیں' انداز زیست نئے ہیں۔ طرز تکلم جدا ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ الگ ہے لیکن غالب کو سمجھتے ہیں اور ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا آج کا غالب اپنے دل میں اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔

امراؤ: شعروں میں تعلی نام کو نہیں لیکن سوچ میں کیا پندار ہے؟

غالب: سوچ بھی کوئی پتھر کا قلعہ ہے بیگم کہ اس پر گورے کا جھنڈا گڑ جائے۔ میں روکوں بھی تو یہ سیل تھمے گا!

امراؤ: اب زندگی کا آخری پہرا ہے مرزا صاحب! پتہ نہیں کب کوچ کا حکم آ جائے۔ اٹھا نہیں جاتا تو بیٹھ کر سہی' بیٹھا نہ جائے لیٹے لیٹے سہی' ایماء اشارے سے نماز پنج گانہ کی پابندی تو کر لیجیے۔

غالب: ساری عمر فسق و فجور میں گزری۔ نہ کبھی نماز پڑھی' نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند نفس باقی رہ گئے ہیں۔ اب اگر چند روز بیٹھ کر یا ایماء اشارے سے نماز پڑھی بھی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیوں کر ممکن ہو سکے گی۔

امراؤ: آخر کچھ اپنی آخرت کی' کچھ اپنے جنازے کی بھی تو فکر ہونی چاہیے۔

غالب: میں تو اس قابل ہوں امراؤ بیگم کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو' اگر وہ اسے کھانا گوارا کریں' چھوڑ آئیں۔

مرزا صاحب کا یہ ڈیلاگ سن کر امراؤ بیگم رونے لگتی ہیں اور آنچل میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرتی ہوئی وہاں سے چل دیتی ہیں۔ غالب اسی کیفیت میں اپنے کاغذ سمیٹنے لگتے ہیں اور ساتھ ساتھ گنگنانے لگتے ہیں "میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں۔" کلو داروغہ آ کر اطلاع دیتا ہے۔

کلو: حضور میرن صاحب تشریف لاتے ہیں۔

غالب : آخاہ میرن صاحب (کلو جاتا ہے۔ میرن داخل ہوتے ہیں) بھئی واہ آہاہاہا۔ میرا پیارا میرن آیا۔ آؤ بھائی مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔

میرن : خدا کا شکر ہے حضرت۔

غالب : جان غالب یوں ایفائے عہد کرتے ہو۔ صبح آنے کے لیے کہ گئے تھے اور اب آئے ہو۔

میرن : کیا عرض کروں حضرت! رات بھاڑا مل سے کچھ قرض آپ کے لیے ملنے کی امید تھی۔ اس نے آج صبح پر ٹالا۔ صبح گیا تو دوپہر کے وقت آنے کو کہا۔ دوپہر کو پہنچا تو انکاری ہو گیا۔ در آں حالیکہ میں بڑی توقع لے کر گیا تھا۔

غالب : اجی میرن صاحب! یہاں خدا سے بھی توقع نہیں، مخلوق کا ذکر کیا! کچھ بن نہیں آتی۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔

میرن : یہ آپ کیا فرما رہے ہیں حضور!

غالب : کچھ عرصے سے میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔

میرن : اس میں کیا شک ہے حضور مرزا صاحب!

غالب : میں کہتا ہوں لے غالب، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔

میرن : خدانخواستہ حضور! یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔

غالب : آیئے آیئے نجم الدولہ بہادر..... دبیر الملک اسد اللہ خان صاحب ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ۔ ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی حضرت نواب صاحب! حضور مرزا نوشہ غالب صاحب! یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا! بے غیرت!! کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے یہ بھی تو سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔

میرن : حضور آپ مسترد نہ ہوں اور ہمارے مرزا کی ہمارے سامنے یوں بے حرمتی نہ فرمائیں۔ خدا مالک ہے۔ ایک آدھ دن میں کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔

غالب (موضوع بدل کر) ایک تحفہ تھا ہمارا تمہارے پاس کم قیمت اور ناکمل۔ ہمیں سناؤ کہ اسے آج پورا ہی کر کے آپ کے حوالے کر دیں۔

میرن : بہت بہتر!!

خوش الحانی سے میرن یہ شعر پڑھتا ہے۔

دل سے تیری نگاہ جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!

------فیڈ آؤٹ------

سین ۵: ان ڈور۔ دن

مرزا غالب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں۔ ان کی نشست بھی اب ایک اور کوٹھڑی میں ہے۔ گھر بدل چکے ہیں۔ پلنگ کی جگہ چارپائی ہے۔ سرہانے ایک لکڑی کے ڈبے پر کچھ کاغذ اور قلمدان دھرا ہے۔ چارپائی پر ایک نحیف و نزار آدمی گندی رنگ' سفید ڈاڑھی اسی بیاضی کا لیٹا ہوا ایک مجلد کتاب سینے سے لگائے گاڑھے مطالعہ کر رہا ہے۔ یہ کتاب دیوان قانی ہے اور پڑھنے والا مرزا غالب۔ کلو داروغہ جواب خود بھی کافی بوڑھا ہو چکا ہے' داخل ہوتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے خواجہ عزیز لکھنؤی اور ایک اور صاحب قدر دان غالب داخل ہوتے ہیں۔ کلو انہیں لاکر چارپائی کے پاس کھڑا کر دیتا ہے۔

کلو: ملاحظہ فرمائیں۔ چراغ سحری ہے۔ پہلے ناتواں تھے' اب نیم جاں ہیں۔

عزیز: حضور آداب عرض!

صاحب: مرزا صاحب تسلیمات!

کلو: پہلے تو کچھ سنائی دیتا تھا اب بالکل بہرے ہو گئے ہیں۔

عزیز: مرزا صاحب..... حضور مرزا صاحب!

صاحب: خواجہ عزیز لکھنؤی تشریف لائے ہیں۔

غالب کچھ جواب نہیں دیتے۔ اسی طرح پڑھا کرتے ہیں۔

عزیز: میری دانست میں انہیں تکلیف نہیں دینی چاہیے۔

صاحب: اتنی دور سے آرزوئے دید لے کر آئے تھے۔

عزیز: پوری بھی ہوئی تو کس طرح سے!

غالب کتاب ہٹا کر ذرا سے ہلتے ہیں اور پوچھتے ہیں۔

غالب: کون ہے بھئی!

کلو: کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔

غالب کتاب سرہانے دھر کر آہستہ آہستہ اٹھتے ہیں۔ کلو چلا جاتا ہے۔ غالب بمشکل چارپائی سے اتر کر نیچے فرش پر بیٹھتے ہیں۔

عزیز: حضور آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔

صاحب: ہم زیارت کے لیے آئے تھے کھڑے کھڑے چلے جائیں گے۔

غالب: (فرش پر بیٹھ کر) آنکھوں سے کسی قدر سوجھتا بھی ہے لیکن کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا۔ ذرا اونچے بولئے گا۔ سمجھ نہ سکا تو اس کاغذ پر لکھ دیجئے گا۔ کون صاحب ہیں!

صاحب: عزیز لکھنؤی ہیں۔ خواجہ عزیز لکھنؤی۔

غالب نہیں سنتا۔ کان پر ہاتھ دھرتا ہے۔

صاحب: لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے۔ دیدار کو دلی اتر پڑے۔ خواجہ عزیز لکھنوی۔

غالب: مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہو گے۔ کچھ اپنا کلام سناؤ۔

عزیز: ہم تو آپ کا کلام زبان مبارک سے سننے آئے تھے۔ آپ کے سامنے ہم کیا عرض کریں گے۔

غالب: دم واپسیں بر سر راہ ہے۔
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔

صاحب: حضور کا کلام زبان مبارک سے سننے کی کشش یہاں لے آئی۔ زحمت نہ ہو تو گداؤں کو بھی کچھ مرحمت ہو۔

غالب: (سمجھ کر)

دکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالب
دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

دونوں داد دیتے ہیں۔

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے

یہ دو رباعیاں پڑھ چکنے کے بعد ذرا توقف کرتے تھے۔ اور کہتے ہیں۔

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوس ناؤ نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

دماغ پر زور دے کر شعر بولتے ہیں۔

شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان وکف گلفروش ہے

(شعر بھولتے ہیں)

لطف خرام و ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

یہ سنا کر مرزا صاحب بڑے مجذوبانہ انداز میں یہ مصرعہ دہراتے ہوئے اٹھتے ہیں اور چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں۔

"اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے"

وہ دونوں اصحاب حیرت، بیچارگی اور حیرت سے ان کی طرف دیکھتے ہیں اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کر کے کمرے سے بغیر وہاں سے چل دیتے ہیں۔ کمرہ خالی ہے۔ کیمرہ میرزا پر جاتا ہے۔ اس وقت وہ نزع کی حالت میں لیٹے ہیں اور یہ شعر وردِ زباں ہے۔

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

کیمرہ ان کے چہرے سے ہٹ کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہے لیکن مرزا صاحب کے شعر کی آواز آتے جاتی ہے۔ کیمرہ دروازے میں کلو کو دکھاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں طشت ہے، جس میں آپ خورہ معجون اور عرق کی بوتل۔ غالب کے دوسرے مصرعے کی "عزیزو اب اللہ... اللہ... اللہ..." تک آواز آتی ہے پھر خاموشی۔ طشت اس کے ہاتھ سے گرتا ہے اور چیخ مار کر چارپائی کی طرف جاتا ہے۔

کلو: حضور مرزا صاحب... مرزا صاحب...!

سینے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ نبض دیکھتا ہے۔ آنکھیں بند کرتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ اس کی آواز پر مداری اور عنایت اندر آتے ہیں اور حضور مرزا صاحب قبلہ مرزا صاحب... کہہ کر رونے لگتے ہیں۔ مداری زمین پر بیٹھ کر ان کے پاؤں سے سر ملنے لگتا ہے۔ عنایت اندر بھاگتا ہے۔ کلیان ڈاک لے کر آتا ہے اور پریشان ہو کر میت کی طرف جاتا ہے۔ ان کے پاؤں کی طرف ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا اور ایک چھوٹا لفافہ ہے۔ وہ روئے جاتا ہے اور کہے جاتا ہے۔

کلیان: ہجور کلیان کمار کو چھوڑ گئے۔ مہراج آپ کا کمار کہاں جائے۔ مہراج آپ کا کمار کس اور جائے۔

ہاتھ باندھ کر اور ان پر سر رکھ کر نمسکار کرتے ہوئے پاؤں میں بیٹھ جاتا ہے۔ باقر علی خاں، حسین علی خاں، وفادار اور آخر میں امراؤ بیگم داخل ہوتی ہیں جنہوں نے چادر چہرے پر رکھی ہے۔

حسین علی، دادا جان... دادا جانی!

ان کی چھاتی سے لپٹ جاتا ہے۔

باقر علی، دادا جان، نوشہ دادا، نوشہ دادا، نوشہ دادا

پٹی پکڑ کر زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ وفادار روئے جاتی ہے۔ امراؤ بیگم خاموش سرہانے کھڑی ہیں۔ نہ آنکھ میں آنسو ہیں۔ نہ چہرے پر ملال۔ ضبط کی انتہا کئے کھڑی ہیں۔

کلو: (عنایت سے) نواب شیفتہ اور مولانا حالی کو اطلاع کرو کہ حضور کا انتقال ہو گیا۔

عنایت اٹھ کر جاتا ہے۔ کیمرہ اس کو فالو کرتا ہے۔ جب وہ امراؤ بیگم کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ اسی طرح چپ چاپ کھڑی ہیں۔ لواحقین کی ہلکی سسکیوں اور سسکیوں کے پس منظر میں غالب کی آواز ابھرتی ہے۔

آواز: میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں، میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں

کے کھانے کو چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہے ہیں۔

لاالٰہ الا اللہ لاموجود الا اللہ لاموثر فی الوجود الا اللہ

جب آواز اس فقرے پر پہنچتی ہے "کتوں، کوؤں اور چیلوں کو چھوڑ آئیں۔"

تو امراؤ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہیں اور آہستہ آہستہ بیٹھ کر میت کے سرہانے پر اپنا ماتھا رکھ دیتی ہیں۔

------فیڈ آؤٹ--------

بقیہ صفحہ

"یہ سلاست عبارت، یہ روانی مطالب، دیکھی نہ سنی سطریں کہ موتی کی لڑیاں ہیں۔ باتیں ہیں کہ مصری کی ڈلیاں ہیں۔"

اس سے ثابت ہوا کہ اردوئے معلٰی غالب کی نثر کی نمائندہ ہے۔ ان کے مکاتیب کی ادبی حیثیت کے علاوہ تاریخی حیثیت بھی ہے۔ انگریزی فوج کی کاروائیوں کے بعد دلی ویران ہوگئی تھی لکھتے ہیں۔

"اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں جاسکتا سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے، گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں، مجرم سیاست پاتے ہیں جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک یعنی پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے۔"

غرض غالب کی بے ساختگی اور بے تکلفی نے خطوط نویسی کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے غالب نے اردو نثر کے لیے اپنے خطوط کے ذریعے لازوال کارنامہ سرانجام دیا جو اردو نثر کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔

★

ایک دن مرزا صاحب فتح الملک بہادر سے ملنے ان
کے یہاں گئے اور جب غلام گردش میں پہنچے تو خدمت گار نے
صاحب عالم کو اطلاع دی کہ مرزا نوشہ صاحب آرہے ہیں
وہ کسی کام میں مشغول تھے اس لیے مرزا صاحب کو فوراً نہ بلا
سکے — مرزا صاحب کچھ دیر وہیں ٹہلتے رہے بعد میں صاحب
عالم نے پکار کر ملازم سے فرمایا کہ
"ارے مرزا صاحب کہاں ہیں —؟
مرزا غالب نے یہ سن کر وہیں سے جواب دیا۔
"غلام گردش میں ہے۔"
یہ سن کر صاحب عالم خود باہر تشریف لے آئے اور
خود مرزا صاحب کو اپنے ساتھ اندر لے گئے۔

غالب اور گوئٹے

حاجی لق لق

مجھ سے روایت کیا کامریڈ باری علیگ نے اور انھوں نے سنا اپنے دوست مرزا کاظم سے اور مرزا کاظم نے سنائی آپ بیتی اور اب آپ مجھ سے سنئے۔ "مرزا جی" میرے الفاظ میں۔۔۔ اور اس کا ثواب پہنچائیے غالب اور گوئٹے کی ارواح کو اور دعا کیجئے میرے حق میں اور واللہ اعلم بالصواب!

مرزا کاظم جن دنوں برلن میں تھے۔ ان ایام کا ذکر ہے کہ مرزا صاحب کی ملاقات ایک پنجابی سکھ پریتم سنگھ سے ہوئی اور دونوں تین چار روز تک ایک قہوہ خانہ میں ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ایک روز سردار جی نے مرزا صاحب سے کہا بھائی صاحب! بات یہ ہے کہ میں اٹلی جانا چاہتا ہوں اور میرے پاس پیسہ کوئی نہیں۔ اٹلی میں میرا مستقبل بہت شاندار ہو سکتا ہے اس لیے اگر آپ کچھ روپیہ بطور قرض دلا دیں تو میں یہ قرض جلد چکا دوں گا۔

مرزا کاظم نے ایک لمحہ بھر سوچنے کے بعد کہا۔ "قرض؟ سردار صاحب یہاں پردیس میں کون ایسا ہندوستانی فارغ البال ہو سکتا ہے جو اپنے اللے تللوں کے علاوہ کسی دوست کو قرض دے سکے؟"

سردار جی: مجھے کوئی زیادہ روپیہ نہیں چاہیے صرف......

مرزا صاحب: (بات کاٹ کر) جی کم زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بات یہ ہے کہ کسی سے ایسی درخواست کرنا ہی بے معنی چیز ہے۔"

سردار جی: (مایوسی کے لہجہ میں) تو پھر کیا کیا جائے؟

مرزا صاحب: کیا کیا جائے؟ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

سردار جی: (پرامید نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) وہ کیا۔ وہ کیا؟

مرزا صاحب: وہ یہ کہ ہندوستانیوں کی بجائے جرمنوں سے روپیہ حاصل کیا جائے جو بہت آسان کام ہے۔

سردار جی: وہ کیسے؟

مرزا صاحب: میں بالکل بتاؤں گا۔ آپ کل اسی وقت یہاں تشریف لے آئیے۔ سردار جی کی آنکھیں ان الفاظ کو سن کر چمک اٹھیں۔ اور آپ مرزا صاحب کا "پیشگی" شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

رات بھر سردار جی کو نیند نہ آئی اور دوسرے دن وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ پہلے ہی قہوہ خانے میں پہنچ گئے اور بے صبری کے ساتھ مرزا کاظم کا انتظار کرنے لگے۔ آخر مرزا آئے۔ اور قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔

مرزا صاحب: دیکھیے سردار جی! مرزا غالب ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ آپ جانتے ہی ہوں گے۔

سردار جی: وہی نا جنہیں انڈین شیکسپیر کہتے ہیں؟

مرزا صاحب: (مسکراتے ہوئے) نہیں نہیں! انڈین شیکسپیر تو آغا حشر کاشمیری مرحوم تھے۔ جو مشہور ڈراما نویس تھے۔

غالب ان سے پہلے عہد مغلیہ میں گزرے ہیں۔ آپ کا نام اسد اللہ خاں تھا اور وطن دہلی آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن عمر تنگ دستی میں گزری۔ آپ کو شراب نوشی کا بہت شوق تھا۔ اس لیے کبھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔

سردار جی: بالکل میرے چچا ہرنام سنگھ کی طرح ذیلدار تھا۔ دو سو بیگھ زمین تھی ضلع بھر میں عزت تھی لیکن شراب نے بیڑا غرق کر دیا۔ آج اسے کوئی دس روپے اودھار نہیں دیتا۔

مرزا صاحب: ہاں' ہاں بس غالب کی بھی یہی حالت تھی۔ لیکن تھا بڑا حیا دار مرگیا لیکن امرا کے سامنے نہ جھکا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ..... سردار جی سر تو ہلاتے جاتے تھے لیکن دل میں سوچتے تھے کہ بات تو جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی تھی۔ یہ مرزا صاحب غالب کا قصہ کیوں چھیڑ بیٹھے؟ آپ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مرزا کاظم نے ان کے دل کی بات کو بھانپ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ خاموشی سے سنتے جائیے۔

مرزا صاحب: غالب ایک فلاسفر شاعر تھے اور انھوں نے وہی زمانہ پایا جو جرمنی کے فلاسفر شاعر گوئٹے کو نصیب ہوا۔ گوئٹے بھی..... مرزا صاحب یہاں تک کہہ پائے تھے کہ سردار جی سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے بات کاٹ کر اپنی بات شروع کر دی۔

سردار جی: لیکن مرزا صاحب! جہنم میں جائیں غالب اور گوئٹے۔ آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ جرمنوں سے روپیہ حاصل کرنے کی ترکیب بتائیں گے۔

مرزا صاحب: بالکل درست اور میں وہی ترکیب تو بتا رہا ہوں۔ آپ ذرا سنتے جائیے۔ آپ ہندوستان کے بہت بڑے مورخ شاعر اور ادیب ہیں۔

سردار جی: میں اور شاعر؟

مرزا صاحب: بس آپ چپ رہیے اور میری بات سنئے آپ اتوار کے دن "ہو مبرگ ہال" میں ایک تقریر کریں گے جس میں آپ غالب اور گوئٹے کی شاعری کا موازنہ فرمائیں گے۔

سردار جی: یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ میں تو جرمن زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور نہ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے واقف ہوں۔

مرزا صاحب: آپ اردو زبان میں' اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو پنجابی زبان میں تقریر فرمائیے۔ بات صرف یہ ہے کہ بولتے جائیے۔ غالب اور گوئٹے کی شاعری سے آپ واقف نہیں تو ان کے نام تو چنداں مشکل نہیں۔ ذرا کہیے تو۔

سردار جی: غالب گوئٹے۔۔۔۔۔۔ غالب گوئٹے۔

مرزا صاحب: بالکل ٹھیک۔ آپ پاس ہو گئے۔ صرف اتنی بات ہے کہ غالب اینڈ گوئٹے کہیے۔ انگریزی زبان میں جسے ہم اینڈ کہتے ہیں۔ جرمن میں اسے انڈ کہا جاتا ہے۔

سردار جی: غالب اور گوئٹے۔۔۔۔۔۔ غالب انڈ گوئٹے

مرزا صاحب: واہ۔ وا خواب! اب آپ ہندوستان کے بہت بڑے سکالر ہیں کل برلن کے اخبارات میں اعلان شائع ہو

گا کہ ہندوستان کے مشہور سردار پریتم سنگھ اتوار کے دن بوقت شام ہو مبرگ ہال میں "غالب اور گوئٹے" کے موضوع پر ایک زبردست تقریر کریں گے داخلہ ٹکٹ کے ذریعہ ہو گا۔ وغیرہ۔

سردار جی: لیکن میں تقریر میں کہوں گا کیا؟

مرزا صاحب: جو جی میں آئے کہتے جائیے۔ بس بولتے جائیے اور ہر تین جملوں کے بعد "غالب اینڈ گوئٹے" کہتے رہیے۔

اتوار کی شام آ پہنچی۔ ہو مبرگ ہال جرمن "اہل ذوق" سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صدارت کی کرسی پر برلن کے ایک مشہور ماہر ادبیات جلوہ افروز تھے ان کے ایک طرف سردار پریتم سنگھ اور دوسری طرف مرزا کاظم بیٹھے تھے تقریر کا وقت آ گیا اور سردار صاحب تقریر کرنے کے لیے اٹھے۔ صاحب صدر سے اور حاضرین سے پروفیسر پریتم سنگھ کا تعارف کرایا۔ جس پر ہال خیر مقدم کی تالیوں سے گونج اٹھا۔

سردار صاحب نے اپنی تقریر شروع کی۔

صاحبان! مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلی کے رہنے والے تھے۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ شراب بہت پیتے تھے اس لیے ان کی عمر تنگدستی میں گزری۔ دہلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہے وہاں ایک گھنٹہ گھر بھی ہے چاندنی چوک میں سودا بیچنے والوں کی صدائیں بہت پیاری ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آتی ہیں----- غالب اینڈ گوئٹے-----

مجمع نے پر زور تالیاں بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا اور جب تالیوں کی گونج ختم ہوئی تو سردار صاحب نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

"دہلی سے تین سو میل کے فاصلے پر لاہور ہے۔ میں ضلع لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہمارا علاقہ بڑا زرخیز ہے پچھلے سال بارشیں کم ہوئی تھیں۔ اس لیے فصلیں اچھی نہ ہوئیں۔ اس سال گورو مہاراج کی کرپا ہے نہر میں بھی پانی خوب رہا اور بارشیں بھی اچھی ہو گئیں امید ہے کہ گیہوں کی فصل اچھی رہے گی۔ لاہور کی بہت سی چیزیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ شاً" بادشاہی مسجد" مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھ 'چڑیا گھر' عجائب گھر----- غالب اینڈ گوئٹے!"

پھر تالیوں سے فضا گونج اٹھی۔ اور صاحب صدر کے لبوں پر تبسم رقص کرنے لگا۔ آپ نے میز پر ہاتھ مار مار کر مقرر کی "جادو بیانی" کی داد دی۔ سردار صاحب نے اپنی حوصلہ افزائی ہوتی دیکھی تو ذرا زیادہ بلند آواز سے تقریر کرنے لگے۔ فرمایا:

غالب اینڈ گوئٹے کی بدقسمتی تھی کہ انہوں نے شری دربار صاحب امرتسر کے درشن نہ کیے۔ حتیٰ کہ وہ ضلع گوروداس پور بھی نہ جا سکے ورنہ وہاں کا گڑ کھا کر انہیں نانی سپنے یاد آ جاتی۔ ضلع امرت سر میں ایک گاؤں چھاپا دی ہے وہاں کے خربوزے بہت مشہور ہیں قصور کی میتھی بہت خوشبودار ہوتی ہے۔ غالب اینڈ گوئٹے کے کیا ہی کہنے۔ غالب اینڈ انڈیا اینڈ جرمنی!"

اس دفعہ سردار نے استاد کے بتائے ہوئے سبق "غالب اینڈ گوئٹے" پر "انڈیا جرمنی کا اضافہ کر کے کمال کر دکھایا اور ان الفاظ نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ تالیوں سے ہال گونج اٹھا سردار صاحب نے تقریر جاری رکھی اور دو تین فقرے کہنے کے بعد فرمایا کہ

"صاحبان اب غالب کے اشعار بھی سنئے"

اس مقام پر مرزا کاظم نے اٹھ کر حاضرین سے جرمن زبان میں کہا کہ پروفیسر پریتم سنگھ اب غالب کے چند اشعار سنائیں گے۔ سردار صاحب نے اپنے مخصوص قومی انداز میں یہ گانا شروع کر دیا۔

اساں نت دے

نی اساں دے شرابی رہنائی ہر نام کورے نارے اوہ دیچ کندہ کرلے

مرزا کاظم کرسی سے اچھل پڑے۔ جس پر حاضرین نے تالیوں سے فضا میں گونج پیدا کر دی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب نے ان اشعار کو بے حد پسند کیا ہے۔ سردار صاحب پھر بولے اسیں مرگئے۔

نی اسیں مرگئے کملیاں کر دے نی ہر نام کورے نارے اچے تیرے

بندے نہ بنے ہائے نی اسیں مرگئے۔

اس دفعہ بھی حسب معمول کافی داد ملی۔ لیکن داد کی حد تو اس وقت ہوئی جب سردار صاحب نے "غالب" کی وہ "مثلث" سنائی جس کا ٹیپ کا مصرعہ یہ تھا۔

موڑیں بابا ڈانگ والیا چھیتی

ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا۔ اور سردار پریتم سنگھ "مورخ" شاعر' اور ماہر ادبیات کی تقریر ختم ہوئی۔ اس کے بعد مرزا کاظم اٹھے اور انھوں نے نہایت فصیح جرمن زبان میں بیان کیا۔ کہ پروفیسر نے جس قابلیت کے ساتھ غالب اور گوئٹے کا موازنہ کیا ہے شاید ہی آج تک کسی نے کیا ہو کم از کم برلن میں تو ایسی تقریر آج تک نہ ہوئی ہو گی اور مجھے فخر ہے کہ میرے مالک نے پروفیسر صاحب جیسے آدمی پیدا کیے ہیں میں اس پوری تقریر کا ترجمہ کر کے برلن کے اخبارات میں شائع کراؤں گا۔ اور آپ دیکھیں گے کہ میرے وطن کے مایہ ناز ماہر ادبیات نے علم و فضل کے کیا دریا بہائے ہیں۔ میں آپ صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پروفیسر صاحب کے خیالات سننے کی تکلیف گوارا فرمائی۔ اس کے بعد صاحب صدر اٹھے اور انھوں نے پروفیسر صاحب اور مرزا کاظم کا شکریہ حاضرین کی طرف سے ادا کیا۔ اور جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا پھر کیا تھا۔ بڑے بڑے ادیب' شاعر' اخبار نویس اور رئیس سردار صاحب سے معانقہ کرنے کو لپکے۔ اور آپ کو بڑی مشکل سے ہال کے دروازے تک لیجایا گیا۔ اس رات کو مرزا کاظم' پروفیسر پریتم سنگھ کو ٹرین پر سوار کرانے کے لیے اسٹیشن تک لے گئے اور دونوں کی جیبیں نوٹوں سے پر تھیں۔

★

ایک بار دلی میں [illegible]
مرزا صاحب مولانا فیض حسن فیض سہارن پوری کے ہمراہ
واپس آ رہے تھے راستے میں ایک تنگ [illegible] گلی سے
گزر رہے تھے [illegible]
فیض نے [illegible]
"مرزا صاحب [illegible]
مرزا صاحب نے بے ساختہ کہا۔
"نہیں صاحب [illegible]
مولانا فیض الحسن فیض [illegible]
ہو رہے۔

★

[illegible]

۵۹ - [illegible]

غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں

کنہیا لال کپور

دور جدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالب کا انتظار کیا جا رہا ہے اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر جدید شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً "م ن ارشد میراجی" ڈاکٹر قربان حسین خالص" میاں رفیق احمد خوگر" راجہ عہد علی خاں" پروفیسر حفیظ احمد غیظ" کرپاجیت ورما" عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ یکایک مرزا غالب داخل ہوتے ہیں ان کی شکل و صورت بعینہ وہی ہے جو مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں بیان کی ہے۔ ان کے ہاتھ میں "دیوان غالب" کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہو کر آداب بجالاتے ہیں)

غالب: حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدت سے آرزو تھی کہ دور جدید کے شعرا سے شرف نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر: یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

غالب: رہنے بھی دیجئے اس بے جا تعریف کو۔ من آنم کہ من دانم۔

دوسرا شاعر: تشریف رکھیے گا۔ کہئے جنت میں خوب گزرتی ہے۔ آپ تو فرمایا کرتے تھے۔ ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالب: (مسکرا کر) بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے۔ جب سے وہاں گیا ہوں۔ ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر: تعجب! جنت میں تو آپ کو کافی فراغت ہے۔ اور پھر ہر ایک چیز میسر ہے۔ پینے کو شراب۔ انتقام لینے کو پری زاد۔۔۔۔ اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اودھار

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ.....

تیسرا شاعر: (بات کاٹ کر) سنائیے اقبال کا کیا حال ہے۔

غالب: وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا۔ وہی پرانی بحث

مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

پہلا شاعر: میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے۔ اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر: میں کرسی صدارت کے لیے جناب م۔ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسی صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرین مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م۔ ن۔ ارشد: میرے خیال میں ابتدا مرزا غالب کے کلام سے ہونی چاہیے میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالب: بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م۔ ن۔ ارشد: معاف کیجئے گا مرزا۔ اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں جائے گی شمع کی بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے۔ اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالب: بہت اچھا صاحب تو غزل سنئے گا۔

باقی شعرا: ارشاد۔

غالب: عرض کیا ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔ مرزا حیران ہو کر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالب: اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے۔ نہ داد نہ تحسین۔ اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر: معاف کیجئے مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالب: بے معنی؟

میرا جی: دیکھئے نا مرزا آپ فرماتے ہیں۔ خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔ اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا۔ اور اگر آپ صرف معشوق کے نام کے ہی عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور سادہ کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجئے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص۔ میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں۔
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمہارے نام کے

غالب: یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیراجی: جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔
غالب: ہاں' ہاں۔ بڑے شوق سے۔

جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالب: (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔
م۔ ن۔ ارشد: اب مرزا' غزل کا دوسرا شعر فرمایئے۔
غالب: میں اب مقطع ہی عرض کروں گا۔ کہا ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ۔ گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔
غالب: کس طرح؟
عبدالحی نگاہ:

عشق نے ہاں ہاں تمہارے عشق نے
عشق نے سمجھے! تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں

جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکما کر دیا
اتنا تمہارے عشق نے
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمہارے عشق نے
اتنا نکما کر دیا۔

غالب: (طنزاً) بہت خوب۔ بھئی غضب کر دیا۔

فیض احمد فیض: اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا تھا۔

جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمہارے عشق نے
مجھ کو نکما کر دیا۔

غالب: واللہ۔ کمال ہی تو کر دیا بھئی۔ اب آپ لوگ اپنا اپنا کلام سنائیں۔

م۔ ن۔ ارشد: اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص: ابی ارشد صاحب میں کیا کہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگ میل۔ اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھئے۔

م۔ ن۔ ارشد: توبہ توبہ! اتنی کسر نفسی۔ اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں۔ نظم کا عنوان ہے " بدلہ" عرض کیا ہے۔

آمری جان میرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرم شب تاب کی مانند چمک اٹھتی ہے

ایسی تشبیہ کی لذت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند

دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں

آ مری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارض گلفام ترا
اور ارباب وطن کو یہ اشارہ کر دوں
اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گزر جانے پر
بہر جمع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ میرا جی کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے، بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی، بھوت اور دفتر تہذیب، تمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں)

(حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیر لب مسکراتے ہیں)

غالب: ارشد صاحب معاف کیجئے آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

فیض احمد فیض: یہ صرف ارشد پر ہی کیا منحصر ہے۔ مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م۔ ن۔ ارشد: مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجئے۔

پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو

پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

اب بتائیے اس شعر کا کیا مطلب ہے؟

غالب: (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں۔ مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م۔ ن۔ ارشد: (جی چھوڑیئے اس حرف گیری کو۔ آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں۔ مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص: میری نظم کا عنوان ہے "عشق" عرض کیا ہے۔

عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا
عشق اک طوفان ہے
عشق ایک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلہ جوالہ---- عشق
عشق ہے پیغام موت

غالب: بھئی یہ کیا مذاق ہے۔ نظم پڑھیے۔ مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص: (جھنجلا کر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے؟ یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم اور فرمایا تھا آپ نے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالب: میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ یہ کس قسم کی نظم ہے۔ نہ ترنم' نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص: مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا ہم نے اس کے خلاف جہاد کر کے اسے آزاد کیا ہے اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعت تخیل۔ تازگی افکار اور ندرت فکر سے ہے۔

غالب: رفعت تخیل۔ کیا خوب کیا پرواز ہے

میں نے اک عاشق سے پوچھا' اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص: (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالب: مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر: اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعر و ادب میں بھی آزادی کا جویا ہے اس کے علاوہ دور جدید کی روح۔ انقلاب۔ کشمکش تحقیق۔ تجسس۔ تعقل پرستی اور جدوجہد ہے ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے۔ اور میرے اس نکتے کو ٹھیکرے نے بھی اپنی کتاب وینٹی فیئر میں تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اسی لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کر سکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب و لطائف کا شمار۔

غالب: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م۔ ن ارشد: خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو' ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے یہ بھوک' بیکاری' انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن و عشق گل و بلبل' شیریں فرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔ شاعری کے لیے اور بھی موضوع سخن ہیں۔ جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا۔

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی ہے
ہم پہ کیا گزرے گی۔ اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے۔

راجہ عہد علی خاں: بہت خوب ہے یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضمون ہوں گے ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے۔ جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ موضوع ہے۔

غالب: ڈاک خانہ؟

راجہ عہد علی خاں: مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے سنئے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل

ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو لندن کو کوہ قاف کو
دیکھنا۔ آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خد و خال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم

اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں
کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا بھئی کمال کر دیا' کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراسیمگی ہر لحہ بڑھتی جا رہی ہے)

م۔ ن۔ ارشد: اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ: میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی: تو پھر وہی نظم سنا دیجئے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ: آپ کی مرضی تو وہی سن لیجئے۔ عنوان ہے "لگائی"

فون پھر آیا دل زارا نہیں فون نہیں

سائیکل ہو گا' کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمہ و دنبالہ وار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو'
اب یہاں کوئی نہیں' کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی وہ طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م۔ن۔ ارشد: حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے ملک کے اپنی فاشست جذبے کو خوب نبھایا۔

رفیق احمد: (سرگوشی کے انداز میں میراجی سے) بکواس ہے!

م۔ن۔ ارشد: اب میراجی اپنا کلام پڑھیں گے۔

میراجی: میری نظم کا عنوان ہے۔ "بینگن"

غالب: بینگن؟

میراجی: بیگن۔ اگر آپ آم کی صفت میں قصیدہ لکھ سکتے ہیں تو کیا بندہ بینگن پر نظم لکھنے کا حقدار نہیں۔

غالب: معاف کیجئے گا نظم پڑھیے۔

میراجی: عرض کیا ہے۔

چنچل ۔ بینگن کی چھب نیاری
رنگ میں تم ہو کرشن مراری
جان گئی ہیں سکھیاں ۔پیاری
رادھا رانی آ ہی گئی تو---
کرشن کنہیا ڈھونڈ رہے ہیں
لیکن میں تو بھول چکا ہوں
بینگن سے یہ بات چلی تھی
بھوک لگی ہے کتنی ہائے
جی میں ہے اک بھون کے بینگن
کھاؤں لیکن رادھا پیاری
رنگ کو اس کے دیکھ کے مجھ کو
یاد آتے ہیں کرشن مراری
اس لیے بھوکا رہنا بہتر---
چونکہ میں ہوں پریم پجاری

(ہر طرف سے واہ دی جاتی ہے۔ بعض شعراء یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ بھئی جدید شاعری میراجی ہی کا حصہ ہے)

م۔ن۔ ارشد: اب جناب بکرماجیت صاحب ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں۔

بکرماجیت ورما: میں نے حسب معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالب: (حیران ہو کر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں۔ میرے اللہ دنیا کدھر جا رہی ہے۔

بکرماجیت ورما: مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیئے گئے تھے۔ دور جدید کے شعراء نے انہیں ایک قابل عزت صنف کا درجہ دیا ہے۔

غالب: جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں۔ بھانڈ' میراسی یا اس قماش کے اور لوگ گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما: پہلا گیت ہے "برہن کا سندیس" عرض کیا ہے۔

اڑ جا دیس بدیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس۔

سن کر تیری کائیں کائیں

غالب: خوب۔ سن کر تیری کائیں کائیں

بکرماجیت ورما: عرض کیا ہے۔

سن کر تیری کائیں کائیں

آنکھوں میں آنسو بھر آئیں

بول یہ تیرے من کو بھائیں

مت جانا پردیس رے کوے اڑ جا دیس بدیس

م۔ ن۔ ارشد: بھئی۔ کیا اچھوتا خیال ہے پنڈت صاحب' میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سنا دیجئے۔

بکرماجیت: سنئے پہلا بند ہے بول کبوتر بول!

دیکھو کوئلیا کوک رہی ہے

من میں میرے ہوک اٹھی ہے

کیا تجھ کو بھی بھوک لگی ہے

بول غٹرغوں بول۔ کبوتر

بول کبوتر بول

باقی شعرا: (ایک زبان ہو کر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس اثنا میں مرزا غالب نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرماجیت ورما: اب دوسرا بند سنئے۔

بول کبوتر بول

کیا میرا ساجن کہتا ہے

کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے

کیوں میرے طعنے سہتا ہے

بھید یہ سارے کھول۔ کبوتر

بول کبوتر بول

باقی شعرا: (ایک زبان ہو کر) بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول کبوتر۔ بول۔

(اس طور وغل کی تاب نہ لا کر مرزا غالب بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

غالب کے حالات میں پہلا مضمون؟

سید مسعود حسن رضوی

منشی بال گوبند ماتھر نے آگرہ سے ایک ماہوار رسالہ "ذخیرۂ بال گوبند" کے نام سے ۱۸۶۸ء کی ابتداء میں جاری کیا۔ منشی صاحب دہلی گزٹ پریس، آگرہ کے دفتر میں کلرک تھے۔ خود ان کا بھی ایک مطبع تھا آگرہ اردو اخبار پریس اور اس کے مہتمم، پرنٹر اور پبلشر وہ خود ہی تھے، یہ مطبع آگرہ کے محلے پیپل منڈروی میں واقع تھا "ذخیرۂ بال گوبند" اسی مطبع میں بہت بڑی تقطیع کے ۴۸ صفحوں میں چھپتا تھا۔ اس کا چندہ سالانہ چھ روپے اور محصول ڈاک بارہ آنے تھا۔ اس رسالے کے تیس پرچے میرے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان میں سے پہلا پرچہ مارچ ۱۸۶۸ء کا اور آخری دسمبر ۱۸۷۰ء کا ہے۔ رسالے کے مضامین کی نوعیت کا اندازہ سرورق کی حسب ذیل عبارت سے کیا جاسکتا ہے:

> "ذخیرۂ بال گوبند مشتمل برجمیع علوم و فنون و تحقیقات ہر قسم و رائے و تقاریر و معرفتِ الٰہی و عجائبات روزگار و حالات دلچسپ و قصص رنگین و لطائف و ظرائف و مراسلات و غزلیات شعرائے حال مع نقشہ جات و تصاویر۔"

اس رسالے کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں مرزا غالب کے متعلق ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان ہے "مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ" غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۸ء کو واقع ہوئی۔ اس سانحے کے صرف چند روز بعد یہ مضمون لکھا گیا اور غالباً مرزا غالب کے حالات میں یہ پہلا مضمون تھا جو کسی رسالے میں شائع ہوا، اس مضمون سے غالب کے متعلق ہماری معلومات میں کچھ اضافہ بھی ہوتا ہے۔ (اب اسے ایک صد انتیس سال بعد پھر شائع کیا جارہا ہے۔)

مرزا اسد اللہ خاں متوفی المتخلص بہ غالب و نوشہ

یہ شخص شہر دہلی میں ایک بڑا نامی گرامی شاعر فارسی کا تھا، اگرچہ اشعار اردو، بھی اس کے بہت ہیں مگر زیادہ تر شہرت فارسی میں حاصل تھی۔ ممالک مغربی ہند کے پڑھے لکھوں میں کم شخص ہوں گے جنھوں نے اس کے شعر اردو و فارسی کے پڑھے یا سنے نہ ہوں گے۔ کلام میں تخلص اپنا کہیں اس نے غالب اور کہیں نوشہ لکھا ہے۔ اگرچہ نام اسد اللہ خاں تھا مگر دہلی اور دیگر اضلاع میں عموماً لوگ مرزا نوشہ کہا کرتے تھے۔

اس کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ سلسلہ اس کے خاندان کا افراسیاب بادشاہ ترکستان سے مسلسل تھا۔ ابتداء میں اس نے اور اس کے بزرگوں نے جو دولت، ملکیت اور اختیارات پائے بہ فن سپہ گری و جوہر شمشیر پائے۔ علم فارسی اس نے بامید روزگار تحصیل نہیں کیا تھا، اپنے دلی ذوق سے سیکھا تھا۔ موزونی طبع کے باعث طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی۔ علاوہ ناظم ہونے کے ناثر بھی تھا۔ نثر میں سات کتابیں اس کی تصنیف و تالیف کی ہوئی زیادہ معروف ہیں اور بہت سی چھپ بھی گئی ہیں نام اور مطالب

ان کے یہ ہیں یعنی :

۱۔ دیوان فارسی۔ اس میں تخمیناً دس ہزار شعر ہیں۔

۲۔ دیوان ریختہ' یہ دیوان اردو' نہایت مختصر ہے۔

۳۔ مہر نیمروز' یہ تاریخ خاندان تیموریہ کی نثر میں ابتدائے زمانہ ہمایوں شاہ سے تا بہ عہد بہادر شاہ خارج شدہ بادشاہ دہلی تخص ظفر ہے۔

۴۔ دستنبو' اس میں ایام غدر ۱۸۵۷ء کی تباہی اور بربادی اپنی کا حال نثر میں قلم بند کیا ہے اور عبارت میں کوئی لفظ عربی کا نہیں لایا ہے۔

۵۔ پنج آہنگ' اس کتاب میں اپنے خطوط' دیباچے' خاتمے کتب کے' اصطلاحی محاورے' قواعد فارسی' اغلاط اور مصادر درج کیے ہیں۔

۶۔ اردوے معلی' اس صحیفے میں اکمل المطابع واقع دہلی کے مہتمم نے اردو زبان کے رقعات ان کے جمع کر کے یہ نام رکھا ہے اور انہیں کے یہاں شاید چھپ بھی رہے ہیں۔

۷۔ قاطع برہان' یہ تبدیلی نام درفش کاویانی' اس میں برہان قاطع مشہور کتاب لغت کے مولف کی غلطیاں ظاہر کی ہیں۔ لکھا ہے کہ سوائے ان کتابوں کے اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور رسالے اس کے موجود ہیں مگر اس قدر مشہور نہیں ہیں اور نہ ہنوز معرض طبع میں آئے ہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیور اسلام اتار کر حلیہ فرہنگین سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہب نو اختیار کا اور کیفیت فرہنگین ہوس کی دعوے دے کر بھی دریافت کی پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا۔ یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو (یہ کرامت اور وصف اس مذہب کا خاص مشہور ہے) مے پرستی کا ایام شباب سے تا بہ عالم پیری شوق تھا۔ جس وقت عالم سرور اور ون ابر کا ہوتا' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی' روش باغ میں سیر چمن و گلگشت گلشن کرتا ہوتا تھا' اس وقت طبیعت ور تماشائے دلکش و گلہائے رنگین کو خیابانوں میں طراوت بخش ملاحظہ کر کر لہرایا کرتی تھی۔ بعد وفات مرزا ذوق' نامی گرامی شاعر اردو' ملک الشعرا خطاب' استاد بہادر شاہ کے یہی مورد عنایات سلطانی رہا کرتا تھا اور غزل بھی اس کی دیکھا کرتا تھا۔

اخیر میں ان دنوں کہ زمانے میں طفیل سرکار دو تمدار انگلشیہ کے علم و ہنر کی ترقی اور رواج بہت ہے تو اکثروں نے واقف ہو کر ان کے نظم و نثر کلاموں پر بیشترے اعتراض کیے اور وہ اخباروں میں شائع ہوئے تھے' جوابات بھی ان کے اسد اللہ خاں کی طرف سے اکثر درج کیے جاتے تھے۔ بہت سے قیل و قال ہوتے تھے۔ ان میں بڑا عذر اس شخص کا یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ میں نہایت ضعیف ہو گیا ہوں' حواس باختہ اور خاطر پریشان رہتی ہے' بدن میں ضعف ضعیفی غالب ہے' سامعہ سے عاری ہوں' ہاتھ پاؤں کام کم کرتے ہیں' آدمی کی صورت نہیں پہچانتا' آواز کم سنائی دیتی ہے' جو کوئی بروقت ملاقات بات کیا چاہتا ہے' لکھ کر دیتا ہے اور اس کا جواب تحریری لیتا ہے' کاغذ قلم دوات' چاقو قلم دان بستہ ہر وقت پیش نظر رہتے ہیں' خور و نوش کے ہضم کی قوت نہیں' زندگی کا لطف نہ رہا' موت نزدیک معلوم ہوتی ہے' اگر چند روز مرمر کے جیسے تو کیا جیسے' اب قابل معافی ہیں اور واقع میں یہ جواب اس کا معقول تھا۔

کہتے ہیں کہ آدمی اچھا، خوش مزاج، یار باش، خوش وضع، خوش انداز، جلیل القدر، حسب و نسب میں اعلیٰ ملکوں میں نامور اور شاعر اور منشی قابل تعریف تھا۔ دم اس کا بھی غنیمت تھا۔ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا اور ۱۲۸۵ء میں ۷۳ برس کی عمر پاکر روضہ رضوان میں جاگزیں ہوا، جس نے سنا اس کے مرنے کا افسوس کیا۔ لیکن جب تک اس کا کلام، جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے، روے زمین پر قائم رہے گا۔ وہ زندہ تصور کیا جائے گا اور نام اس کا یادگار رہے گا، اب ہماری بھی یہی دعا ہے کہ غفور الرحیم اس کی مغفرت کرے۔

شاعروں نے جو تاریخیں اس کی وفات کی نکالی ہیں ان میں سے ایک تاریخ ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

قطعہ تاریخ

طبعزاد مولوی محمد حسین آزاد شاگرد رشید محمد ابراہیم خاں ذوق دہلی

بلبل باغ پہلوی و دری
اسداللہ غالب و نوشہ
فکر تش جاں نواز و جانش پاک
نقش روشن و دلش آگہ
سنجش کان گوہر افکار
نظم و نثرش تمام نقد سرہ
غالب آں شیر بیشہ معنی!
صید مضموں شکارا و چوبرہ
بہ ظہورش خفا ظہوری را
اسدی در مقابلش روبہ
عنصری پیش اوست بے جوہر
عجدی بردہ برورش سجدہ
..عروسی بکر ہائے سخن
نی المثل پیر زاہدے نوشہ
رخت بربست چوں ز دار کہن
نظم مضموں شدست آوارہ
جگر بحر آب شد بہ غمش

دل تقطیع گشت صدپارہ
او بپے سال رحلتش آزاد
ہاتف غیب گفت و زد نعرہ
شدہ مغفور از خداے غفور
کہ بود سال فوت او "غفرہ"

(احوال غالب مرتب پروفیسر مختار الدین احمد، ص ۲۶)

مرزا غالب کا نسب نامہ

خواجہ قمرالدین راقم

اس بندۂ خاکسار بے بضاعت خواجہ قمرالدین راقم نے جب شرح دیوان غالب ختم کرلی اور ہر شعر کے معنی بخوبی و خوش اسلوبی حل کر لیے' اس وقت خیال آیا کہ مرزا غالب کا اور اپنے بزرگوں کا نسب بھی خاندانی ظاہر کرنا ضرور ہے تاکہ خاص و عام پر روشن و مبرہن ہو کہ غالب کون تھے اور کیا تھے اور ان کے خاندانی بزرگ کس مرتبے کے تھے اور راقم سے غالب کا سلسلہ نسب کیا ہے' اس سبب سے اس فقیر بے ملیہ نے بزرگوں کا حق خدمت اپنا فرض منصبی سمجھ کر ادا کیا کہ تا دور عالم ان کی یادگار میں قائم رہے۔ اگرچہ مولوی الطاف حسین حالی نے اپنی تصنیف "یادگار غالب" میں استاد کا نسب بہ اختصار لکھا ہے مگر وہ بھی ادھورا' استاد کی زبانی سنا سنایا لکھا ہے کس لیے کہ نسب کا پورا حال غالب کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوئے اور ان کے اب و عم ان کی طفلی میں مرگئے تھے اور خاندانی شجرہ راقم کے دادا خواجہ مرزا حاجی خاں کے پاس تھا جو رشتے میں غالب کے بھائی ہوتے تھے اور غالب کی پرورش وہی کرتے رہے۔ غالب نے جس قدر بھائی کی زبانی سنا تھا جابجا اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے اور اپنی نسل فریدوں کی نسل میں بیان کی ہے' اس میں کچھ شک نہیں کہ غالب کے اور ہمارے بزرگ سلاطین توران میں تھے۔ غالب کی اور ہماری یک جدی نسل ہونے سے یہ بیان ہرگز غلط نہیں ہے کس لیے کہ وہ شجرہ راقم کی نظر سے عہد طفلی میں گزرا ہے اور راقم نے اکثر اپنے عم بزرگوار کی زبان سے بھی خاندانی نسب کا حال سنا ہے لہٰذا وہ احوال جس قدر کہ میرے لوح سینہ پر نقش ہے نوک ریز قلم کیا جاتا ہے:

واضح ہو کہ ہماری اور غالب کی اصل نژاد سلاطین توران میں ہے جس زمانے میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ بیخ بنیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس طوائف الملوکی میں جابجا منتشر ہو گئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا۔ چنانچہ کوئی سو پچاس پشت کے بعد اس خاندان میں دو برادران حقیقی جن کا نام راقم کو یاد نہیں' ان کی اولاد میں دو فرزند تولد ہوئے' بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بھائی کا بیٹا رستم خاں تھا۔ ہنوز یہ دونوں بھائی عمر شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہو گئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاع سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں' میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سرزمین ترکستان میں نور اسلام مثل پرتو خورشید منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی شرف اسلام سے فیضیاب ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کرلیا ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے یعنی ایک فرزند کا نام نصراللہ بیگ خاں دوسرے کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی۔ ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی مگر رستم خاں بھائی کے غم میں بدخشاں میں نہ رہے' بخارا میں آگئے' یہاں آکر تھوڑے عرصہ کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگان چشت میں جو خواجہ عبیداللہ احراری کی نسل میں تھا بیاہے گئے۔ ان کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ ہنوز قطب الدین خاں سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین گزر گئے اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے' یہاں سے سلسلہ ذات ہمارا اور غالب کا جدا ہوگیا۔ رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اسی خاندان میں عقد ہوا۔ ان کے ہاں ایک فرزند خواجہ

حاجی خاں تولد ہوکے ان کی عمر قریب بلوغ کے پہنچی تھی کہ والدین کا انتقال ہوگیا۔ یہ خبر سن کر نصراللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں مع اپنی بہنوں کے بھتیجے کے پاس بخارا میں آئے۔ کچھ دن بھتیجے کے شریک حال رہے پھر بھتیجے سے راز دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان جائیں اور سرکار شاہی میں ملازمت کریں، تم کیا صلاح دیتے ہو۔ خواجہ حاجی خاں جو کہ نوجوان سپاہی پیشہ تھے ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک ہوگئے کہ اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ غرض کہ یہ چچا بھتیجے مع متعلقین کسی قدر جمعیت ذاتی ہمراہ لے کر بخارا سے روانہ ہوئے۔ اول سمرقند میں آئے۔ وہاں ایک امیرزادہ شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چغتا سے ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں سفر کا ذکر آگیا۔ مرزا جیون بیگ خاں بھی چلنے کو تیار ہوگئے اور مع اپنی زوجہ امیرالنساء خانم کے، ہمراہ ہولیے۔ غرض یہ ولایتی قافلہ زن و مرد ہندوستان میں آیا اور شہر شاہ جہاں آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم کی سلطنت کا تھا اور ملک کی حالت نہایت ابتر تھی۔ بنگالہ کا ملک انگریزوں کے قبضے میں تھا اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دبالیا تھا۔ ادھر قوم مرہٹہ ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ وزیر سلطنت تھے مگر بدنظمی رفع نہ ہوتی تھی۔ یہ تازہ وارد ولایتی قافلہ وزیراعظم سے ملا۔ وزیر ان سے مل کر بہت خوش ہوا اور ان سب کو نوکر رکھ لیا اور ان کی بسر اوقات کے لیے ایک پرگنہ پہاسو جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے جاگیر میں دیا اور کسی قدر شاہی فوج بھی مقرر کردی کہ مرہٹوں کی روک تھام کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ شاہی ملازم رہا۔ ہنوز کوئی کار نمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں وزیراعظم سے کسی بات پر بگاڑ ہوگیا۔ یہ سب مغل زادے نوکری چھوڑ کر اکبر آباد چلے آئے۔ وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ راؤ سندھیا نے ان کا حال سن کر اپنے پاس بلالیا اور نوکر رکھ لیا۔ نصراللہ بیگ خاں کو پورے کمپو کا افسر کیا اور خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری پلٹن کی کمیدانی مرزا جیون بیگ خاں کو ملی۔ نصراللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عبداللہ بیگ کو گھر پر چھوڑا تھا کہ متعلقوں کی نگرانی کریں۔ دوسرے مرزا عبداللہ بیگ نہایت متقی عبادت گزار تھے۔ خود بھی گھر پر رہ گئے۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی شورش زیادہ ہوئی۔ نواب نجف خاں نے انگریزوں سے مدد چاہی کہ مرہٹوں کی سرکوبی کرو۔ انگریز یہ وقت ہی دیکھتے تھے۔ فوراً رضا مند ہوگئے اور فوج لے کر گوالیار پر یورش کردی۔ خوب جنگ ہوئی مگر کچھ کام نہ نکلا۔ آخر انگریز اپنی حکمت عملی کو کام میں لائے۔ بخشی بھوانی شنکر فوج مرہٹہ کے بخشی کو جو اضلاع دہلی کا رہنے والا تھا لالچ دے کر توڑ لیا۔ فوج کو بیدل کردیا۔ فوج حملے سے باز رہی مگر ان مغلوں کی فوج مقابلہ میں ڈٹی رہی۔ انگریزی فوج کو بڑھنے نہ دیا۔ مجبور ہو کر جنرل لکاف لیک کمانڈر انچیف نے مغلوں سے بھی پیام سلام جاری کیے۔ ادھر بخشی نے بھی ان کو روکا۔ جب مغل زادوں نے یہ صورت دیکھی کہ کل فوج بیدل ہوگئی کام نہیں دیتی، ہماری قلیل فوج کہاں تک مقابلہ کرے گی۔ ناحق جان دینے سے کیا فائدہ۔ یہ سب بخشی کے پاس گئے اور گفتگو کی۔ بخشی نے کچھ توجہ نہ کی۔ پھر یہ سب راجہ کے پاس گئے۔ بمشکل وہاں تک رسائی ہوئی۔ راجہ کو نشیب و فراز سمجھائے۔ راجہ شراب میں بدمست پڑا تھا جواب دیا کہ جاؤ بخشی سے کہو، وہ جو حکم دے اس کی تعمیل کرو۔ مغل یہ جواب سن کر ناراض ہوئے اور استعفا دے کر چلے آئے، اور فوج سے علیحدہ ہو کر اکبر آباد آگئے۔ انگریزی افسر کو اطلاع کردی لو ہم تو جاتے ہیں، ملک خالی ہے قبضہ کرلو۔ اب کیا تھا انگریزوں نے ملک پر قبضہ کرلیا راجہ کا نشہ ہرن ہوگیا۔ چار و ناچار اطاعت قبول کرلی۔ کمانڈر انچیف تاج بخشی کرکے چلا آیا۔ ان مغلوں نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ایک عرصہ کے بعد نصراللہ بیگ خاں نے دہلی میں آکر اپنا عقد نواب احمد بخش خاں کی بہن سے کیا اور پھر اکبر آباد میں آگئے مگر ان کی زوجہ تھوڑی مدت جی کر مرگئیں۔ پھر نصراللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کا عقد

مرزا غلام حسین بیگ اکبر آبادی کی بیٹی سے کیا' اس کے شکم سے دو فرزند ایک اسد اللہ خاں دوسرے یوسف بیگ خاں پیدا ہوئے۔ یہ دونوں اس وقت اپنے نانا کے گھر میں پرورش پاتے تھے۔ اس اثناء میں مرزا عبداللہ بیگ پر ایک ناگہانی واقعہ گزرا اور وہ فوت ہوگئے' جس کا ذکر باعث طول ہے۔ لہٰذا قلم انداز کیا۔ اسی زمانے میں سرکار انگریزی کو پھر فراہمی فوج کی ضرورت ہوئی کہ جاٹ کی قوم نے بغاوت شروع کر دی تھی۔ کمانڈر انچیف نے مرزا نصراللہ بیگ خاں کو بلا کر کہا کہ تمہاری شجاعت اور بہادری ہم پر خوب روشن ہے' ہم تم کو فوج دیتے ہیں تم ہمارے ساتھ بھرت پور پر یورش کرو اور فیروز پور میوات کی طرف جاکر مورچہ قائم کرو اور رسد کا انتظام کرتے رہو' ہم نے سرکار الور کو بھی اطلاع دی ہے وہاں سے احمد بخش خاں وکیل راج رسد کا بندوبست کریں گے۔ چنانچہ کمانڈر انچیف نے ایک بڑے کمپو کا افسر نصراللہ بیگ خاں کو کیا اور عہدہ رسالداری خواجہ حاجی کو دیا اور ایک پلٹن کا کمیدان مرزا جیون بیگ خاں کو کیا۔ یہ مغل حسب الحکم فیروز پور میوات آئے اور مورچہ قائم کر دیا ادھر بختاور سنگھ راجہ الور نے معرفت احمد بخش خاں اپنے وکیل کے رسد کا بندوبست کر دیا اور فوج سے بھی مدد دی۔ آخر انگریزی فوج نے اکبر آباد سے بھرت پور پر یورش شروع کی۔ ادھر نصراللہ بیگ خاں بھرت پور کے شمالی سمت سے حملہ کرتے تھے ادھر احمد بخش خاں مغربی علاقہ کو تاراج کر رہے تھے۔ غرض سب سے پہلے شمالی سمت بھرت پور کی نصراللہ بیگ خاں نے فتح کرلی پھر انگریزی فوج نے شہر پر قبضہ کرلیا۔ راجہ نے اطاعت قبول کی۔ بعد فتح ہونے بھرت پور کے انگریزی فوج اکبر آباد واپس آگئی۔ اب انگریزوں نے دیکھا کہ راجپوتانہ بالکل فتنہ و فساد سے پاک ہے۔ اس وقت جدید فوج کو موقوف کر دیا اور نصراللہ بیگ خاں کو اس فتح کی خیر خواہی کے سلسلے میں دو پرگنہ سونک سونسا اور پونہ ہانہ ہوڈل' پلول کے علاقہ میں پانچ ہزار روپے سالانہ آمدنی کے ۱۸۰۱ء میں نسلاً" بعد نسل جاگیر میں عطا کیے اور مرزا جیون بیگ خاں کے سو روپے ماہانہ نقد پنشن مقرر کی اور اسی زمانہ یعنی ۱۸۰۵ء میں احمد بخش خاں کو .صلہ خیر خواہی پانچ لاکھ کا مالک فیروز پور جھرکہ علاقہ میوات دے کر رئیس خود مختار کیا اور الور کی سرکار سے بھی ایک پرگنہ لوہارو ایک لاکھ کی آمدنی کا اسی خیر خواہی میں احمد بخش خان کو ملا تھا۔ نصراللہ بیگ خاں چند سال زندہ رہے مگر چھوٹے بھائی کے غم میں تحلیل ہوگئے تھے۔ آخر عمر نے وفا نہ کی انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد خواجہ حاجی خاں ان کے بھتیجے یعنی راقم کے حقیقی دادا نصراللہ بیگ خاں اپنے چچا کی اولاد اور متعلقین کی سرپرستی کرتے رہے۔ اس وقت مرزا اسد اللہ خاں کی عمر نو برس کی تھی اور یوسف بیگ خاں پانچ برس کے تھے ایک ایرانی اہل فضل و کمال ان کو تعلیم دیتا تھا۔ بعد وفات نصراللہ بیگ خاں کے مرزا خواجہ حاجی خان نے اپنے چچا کی جاگیر کا استغاثہ کیا۔ احمد بخش خاں نے بھی سفارش کی۔ سرکار نے وہ جاگیر بدستور خواجہ حاجی خاں کے نام نسلاً" بعد نسل مقرر کر دی اور عہد نامہ میں لکھ دیا کہ یہ جاگیر بعد نصراللہ خاں کے سرکار سے تم کو عطا ہوئی ہے۔ تم متعلقان نصراللہ بیگ خاں کی بھی پرورش اور دستگیری کرتے رہو چنانچہ خواجہ حاجی خاں بطور اپنے فرزندوں کے ان کے بچوں کی پرورش کرتے رہے۔ بعد ایک مدت کے خواجہ حاجی خاں مع متعلقان نصراللہ بیگ خاں دہلی میں آکر آباد ہوئے۔ اور مرزا جیون بیگ خاں بھی دہلی میں آگئے اس عرصہ میں مرزا جیون بیگ کے ہاں تین اولادیں ہوئی تھیں' ایک دختر مہرالنساء خانم اور دو فرزند اکبر بیگ و افضل بیگ' دختر کی عمر چودہ سال کی تھی اور اکبر بیگ بہن سے چھوٹے تھے اور ان سے چھوٹے افضل بیگ تھے۔ خواجہ حاجی خاں نے تھوڑے دن ٹھہر کر عقد کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ مرزا جیون بیگ خاں کی دختر سے عقد کرلیا۔ ان کے شکم سے دو فرزند اور ایک دختر تولد ہوئے۔ دختر کا خورد سالی میں انتقال ہوگیا۔ دونوں فرزند یعنی خواجہ شمس الدین خاں و خواجہ بدرالدین خاں باپ کی یادگار میں رہے۔ اس اثناء میں ایک دن نواب احمد بخش خاں دہلی میں آئے ہوئے تھے۔

خواجہ حاجی خاں سے ملنے کو آئے اور ہنگام گفتگو یہ بیان کیا کہ بھائی تم اپنی جاگیر کے انتظام میں تکلیف پاتے ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی جاگیر میری ریاست میں شامل کر دو۔ جاگیر کی آمدنی بہ آسائش پہنچا کرے گی۔ خواجہ حاجی خاں رضامند ہو گئے اور سرکار انگریزی میں درخواست دے دی' نواب احمد بخش خاں نے بھی سفارش کر دی' وہ جاگیر فیروز پور کی ریاست کے شامل ہو گئی اور نواب احمد بخش خاں کو سرکار نے خط لکھ دیا کہ خواجہ حاجی خاں کی جاگیر تمہاری ریاست کے شامل کی جاتی ہے کس لیے کہ تمہاری سرحد سے ملی ہوئی ہے۔ تم کو لازم ہے کہ تم اس جاگیر کی پوری آمدنی خواجہ حاجی خاں اور متعلقان نصراللہ بیگ خاں کے لیے دوام کو جاری رکھو اور دیتے رہو۔ چنانچہ یہ گورنمنٹ انگریزی کا خط عہد نامجات میں بنام احمد بخش خاں چھپا ہوا ہے اور یہ معاملہ ۱۸۰۵ء کا ہے۔ اس کارروائی کے بعد خواجہ مرزا حاجی خاں نے مرزا اسد اللہ خاں کا عقد الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے کر دیا۔ کس لیے کہ دونوں بھائی جوان ہو گئے تھے۔ اسد اللہ خاں کے ہاں ایک لڑکا ہوا تھا۔ مگر زندہ نہیں رہا' لاولد رہے۔ دوسرے بھائی یوسف بیگ خاں کا عقد خواجہ حاجی خاں نے اپنے سیدات کی رشتہ کی بہن سے کر دیا۔ جن کے بطن سے ایک دختر تولد ہوئی اور وہ صاحب اولاد ہوئی جس کی نسل اب تک حیدر آباد میں موجود ہے اور یہ اقبال مندی بسر کرتی ہے۔ اب زمانہ وہ ہے کہ خواجہ حاجی خاں کا بعارضہ فالج بعمر چونسٹھ برس انتقال ہو گیا اور نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور بھی راہی ملک بقا ہوئے۔ ان کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں بڑے صاحبزادے مسند نشین ریاست ہوئے۔ مدت تک حکمراں رہے۔ اتفاق سے شمس الدین خاں پر ایک مقدمہ قتل ریذیڈنٹ دہلی کا قائم ہوا اور مقدمہ کو بڑا طول کھنچا۔ آخر بعد تحقیقات کامل سرکار انگریزی نے شمس الدین خاں کو پھانسی دے دی۔ ملک ضبط کر لیا۔ ہماری جاگیر بھی ملک کے ساتھ ضبطی میں آ گئی کیونکہ اسی ریاست کے شامل ہو چکی تھی۔ مرزا اسد اللہ خاں کو ان کے ہم چشموں اور احباب وغیرہ نے اغوا کرنا شروع کیا کہ یہ وقت اچھا ہے جاگیر تمہارے چچا کی ہے تم وارث ہو دعویٰ کرو اور قابض ہو جاؤ۔ اسد اللہ خاں کے چھوٹے بھائی دیوانگی کی حالت میں کسی قابل نہیں تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں لوگوں کے بہکانے سے برخلاف ہو گئے اور جاگیر کا استغاثہ کر دیا۔ بھتیجوں نے چچا کو سمجھایا کہ آپ ایسا نہ کریں۔ جاگیر ہاتھ سے جاتی رہے گی پھر کیا ہو گا۔ مگر مرزا اسد اللہ خاں نے نہ مانا اور دعویٰ کر دیا۔ مجبور ہو کر بھتیجوں نے بھی دعویٰ پیش کیا کہ جاگیر ہمارے باپ کو ملی ہے' ہم وارث ہیں ہم کو ملنی چاہیے۔ غرض یہ مقدمہ کئی برس دائر رہا۔ جملہ دعویدار معاش سے پریشان رہے۔ انجام کار سرکار کی حکمت عملی کام آ گئی۔ عدالت نے یہ تجویز کی کہ آئندہ سے جاگیر کی آمدنی نصف متعلقان نصراللہ بیگ خاں کو اور نصف متعلقان خواجہ حاجی خاں کو ملتی رہے گی جاگیر نہیں ملے گی۔ فریقین کو حکم سنا دیا گیا۔ مرزا اسد اللہ خاں نے بہت کوشش کی۔ کلکتہ گئے اور ولایت میں استغاثہ کیا۔ مگر ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ جو سرکار نے تجویز کر دی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا جاگیر کی نقدی حسب الحکم سرکار سے اجرا ہو گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا اسد اللہ خاں کی دونوں پھوپھیاں مر گئیں' ان کا حصہ ضبط ہو گیا۔ ان کے بعد یوسف بیگ خاں مر گئے۔ ان کا حصہ ضبط ہو گیا۔ مگر سرکار نے ان کی زوجہ کے نام گزارے کے لیے تیس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد مرزا اسد اللہ خاں بعد ایام مفسدہ ۱۸۵۷ء' ۱۲۸۳ھ میں جاں بحق ہوئے۔ ان کا حصہ ضبط ہوا۔ اسد اللہ خاں کے اوصاف و کمالات عالم پر ظاہر ہیں۔

(احوال غالب مرتب پروفیسر مختار الدین احمد' ص ۳۶)

* * *

غالب کا سفر کلکتہ

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی

مرزا غالب نے اپنی زندگی میں صرف ایک طویل سفر کیا تھا' جب ان کو اپنی پنشن کے سلسلے میں دہلی سے کلکتہ جانا پڑا تھا۔ دوران سفر اور قیام کلکتہ میں کچھ ایسے حالات و واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے غالب کے اس سفر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔
غالب کو دلی سے اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہ کرتے تھے مگر معاشی پریشانی نے انھیں سفر کے لیے مجبور کیا۔ مولانا حالی نے اس سفر کے مقصد پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

"کلکتہ جانے کا سبب یہ تھا کہ مرزا کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے وفات پائی تھی اس وقت مرزا کی عمر نو برس کی تھی اور ان کے بھائی کی عمر سات برس کی تھی۔ نصر اللہ بیگ کی وفات کے بعد ان کے متعلقوں اور وارثوں کے لیے جن میں مرزا اور ان کے بھائی بھی شریک تھے' جو پنشن گورنمنٹ نے ریاست فیروز پور جھرکہ پر محول کر دی تھی جب تک کہ مرزا صغر سن رہے جو کچھ وہاں سے ملتا رہا پاتے رہے۔ جب سن تمیز کو پہنچے اور شادی ہوگئی' عالم شباب اور خانہ داری کی ضرورتیں بہت بڑھ گئیں اور گھر میں جو کچھ وہاں تھا وہ چند روز میں سب خرچ ہوگیا۔ لاچار فکر معاش دامن گیر ہوئی اول مرزا کو غلط یا صحیح یہ خیال پیدا ہوا کہ فیروز پور جھرکہ سے جس قدر پنشن ہمارے خاندان کے لیے گورنمنٹ سے مقرر کرائی تھی اس قدر ہم کو نہیں ملتی۔ ضرورتوں نے سخت تنگ کر رکھا تھا۔ ادھر قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا تھا ادھر چھوٹے بھائی کو جنون ہوگیا۔"

غالب ان پریشان کن حالات سے تنگ آگئے تو دوستوں کے مشورے پر فیروز پور جھرکہ گئے تاکہ نواب سے پنشن میں اضافے کی درخواست کریں مگر ان کا یہ سفر ناکام رہا۔ نواب نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی۔ غالب بے نیل مرام واپس ہوئے اور یہ طے کیا کہ نواب نے جو پنشن کی تقسیم کی ہے اس کے خلاف کلکتہ میں گورنر جنرل کے یہاں اپیل کریں' ان دنوں ہندوستان کا دار السلطنت کلکتہ تھا۔

غالب اگست ۱۸۲۱ء میں دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے دوران سفر میں انھوں نے کئی مقامات پر قیام کیا۔ سب سے زیادہ عرصہ لکھنؤ میں گزرا اس کے بعد بنارس میں اور یہ دونوں مقامات کئی حیثیتوں سے اہم تھے۔ لکھنؤ میں مرزا غالب پانچ مہینے سے زیادہ ٹھہرے (غالب نے اودھ کے وزیر کی تعریف میں جو نثر لکھی ہے اس سے ان کے قیام لکھنؤ کی مدت گیارہ ماہ معلوم ہوتی ہے) یہ مدت اچھی خاصی مدت ہے۔ یہاں وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ملے ہوں گے امراء و روساء کا ڈھنگ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا۔ لکھنؤ اس زمانے میں مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ کہا جاتا تھا مگر یہ عجیب بات ہے کہ لکھنؤ میں غالب کے زمانہ قیام کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کسی تاریخ و تذکرے سے تفصیل تو درکنار قیام لکھنؤ کے مختصر حالات پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس سے یہ نتیجہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ زمانہ غالب نے بہت خاموشی سے گزارا' یا پھر معاصر' مورخوں اور تذکروں نگاروں نے کسی خاص سبب کی بنا پر غالب کے قیام لکھنؤ کے حالات پر سکوت اختیار کیا ہے۔ یا ممکن ہے کہ اس وقت اہل لکھنؤ نے ان کی کوئی اہمیت ہی نہ دی ہو' تاریخ سے غائب

کے خصوصی تعلقات بھی ثابت ہیں حکمران دنوں' تاج عتاب شاہی کا شکار تھے اور الہ آباد میں مقیم تھے یہ نصیرالدین حیدر بادشاہ اودھ کا عہد حکومت تھا..... روشن الدولہ وزیراعظم تھے۔ (غالب جب لکھنؤ پہنچے' غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ اور آغا میر وزیر تھے' مگر کچھ عرصہ بعد وہ معزول کر دیا گیا اور روشن الدولہ وزیر مقرر ہوئے) روشن الدولہ نے غالب کی کچھ آؤ بھگت ضرور کی۔ بعض دوسرے علماء نے بھی ان کی قدر و منزلت کی' مگر ۵ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود کسی اہم علمی و ادبی مباحثے اور شعر و سخن کی محفلوں کا کوئی قابل ذکر واقعہ معلوم نہیں ہوا' نہ غالب ہی نے تفصیل سے کہیں اس کا ذکر کیا ہے۔ مولانا حالی نے البتہ جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس یہ ہے:

"جب مرزا نے دلی سے کلکتہ جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس وقت راہ میں ٹھہرنے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ مگر چونکہ لکھنؤ کے بعض ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنؤ آئیں' اس لیے کانپور پہنچ کر ان کو خیال آیا کہ لکھنؤ دیکھتے چلیے اس زمانے میں نصیرالدین حیدر' فرماں روا' اور روشن الدولہ نائب السلطنت تھے اہل لکھنؤ نے مرزا کی عمدہ طور پر مدارات کی اور روشن الدولہ کے ہاں بہ عنوان شائستہ ان کی تقریب کی گئی۔ مرزا سے اس پریشانی کے عالم میں قصیدہ تو سرانجام نہیں ہو سکا مگر ایک مدحیہ نثر تقلیل میں جو ان کے مسودات میں موجود ہے نائب السلطنت کے سامنے پیش کرنے کے لیے لکھی تھی۔ لیکن مرزا نے ملاقات سے پہلے دو شرطیں ایسی پیش کیں جو منظور نہ ہوئیں۔ ایک یہ کہ نائب السلطنت میری تعظیم دیں۔ دوسرے نذر سے مجھے معاف رکھا جائے۔ اسی وجہ سے مرزا بغیر اس کے کہ روشن الدولہ سے ملیں اور وہ نثر پیش کریں۔ وہاں سے کلکتہ روانہ ہو گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد انہوں نے ایک قصیدہ نصیرالدین حیدر کی شان میں لکھ کر ایک دوست کے توسط سے گذارا تھا اور اس پر پانچ ہزار روپے بطور صلے کے ملنے کا حکم ہوا تھا۔

شیخ امام بخش ناسخ نے مرزا کو لکھا کہ پانچ ہزار روپے ملے۔ تین ہزار روشن الدولہ کھا گئے اور دو ہزار متوسط کو دے کر کہا کہ اس میں سے جو مناسب سمجھو مرزا کو بھیج دو۔ مرزا نے یہ سن کر کچھ تحریک کی' مگر تین دن بعد خبر پہنچی کہ نصیرالدین حیدر مر گئے۔ پھر واجد علی شاہ کے زمانے میں مرزا نے سلسلہ جنبانی کی اور پانچ سو روپے سالانہ ہمیشہ کے لیے وہاں سے مقرر ہو گئے۔ لیکن صرف دو برس گزرے تھے کہ ریاست ضبط ہو گئی اور وہ دفتر گاؤ خورد ہو گیا۔"

غالب پر تحقیقی کام کرنے والوں کو ان کے زمانہ قیام لکھنؤ کے حالات کا پتہ لگانے میں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ ہر حال یہ تو ماننا پڑے گا کہ لکھنؤ کے حالات اور یہاں کی تہذیب و معاشرت سے مرزا کو واقفیت ضرور حاصل ہوئی لیکن ان کی تحریروں۔ ہر سے لکھنؤ کے متعلق کوئی دلچسپی یا تاثر نہیں ظاہر ہوتا بلکہ کسی ناگفتہ بہ واقعہ کی طرح اس کا ذکر کیا ہے۔

لکھنؤ میں مرزا غالب نے فارسی شاعری کی اقتدروانی کا ذکر کر کے دوران قیام میں چند غزلیں اردو میں کہیں' اسی زمانے کا کہا ہوا ایک قطعہ ذیل ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی

ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو
مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو
لے جاتی ہے ہمیں ایک ایک توقع غالب
جادہ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

وزیر اودھ نے نواب سے ملاقات کرانے کی جو شرطیں پیش کی تھیں' ان کو مرزا کی خودوار طبیعت نے گوارہ نہ کیا جس کا مختصراً ذکر غالب نے اپنے ایک فارسی خط میں کیا ہے:

"آنچہ دربابِ ملازمت قرار یافت خلافت آئین خویشتن داری و ننگ شیوہ خاکساری بود۔"

اودھ کے بادشاہ کی تعریف میں انہوں نے جو پہلا قصیدہ لکھا تھا' اس میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

ناز پروردۂ خلوت گہہ آزاد گیم
کافرم گر سرا پردۂ سلطاں رفتم
من ہم از خیل کریمانم و خجلت نبود
گر بدریوزہ بہ درگاہ کریماں رفتم

اس قصیدے میں غالب نے اپنے مصائب کا تذکرہ اور دہلی سے لکھنؤ تک کے سفر کا حال لکھا ہے۔

مرزا غالب لکھنؤ سے ۱۷ جون ۱۸۲۷ء کو کلکتہ جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ تین دن میں کانپور پہنچے۔ وہاں سے باندہ گئے جہاں احمد علی صدر امین ان کے قدردان تھے..... انہوں نے مرزا غالب کی بہت خدمت کی اور ان کو آرام سے رکھا اور ان کے لیے کلکتہ کے دوستوں اور حاکموں کو سفارشی خطوط لکھ کر دیئے۔ باندہ سے غالب موڈا گئے اور موڈا سے چلہ تارا۔ یہ سفر انہوں نے گھوڑا گاڑی سے طے کیا۔ چلہ تارا سے کشتی کے ذریعے الہ آباد پہنچے' یہاں ان کو کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا تھا' جس کی طرف انہوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے:

نفس بہ لرزد زیاد مہیب کلکتہ
نگاہ خیز ز ہنگامہ الہ آباد

چونکہ واپسی میں بھی مرزا غالب الہ آباد ہوتے ہوئے دہلی آئے تھے' اس لیے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ واقعہ جس کی طرف انہوں نے اشارہ کیا ہے جاتے وقت پیش آیا تھا یا واپسی میں بہرحال الہ آباد سے غالب بنارس پہنچے۔ مرزا کو بنارس کی آب و ہوا بہت راس آئی اور وہاں کے قیام کے گہرے نقوش ان کے دل و دماغ پر ثبت ہوئے۔ انہوں نے بنارس کی تعریف میں ایک مثنوی "چراغ دیر" کے نام سے لکھی جو ان کی مثنویات میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی میں مرزا غالب نے یہ تک لکھ دیا ہے کہ اگر نوجوانی میں یہاں آیا ہوتا اور خانہ داری کا جھگڑا نہ ہوتا تو یہیں رہ جاتا۔ انہوں نے بنارس کی تعریف میں نہایت پر اثر اشعار لکھے ہیں:

عبادت خانہ ناقوسیاں است

همه ناکعبه سیدستاں است
تعالیٰ اللہ بنارس چشم بددور
بہشت خرم و فردوس معمور

غالب کی خواہش تھی کہ بنارس سے کلکتہ تک کا سفر کشتی کے ذریعے طے کریں مگر اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے گھوڑے پر سفر کیا۔ پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے ہوئے سہ شنبہ ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچ گئے اور محلّہ شملہ بازار میں مرزا علی سوداگر کی حویلی میں ایک بڑا مکان دس روپے ماہوار کرایہ پر لے لیا۔ کلکتہ پہنچنے کا ذکر غالب نے اس طرح کیا ہے:

غالب رسیدہ ایم بہ کلکتہ وز مے
از سینہ داغ دوری احباب شستہ ایم

کلکتہ میں مرزا غالب کی بہت قدردانی ہوئی۔ حکام نے ہمت افزائی کی۔ علمی حلقوں میں ان کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ دلی سے کلکتہ تک کا سفر مرزا غالب کے لیے تجربات و معلومات کے نقطہ نظر سے مفید ثابت ہوا وہ کچھ دیکھنے، سننے اور لکھنے لکھانے کے لیے آمادہ سفر نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کا مقصد محض پنشن کا اجراء و اضافہ تھا مگر یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں انگریزی تہذیب اپنا اثر جما رہی تھی۔ مشرقی تہذیب و اخلاقی قدریں مائل بہ تنزل تھیں لیکن مشرق و مغرب کے اس سنگم (کلکتہ) سے ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی غالب اسی نئی تہذیب سے روشناس ہوئے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کی رنگینیوں اور دلکشیوں کو غور سے دیکھا۔ جو تیزی سے ہندوستانی تہذیب پر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ زرق برق لباسوں میں ملبوس یوروپین خواتین کا آزادی و بے باکی کے ساتھ پھرنا، مردوں سے مصافحہ کرنا، ناچ رنگ کی محفلوں میں ان کی بلاجھجک شرکت، غالب کے لیے انوکھی اور نئی باتیں تھیں۔ ظاہر ہے انہوں نے ان حالات کا بہ نظر غور مشاہدہ کیا ہوگا۔ جس کی جھلک ان کے بعض اشعار میں ملتی ہے۔

کلکتہ میں غالب نے مشاعروں میں بھی شرکت کی، وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مدرسہ عالیہ جاری کیا تھا۔ اس میں ایک بزم سخن بھی قائم تھی اور وہاں ہر مہینہ کے پہلے اتوار کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ ان مشاعروں میں اردو اور فارسی میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ غالب نے ایک مشاعرے میں ایک فارسی غزل پڑھی، جس کا مقطع ہے۔ '

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب
رسم امید ہمہ ناز جہاں بر خیزد

اسی غزل کا ایک شعر ہے:

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشتم
ہم چو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس شعر پر قتیل کے حامیوں نے اعتراض کیا کہ "ہمہ" بہ قول قتیل واحد سے پہلے نہیں آسکتا، اس لیے یہ شعر غلط ہے۔
غالباً اسی مشاعرے یا کسی دوسرے مشاعرے میں غالب کے اس شعر پر بھی پیروان قتیل نے سخت اعتراض کیا:

شور اشکے بہ فشار بن مژگاں دارم

معترضین میں مولوی عبدالقادر رام پوری، مولوی کرم حسین بلگرامی، نعمت علی عظیم آبادی پیش پیش تھے۔ غالب ان اعتراضات کو درست نہیں سمجھتے تھے ان دنوں شہزادۂ کامران کی طرف سے کفایت خاں بحیثیت سفیر کلکتہ آئے ہوئے تھے، وہ ایرانی تھے، انہوں نے غالب کی تعریف اور حمایت کی۔ بعض اہل علم بھی ان کے حمایتی ہوگئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین نے غالب کو تنگ کیا۔ غالب نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں دیوان سنگھ کھتری (نومسلم نام محمد حسن قتیل کی بات بطور سند نہیں مان سکتا۔ اس پر ان کے خلاف ہنگامہ کیا گیا۔ غالب کے لیے پردیس میں یہ مخالفت پریشان کن تھی۔ تاہم..... انہوں نے مخالفین کو ان کے اعتراضات کے جواب ایک مثنوی میں دے۔ اس مثنوی کا نام "باد مخالف" رکھا۔ "باد مخالف" مرزا کی معروف مثنوی ہے۔

کلکتہ میں مرزا کو چند اچھے دوست بھی ملے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت مولوی سراج الدین احمد لکھنوی کو حاصل ہے جن کے نام مرزا کے فارسی خطوط بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ اخبار تیشہ اسکندر سے متعلق تھے۔ اور بار سوخ آدمی تھے۔ انھیں کی فرمائش پر غالب نے کلکتہ میں اپنے اردو فارسی کلام کا انتخاب کیا جسے "گل رعنا" کے نام سے موسوم کیا۔ دوسرے رفیق میر حسن علی لکھنوی تھے جو غالب کے قدردانوں میں تھے۔

کلکتہ میں غالب کا قیام تقریباً دو سال رہا۔ وہاں وہ گورنر جنرل سے بھی ملے، وعدے وعید بھی ہوئے مگر اصل مقصد میں انھیں ناکامی ہوئی اور چار و ناچار دہلی واپس ہوئے ۱۱ نومبر ۱۸۲۹ء کو غالب دہلی واپس پہنچے۔ ان کا یہ سفر حامیان قتیل سے معرکہ آرائی کے باعث اردو ادب کی تاریخ کا اہم سفر ہے۔ اس کے علاوہ اس سفر کی بدولت غالب کی دو اچھی مثنویاں "باد مخالف" اور "چراغ دیر" اردو ادب کو ملیں۔

(غالب پر چند تحریریں، ص ۵۱)

طعنہ بر بے سروسامانی طوفان زدہ

★

ایک بار مرزا صاحب کے کسی شاگرد نے آکر ان سے بڑے فخریہ لہجہ میں کہا کہ:

"حضرت! آج میں حضرت امیر خسرو کی قبر پر گیا تھا مزار پر ایک کھرنی کا درخت ہے اس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ بس کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح و بلیغ ہوگیا ہوں۔"

"مرزا صاحب نے ان سے بڑی متانت سے کہا۔

"ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے بکائن کی پیلیاں کیوں نہ کھا لیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے!"

★

ایک مرتبہ اپنی بہن چھوٹی خانم کی بیماری کو سن کر مرزا صاحب ان کی عیادت کو گئے اور پوچھا۔

"کیا حال ہے ـــــ؟"

وہ بولیں۔

"مرتی ہوں، البتہ قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں ـــــ"

"بوا! بھلا یہ کیا فکر ہے خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین خان بیٹھے ہیں جو ڈگری کرکے پکڑوا لیں گے!"